مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اسلامیات

چھٹا پرچہ

علوم وفنون میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا حصہ

(ایم۔اے، سال دوم)

فہرست مضامین

بلاک 1 : اسلام اور سائنس

بلاک 2 : علوم وفنون میں مسلمانوں کا حصہ

بلاک 3 : استشراق اور مستشرقین

بلاک 4 : اسلامی علوم میں ہندوستانی غیر مسلموں کی خدمات

پیش لفظ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1998ء میں قائم ہوئی، ملک کی واحد مرکزی یونیورسٹی ہے، جہاں اردو زبان کے ذریعہ مختلف مضامین کی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم و تدریس کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے جہاں روایتی تعلیم کے تحت، سائنس اور سماجی علوم، لسانیات، انتظامیہ و کامرس، تعلیم و تربیت، انفارمیشن ٹکنالوجی اور صحافت وغیرہ کے مختلف مضامین میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح سے لے کر ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک متعدد کورسز چلائے جارہے ہیں، وہیں فاصلاتی تعلیم کے تحت انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، سرٹی فیکیٹ اور ڈپلومہ کی سطحوں پر مختلف مضامین کے کورسز چلائے جارہے ہیں، جن کے ذریعہ پورے ملک کے طلبہ وطالبات کی ایک بہت بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہورہی ہے۔ روایتی تعلیم کے تحت جاری کورسز میں ایم۔اے 'اسلامیات' کا کورس بھی شامل ہے۔ جس کی دوسالہ تعلیم یونیورسٹی کے مرکزی کیمپس واقع حیدرآباد میں دی جارہی ہے۔

یونیورسٹی نے چند برسوں قبل فاصلاتی تعلیم کے تحت بی۔اے کے تین سالہ کورس میں اختیاری مضمون کے طور پر 'اسلامیات' (Islamic Studies) کو شامل کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار ملک کے اندر اردو زبان میں اسلامیات کا نصابی مواد فاصلاتی تعلیم کے نہج پر پیش کیا گیا تھا۔ بی۔اے کا یہ کورس کامیابی کے ساتھ جاری ہے، اور طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد 'اسلامیات' کے ساتھ بی۔اے کی تعلیم مکمل کرچکی ہے۔

اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ فاصلاتی تعلیم کے تحت 'اسلامیات' میں ایم۔اے کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں سے اس کے مطالبے بھی کیے جارہے تھے۔ چنانچہ اسی ضرورت اور طلبہ و طالبات کے تقاضوں کے پیش نظر 2014ء میں ایم۔اے 'اسلامیات' کا آغاز کیا گیا۔ زیر نظر کتاب اسی کورس کے لیے تیار کیے گئے 'خود تدریسی مواد' (Self Learning Material) برائے سال دوم کا مجموعہ ہے۔

ایم۔اے اسلامیات کورس کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے جدید دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نیا اور جامع نصاب تیار کیا ہے۔ اور اس نصاب کے مطابق اسلامیات کے ماہرین کی مدد سے درسی مواد تیار کرائے گئے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اس حوالہ سے دوبارہ یہ اعزاز حاصل ہورہا ہے کہ ملک میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں ایم۔اے اسلامیات کا درسی مواد (آٹھ پرچوں پر مشتمل آٹھ کتابوں کی شکل میں) پیش کیا جارہا ہے اور اس سے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت مکمل ہورہی ہے۔

اسلامیات کا موضوع بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی ڈیڑھ ہزار برس کے طویل دورانیہ پر مشتمل اور ہندوستان کے بشمول دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلی اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت اور علوم وفنون کے میدانوں کی سرگرمیوں کا احاطہ شامل ہے۔ اس لیے اسلامیات کا موضوع نہ صرف سماج کے ایسے متعدد پہلوؤں کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی سے گہرا ربط

رکھتے ہیں' بلکہ انسانی سماج کے گوناگوں مسائل کے بارے میں گہری بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔

ایم۔اے اسلامیات کا یہ کورس آٹھ پرچوں پر محیط ہے، جسے دو سال کی تعلیم کے دوران مکمل کیا جائے۔سال اول کے چار پرچوں میں اسلام کا تعارف اور بنیادی تعلیمات' علوم اسلامیہ' مسلم تہذیب وثقافت کی تاریخ' نیز اسلامی افکار ونظریات کے جدید تناظر پر مواد پیش کیا گیا ہے۔سال دوم کے لیے بھی چار پرچے ہیں۔ چنانچہ پانچواں پرچہ **'اسلام ہندوستان میں'** کے عنوان سے ہے' جس کے پانچ بلاک میں ہندوستان میں اسلام کی آمد واشاعت پر گفتگو کی گئی ہے۔پھر دہلی سلطنت کے قیام اور اس کے تین سو سالہ دور کے تمدنی وتہذیبی کارناموں کا تعارف کرایا گیا ہے' علاقائی حکومتوں کے ضمن میں دکن کی بہمنی سلطنت اور اس سے نکلنے والی چھوٹی حکومتوں کے ساتھ دیگر علاقائی چھوٹی حکومتوں پر گفتگو کی گئی ہے۔پھر مغل حکومت کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔آخر میں جدید ہندوستان کے عنوان سے برطانوی دور اور اس کے بعد کی مسلم ریاستوں نیز ہندوستان کی مسلم شخصیات' تحریکات اور اداروں پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پر گفتگو کی گئی ہے۔چھٹے پرچہ میں **'علوم وفنون میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی خدمات'** کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔چنانچہ اس میں اسلام اور سائنس' علوم وفنون میں مسلمانوں کا حصہ' استشراق ومستشرقین اور اسلامی علوم میں غیر مسلموں کی خدمات کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ساتواں پرچہ **'مسلمان عالمی گاؤں میں'** کے عنوان سے ہے۔اس میں مسلم دنیا کے علاوہ' یورپ وامریکہ اور افریقہ وایشیا وغیرہ کی مسلم اقلیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے عالمی گاؤں کی موجودہ مسلم تحریکات وادارے اور مسلم مفکرین ومصلحین کا تعارف کرایا گیا ہے۔آٹھواں پرچہ **'مسلم فلسفہ' کلام' مسلم فرقے اور تجدید دین'** کے موضوع پر ہے' جس میں مسلم فلاسفی' علم کلام ومتکلمین اسلام' متعدد مسلم فرقے اور تجدید دین کے حوالے سے ہونے والے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یونیورسٹی نے اس نصاب کی تیاری میں ممتاز ماہرین اسلامیات اور دانشوران فن سے استفادہ کیا ہے جنہوں نے بڑی محنت کے ساتھ اسے تیار کر کے یونیورسٹی کو اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔توقع کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اسلامیات کے طلبہ وطالبات کی ضرورت بہتر طور پر پوری کرے گی' ساتھ ہی اسلامی مطالعات کے باب میں قابل قدر استفادہ کا باعث بنے گی۔

پروفیسر خواجہ محمد شاہد

شیخ الجامعہ

بلاک 1: اسلام اور سائنس

فہرست

اکائی نمبر		عنوان
اکائی	1	اسلام میں علم وحکمت کا تصور
اکائی	2	عہد اسلامی میں ترجمہ کی تحریک اور عقلی وسائنسی علوم کا ارتقاء
اکائی	3	یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں مسلمانوں کا حصہ
اکائی	4	عالم اسلام میں سائنسی علوم کا زوال، اسباب ونتائج

اکائی 1 : اسلام میں علم وحکمت کا تصور

اکائی کے اجزاء

1.1 مقصد

اسلام اور سائنس کے موضوع پر سب سے پہلے جو عنوان ہمارے سامنے ہے وہ ''اسلام میں علم وحکمت کا تصور'' ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ اس بنیاد سے براہ راست واقف ہوسکیں، جس پر اسلامی علوم وفنون کی پوری عمارت قائم ہے۔

1.2 تمہید

اس اکائی میں علم وحکمت کے تصور اسلامی پر ایک مختصر گفتگو کی جائے گی۔اس میں جامعیت کی کوشش کی جائے گی، بتایا جائے گا کہ علم و حکمت کے بارے میں اسلام کے دو بنیادی عناصر یعنی قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں کیا تصور پیش کیا گیا ہے، ان کو سامنے رکھ کر علم اور سائنس کی دنیا میں اسلام کا جو کردار ہے، اس کی وضاحت کی جائے گی۔

1.3 علم کی اہمیت قرآن میں

اسلام ایک مذہب اور ایک دین ہے' یعنی انسان کی زندگی اور اس کے جینے کے طور طریقوں کو عبادات' معاملات' قانون اور اخلاق کے لحاظ سے اسلام ایک رنگ عطا کرتا ہے۔ اس رنگ میں چمک اور دلکشی لانے کے لیے سب سے پہلے اسلام نے علم کو اہمیت دی۔ اور علم اور دین دونوں کو اس طرح ایک دامن سے باندھ دیا کہ ان میں سے کوئی دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی بات' حکم اور حقیقت جس آیت کے روپ میں ہے وہ اقرا باسم ربک الذی خلق ہے جس نے پہلی ہی مرحلہ پر واضح کر دیا کہ پیدا کرنے والے نے انسان کو پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔

قرآن کی پہلی آیت کا علم پر زور دینا ہی کافی تھا' لیکن علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جانا چاہیے کہ علم اور اس کے متعلقات پر قریب 900 سو آیتیں ہیں جن میں کسی نہ کسی لحاظ سے علم اور علم والوں کا ذکر ہے۔ ان آیتوں کو شمار نہیں کیا گیا جن میں معرفت اور بصیرت کا ذکر ہے اور تعداد میں تقریباً علم کی آیتوں کے برابر ہی ہیں۔ ایک اور بات بڑی توجہ کی مستحق ہے کہ قرآن مجید نے صرف علم کی اہمیت بیان نہیں کی بلکہ اس نے علم والوں کی خوبیاں اور بڑائیاں گنا گنا کر ان کے رتبہ کی بلندی بار بار بیان کی ہے جیسے آیت ہے:

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات (سورہ مجادلہ)

ترجمہ: تم میں سے جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا' اللہ ان کے درجے بلند کرے گا۔

امام غزالی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا قول نقل کیا کہ "علماء کو عام مسلمانوں پر سات سو درجہ زیادہ فضیلت دی گئی ہے۔"

ایک اور آیت ہے:

شہد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملئکۃ واولوا العلم قائما بالقسط (سورہ آل عمران)

ترجمہ: اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے (گواہی دی) حاکم انصاف کا۔

اس آیت سے امام غزالی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا نام لیا پھر فرشتوں کا' پھر اہل علم کا' یہ اہل علم کے شرف و فضیلت کی نشانی ہے۔

اور یہ آیت تو بہت مشہور ہے جس کا مطلب ہے کہ:

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح یہ آیت ہے کہ:

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء

خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں وہی بہترین انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔اور یہ قرآنی حقیقت بھی عیاں ہے کہ آدم علیہ السلام اور ابلیس کے قصہ میں انسان کی عزت و سربلندی کی وجہ صرف علم ہے' اللہ تعالیٰ نے علم ہی کی بنیاد پر حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فضیلت دی اور سجدہ کرنے کے قابل ٹھہرایا۔

اسلام میں علم کے تصور کی بلندی اور انسانوں کے لیے علم کی ضرورت کی ایسی تکرار و تاکید سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام' دین فطرت ہے' اور علم کا حاصل کرنا اسی فطرت کا تقاضا ہے۔

1.4 علم کی اہمیت حدیث میں

قرآن مجید کے بعد رسول اللہ ﷺ کی باتیں اور عمل گویا قرآن مجید ہی کی وضاحت ہیں۔جو بات قرآن میں مختصر طریقہ پر کہی گئی' رسول اکرم ﷺ نے اسی کو زیادہ تفصیل سے بیان فرمایا۔علم کی اہمیت پر قرآن مجید کی سینکڑوں آیتوں کی طرح حدیثیں بھی کثرت سے ہیں اور ان کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہو تو حدیث شریف کے ان چھ مجموعوں کو دیکھنا چاہیے جو مستند ترین اقوال و افعال پر مشتمل ہیں' حدیث کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں ایک الگ باب' علم کی اہمیت کا نہ ہو' جہاں ایمان جیسی بنیادی اور عقیدہ کی مرکزی بات کا باب ہے' اسی سے متصل علم کی اہمیت و فضیلت کا باب ہے۔

علم کی فضیلت والی چند حدیثیں ہی سامنے ہوں تو پیغمبر اسلام ﷺ کی نظر میں علم کی کیا اہمیت ہے اس کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے اور یہ حدیث تو غیر معمولی ہے کہ:

''عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہی ہے جیسے کہ مجھے تم میں سب سے معمولی آدمی پر فضیلت حاصل ہے۔''

عبادت پر علم کی یہ فضیلت اس شان سے شاید ہی کہیں اور ملے۔

یہ حقیقت اس وقت اور روشن ہو جاتی ہے جب اس قسم کے اقوال رسول ﷺ ملتے ہیں کہ ''علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے'' یا یہ کہ ''علم خزانے ہیں اور ان کی کنجی سوال ہے۔''

''جاہل کے لیے مناسب نہیں کہ اپنی جاہلیت پر راضی رہے اور نہ عالم کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے علم کے باوجود خاموش رہے۔''

یہ کمال کی حدیث ہے جس میں ایک طرف علم حاصل کرنے اور دوسری طرف علم کو عام کرنے کی بات اس انداز سے کہی گئی ہے۔

ایک اور قول بہت قابل غور ہے' حضرت ابوذر نے رسول اللہ ﷺ کی یہ بات نقل فرمائی کہ ''ایک عالم کی مجلس میں حاضر ہونا' ایک ہزار رکعتوں' ایک ہزار مریضوں کی عیادت اور ایک ہزار جنازوں میں شرکت سے افضل ہے۔''

کسی نے پوچھا کہ ''اور قرآن مجید کی تلاوت سے بھی''؟ تو حضرت ﷺ نے فرمایا کہ

''کیا قرآن، علم کے بغیر نفع پہنچا سکتا ہے۔''

اس جملے نے تو علم کی اہمیت آسمان تک پہنچا دی۔

اور اس کا ایک ثبوت یہ حدیث بھی ہے کہ:

''قیامت کے دن تین گروہوں کے لوگ شفاعت کریں گے، انبیاء، علماء اور شہدا''

نبیوں کے بعد علم والوں کا یہ درجہ سب کچھ کہہ جاتا ہے، اسی لیے اور بھی کہا گیا کہ:

''علماء انبیاء کے وارث ہیں''

اسلام نے ذرا سی مدت میں علم اور علماء کی جو اہمیت بتائی اس کا اثر تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے براہ راست استفادہ کرنے والوں کی زبان پر علم کا ذکر آتا رہتا، حضرت معاذ بن جبل کا قول ہے ''علم سکھاؤ کیونکہ اس کا سکھانا نیکی ہے، اس کو طلب کرنا عبادت ہے، اس کی گفتگو کرنا تسبیح ہے، علمی بحث کرنا جہاد، علم کو باشنا اللہ کی قربت کا ذریعہ اور علم سے محروم کو علم دینا صدیقہ جاریہ ہے۔''

یہ قول ایسا ہے کہ اس کے ہر پہلو پر جتنا زیادہ غور کیا جائے، علم کی اہمیت اور اسلام کے تصور علم کی معنویت، تہہ در تہہ کھلتی جاتی ہے، اسلام میں علم کی کیا اہمیت ہے؟ اس کو جاننے اور دوسروں کو اس کی روح سے آشنا کرنے کے لیے ایک لامتناہی اور کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، مثال کے طور پر حضرت علیؓ نے ایک بار حضرت کمیلؒ سے فرمایا کہ:

> ''اے کمیل، علم دولت سے بہتر ہے، علم پاسبانی کرتا ہے اور دولت کی پاسبانی تم کو کرنی پڑتی ہے، علم حکمراں ہوتا ہے اور دولت پر حکمرانی کی جاتی ہے، دولت خرچ ہونے سے کم ہوتی ہے اور علم خرچ کرنے سے زیادہ ہوتی ہے۔''

1.5 اسلامی تاریخ میں علم

قرآن، حدیث اور صحابہ کرامؓ سے ہوتا ہوا علم کی اہمیت کو سمجھنے، دنیا میں علم کی دولت کو عام کرنے کا یہ سلسلہ کس طرح جاری رہا، اس کو جاننے کے لیے اسلام کی تاریخ کا عہد بہ عہد مطالعہ غیر جانبداری اور کھلے ذہن و دماغ سے کرنا چاہیے۔

فتح موصلی نے ایک بار لوگوں سے پوچھا کہ اگر مریض کو کھانے پینے اور دوا دارو سے روک دیا جائے تو کیا وہ مر نہیں جائے گا، ظاہر ہے لوگوں کا جواب تھا کہ ہاں مر ہی جائے گا، اس کے بعد فتح موصلی نے کہا کہ:

''یہی دل کا حال ہے، اگر اسے تین دن علم و حکمت سے روک دیا جائے تو وہ مردہ ہوگا۔''

عبداللہ بن مبارکؒ کو ایسے شخص پر تعجب ہوتا تھا جو علم حاصل نہیں کرتا اس کے باوجود اپنے کو عزت کا مستحق سمجھتا ہے۔

علم کی اہمیت کی یہ تلقین اس لیے مسلسل ہوتی رہی ہے کہ اسلام میں اس کی اہمیت، اس کی افادیت کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہی، دنیا میں یہ

بات پھیلتی رہی کہ:

"علم والے زمانوں کے چراغ ہیں' ان میں سے ہر عالم اپنے اپنے زمانے کے لیے روشنی ہے جس سے اس زمانہ کے لوگ روشنی حاصل کرتے ہیں۔"

یہ بھی کہا گیا کہ:

"علم اس شخص کو دو' جو اُسے عمدہ طریقے سے سنبھالے' اس کو ضائع نہ کرے۔"

زندگی میں علم کا کیا مقام ہے؟ اس کے بارے میں امام ابوسفیان ثوریؒ اور امام شافعیؒ جیسی عہد ساز شخصیتوں کا یہ قول کافی ہے کہ:

"فرائض کی ادائی کے بعد علم کی طلب سے زیادہ فضیلت والی کوئی چیز نہیں۔"

معلومات کی جانچ

1- قرآن کے تصور علم پر روشنی ڈالیے۔

2- حدیث میں علم کی کیا اہمیت بیان کی گئی ہے لکھیے۔

3- اسلامی تاریخ میں علم کیا اہمیت رہی ہے بیان کیجیے۔

1.6 علم کا مقصد

علم کی ضرورت پر یہ چند باتیں ہیں' اصولی اور بنیادی باتیں' لیکن اسلام کے تصور علم میں صرف ضرورت ہی پر زور نہیں بلکہ علم کے ساتھ عمل بھی اسلام میں ضروری ہے اور یہ بھی کہ علم حاصل کرنے کا مقصد' اپنے پیدا کرنے والے کی خوشنودی حاصل کرنا بھی ہو۔

یہ جملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ علم کی طلب کسی بری نیت سے نہ ہو' اس کی طلب میں دنیاوی غرض اور چاہت جیسے عہدہ' مرتبہ' ثروت' شہرت' ہوس نہ ہو۔ اسلام کے تصور علم پر جب بھی بات ہوگی تو پیغمبر اسلام کے اس جملہ کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا کہ:

"جو شخص علم اس غرض سے حاصل کرے کہ وہ اس کے ذریعہ بے وقوفوں سے بحث مباحثہ کرے یا اس کی طرف لوگ عقیدت سے جھکیں تو اللہ اس کو دوزخ میں داخل کرے گا"۔ یا یہ قول پیغمبر ﷺ:

"جس شخص نے علم' خدا کے سوا کسی دوسرے کے لیے حاصل کیا اور خدا کے علاوہ اس کی طلب میں کوئی دوسری غرض شامل رہی تو خدا جہنم میں اس کا ٹھکانہ بنائے گا۔

ایسے اقوال اور ارشادات کی بڑی تعداد ہے۔ اور جس تسلسل سے قرآن و حدیث کے منشاء و ارادہ کو بیان کیا جاتا رہا اس سے یہ فیصلہ کرنا یا اس نتیجہ پر پہنچنا فطری اور حقیقت پر مبنی ہے کہ اسلام نے علم کی طلب' اس کی اشاعت کو ایسا فرض بنا دیا جو کسی بھی انسان کے لیے اس کی غذا اور ضرورت زندگی ہی کی طرح ضروری ہے' لیکن محض علم اسلام کی نگاہ میں کافی نہیں' اس کے لیے انسانوں میں اس کی افادیت' مقصدیت اور

ہر انسان کی زندگی میں اس کی کارفرمائی بھی ضروری قرار دی گئی کہ علم کی افادیت بغیر عمل کے سامنے نہیں آسکتی' اس لیے انسان کی زندگی میں علم کا عکس، عمل کی صورت میں ظاہر ہونا ہی علم کی قدر کرتا ہے۔

اسلام یوں تو حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہر نبی کا پیغام اور مقصد رہا ہے' لیکن آخری اور مکمل شکل اس کو حضرت محمد ﷺ کی رسالت و بعثت سے خاص کر دیا گیا۔ رسول اکرم ﷺ نے جہاں انسانیت کی کامیابی اور ترقی کے لیے اپنے مقاصد کا اعلان کیا وہیں یہ بھی فرمایا کہ میں بحیثیت معلم کے بھیجا گیا ہوں۔

علم و حکمت کی تعلیم، رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں تو شامل ہی ہے' اس کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر احسان کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا :

لقد من الله على المومنين اذ بعث فيهم رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة.

یعنی اللہ پر یقین کرنے والوں پر اللہ کا احسان ہے کہ ان کے لیے ایسا رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں بتلاتا ہے۔ اور سنوارتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام میں جہاں علم کی باتیں ہوتی ہیں وہیں علم کے مترادف کے طور پر حکمت کا لفظ بھی آتا ہے۔

علم اسلام کی نگاہ میں کیا ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک اوپر گزر چکی ہے۔ اب حکمت کے بارے میں اسلام کے تصور پر کچھ باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

1.7 اسلام میں حکمت کا تصور

قرآن مجید میں حکمت اور اس سے تعلق رکھنے والے الفاظ 200 سے زیادہ آیتوں میں آئے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علم کے ساتھ حکمت کی یہ صفت اسلام میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

کچھ آیتیں تو اپنے مضامین کی تکرار کی وجہ سے بہت مشہور اور زبان زد ہیں جیسے :

ادع الى سبيل ربک بالحكمة (قرآن)

(اے رسول!) آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلائیے)

ذلک مما اوحى اليک ربک من الحكمة (قرآن)

(یہ باتیں آپ کے پروردگار کے اتارے ہوئے حکیمانہ کلام میں سے ہیں)

ولقد آتينا لقمن الحكمة (قرآن)

(ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی)

واذكرن مايتلى فى بيوتكن من آيات الله والحكمة (قرآن)

(یادرکھواللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جوتمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں)

وشددنا ملكه و آتيناه الحكمة (قرآن)

(اور ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کردیا تھا اور اسے حکمت دی تھی)

قدجئتكم بالحكمة (قرآن)

(میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں)

حكمة بالغة فما تغن النذر (قرآن)

(ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے)

علم و حکمت کا یہ ساتھ سب سے زیادہ خود خالق کائنات کی معرفت میں ظاہر ہوتا ہے۔علیم کے ساتھ حکیم کا آنا ایک دو جگہ نہیں بکثرت جگہوں پر ہے۔

یعنی اسلام کا تصور علم و حکمت' انسان کے معبود اور اس کے خدا کے وجود کے ساتھ اور اسی پر منحصر ہے۔ اسلام میں حکمت کی علم کے ساتھ آمیزش کے لیے یہی ایک بات کافی ہے' لیکن یہاں یہ جاننے میں بھی مضائقہ نہیں کہ آخر حکمت کیا ہے اور اسلام اس لفظ کی معنویت کو کس انداز میں رکھتا اور پیش کرتا ہے۔

حکمت کے معانی عربی لغات میں کئی ہیں' جیسے مضبوط ہونا' پختہ ہونا' منع کرنا' روکنا' کسی چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا' امتیازی حد کو قائم کرنا' فیصلہ کرنا' بہترین علوم کے ذریعہ بہترین واقعات کو جاننا' یعنی اہم ترین حقائق کو اہم علوم کی مدد سے دریافت کرنا۔

حکیم اور حکمت کا تعلق ظاہر ہے۔حکیم کے ایک معنی یہ بتائے گئے کہ

من يحسن دقائق الصناعات ويتقنها یعنی جو صناعتوں کی باریکیوں تک بڑی خوش اسلوبی سے پہنچ سکے اور ان میں پختگی حاصل کرلے۔کہیں کہیں تو حکمت کے لیے لفظ حکم بھی ہے جیسے:

و آتيناه الحكم صبياً (سورہ مریم) حکم بمعنی علم وفقہ کے لیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ حکمت ایسی نفع بخش بات ہے جو جہالت اور حماقت سے روکتی اور بچاتی ہے۔

وعظ و نصیحت کے معنی بھی حکمت میں شامل ہیں اور اس معنی میں قرآن مجید کی اکثر آیتیں گواہ ہیں' ان کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

مفردات القرآن میں حکمت کی تشریح ذرا تفصیل سے آئی ہے اور اس کے متعدد مفہوم بیان کیے گئے ہیں جیسے:

ولقد آتينا لقمن الحكمة (سورہ لقمان)۔اس میں حکمت کے معنی علم و عقل کے ذریعہ حق بات دریافت کرنے کے ہیں۔

حکمت الٰہیہ کے معنی اشیاء یعنی چیزوں کی معرفت اور ان کی ماہیت کا علم بتایا گیا۔

انسانی حکمت سے مراد موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو انجام دینا بھی بتایا گیا ہے۔

یہ اس آگاہی یا شعور کا بھی نام ہے جو گزرے زمانے کی قوموں کے حالات سے تجربہ کا نام ہے۔ **ولقد جاء هم من الانباء مافيه مزدجر حكمة بالغة فما تغن النذر** (قرآن) سے یہی تجربہ اور سبق مراد ہے۔

مفسرین نے حکمت سے مراد قرآن کی تفسیر یا قرآنی حقیقتوں کی سمجھ بھی بیان کی ہے۔

ناسخ، منسوخ، محکمات اور متشابہات کے علم کے بارے میں کہا گیا کہ یہ بھی حکمت کے ذیل میں آتا ہے۔

یہ بھی تشریح کی گئی کہ حکمت کو سنت نبوی ﷺ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

علم و حکمت کا فرق بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ حکمت، علم ہی ایک ایک شاخ ہے، یعنی علم اور حکمت میں ماہیت کا فرق نہیں، فرق اگر ہے تو غایت اور نوعیت کا ہے۔

جرجانی نے التعریفات میں لکھا کہ حکمت سے حقیقت تو مراد ہی ہے، عمل بھی اس کے معنی میں شامل ہے۔ ان کے نزدیک شریعت کے علوم اور حلال و حرام کا علم بلکہ اسرار و رموز کا علم بھی حکمت کے مفہوم میں شامل ہے۔ اس لفظ کی گہرائی اور جامعیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اہل معرفت حضرات صوفیہ نے اس کے معنی اپنے لحاظ سے بتائے تو ابن مسکویہ نے وضاحت کی کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس کی حقیقت کا علم انسانی طاقت کے لحاظ سے جتنا ممکن ہے وہی حکمت ہے اور یہیں سے معقولات کے علم کے لیے حکمت کے معنی ظاہر ہوئے، یعنی موجودات کے احوال کا علم، جو یا تو انسان کی قدرت و اختیار میں ہے یا اس سے باہر ہے، جو علم قدرت و اختیار میں ہے۔ اس کو حکمت عملی کہا گیا اور جو نہیں ہے اس کو حکمت نظری بتایا گیا۔ حکمت نظری کی بھی تین قسمیں بتائی گئیں۔

1. ایک تو وہ علم جو ان حقائق کا ہو جو اپنے وجود کے لیے مادے کے محتاج نہیں۔ جیسے خدا کا علم، یہ علم الٰہیہ یا اسے مابعد الطبیعی بھی کہتے ہیں۔
2. دوسری قسم، علم اوسط کی ہے جیسے ریاضی۔
3. تیسری قسم علم الادنی کی ہے اس کو طبیعی بھی کہتے ہیں۔

منطق کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ حکمت میں شامل کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ ابن سینا کا یہ قول بھی دلچسپ ہے کہ علم دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو ہمیشہ اور ہر جگہ نہیں رہتے بلکہ عارضی ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو ہر زمانے میں رہتے ہیں اور یہی حکمت کے مفہوم میں ہیں، ان میں طب، زراعت اور دوسرے انفرادی علوم اس کی شاخیں ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طب وغیرہ کو حکمت میں شامل کرنے کی روایت یونانیوں سے آئی اور عربوں نے حکمت کے بڑے مفہوم کو دیکھتے ہوئے اس کو قبول بھی کر لیا۔ تیسری صدی ہجری میں علی الطبری نام کے ایک ایرانی طبیب کی ایک کتاب کا ذکر ملتا ہے، اس کا نام فردوس الحکمۃ ہے اور اس فردوس حکمت میں بقراط، جالینوس، ارسطو اور حنین بن اسحاق جیسے طبیعی علوم سے تعلق رکھنے والوں کے حوالے موجود ہیں۔

ابن سینا نے جب علوم عقلیہ کی قسموں کے بارے میں لکھا تو اس میں حکمت کو ایک بنیادی حیثیت دی اور سب سے پہلے شروع ہی اس بات سے کیا کہ:

"یہ (حکمت) مشاہدے کا فن ہے، جس کے ذریعہ انسان اپنے اندر (علم کے ذریعہ) ہر وجود رکھنے والی چیز کا اور اس چیز کا جس پر اسے ضرور عمل کرنا چاہیے، پختہ معلومات حاصل کر لیتا ہے تا کہ وہ بلند، کامل اور ایک معقول عالم بن جائے۔

حکمت کی یہ تعریف شاید سب سے زیادہ مناسب ہے کہ اس میں طبعی علوم، ریاضی، علم الٰہیات، اخلاقیات، گھریلو معاشیات، سیاسیات، مابعد الطبیعیات، معدنیات آ جاتے ہیں، ابن سینا کے حکمت فرعیہ کے بیان میں طب، ہیئت کہ جادو کا بھی ذکر ملتا ہے۔ معدنیاتی اشیاء کے خواص کے کیمیا کے استعمال کا بھی ذکر ہے، الجبرا اور مائیات کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

ابن سینا کی ایک اور کتاب کا نام عیون الحکمۃ ہے، اس میں حکمت طبیعی کے تحت سائنسی موضوعات طبیعیات، حرکت، زماں کا ذکر کر کے وہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ علم دراصل حکمت سے زیادہ قریب ہیں۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ آخر میں کہا یہ جاتا ہے کہ حکمت، علم کی اعلیٰ روحانی تصور ہے، اس میں انسان کی دسترس میں آنے والے علم یہاں تک کہ وحی کے ذریعہ خدا پر ایمان لانے کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

اس ساری گفتگو کے بعد، حکمت کی وہ اصل بالکل واضح ہو جاتی ہے جو قرآن مجید میں ہے۔

قرآن مجید میں دو مقامات ایسے ہیں جن میں سے ایک مقام پر صاف کہا گیا کہ یہ حکمت کے وہ مقامات ہیں جن کو آپ ﷺ پر وحی کیا گیا اور دوسری جگہ کہا گیا کہ یہ وہ حکمت ہے جو ہم نے حضرت لقمان کو دی۔

پہلا مقام سورہ بنی اسرائیل میں ہے، جہاں وقضی ربک ان لاتعبدوا سے وہ احکام شروع ہوتے ہیں اور کل ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا " (قرآن) پر ختم ہوتے ہیں اور پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ "۔ یہ وہ باتیں جو حکمت کی ہیں اور منجملہ وحی الٰہی سے ہیں۔

اسلام کے تصور حکمت میں خدا ہی کی عبادت، والدین سے حسن سلوک، رشتہ داروں، غریبوں محتاجوں اور مسافروں کے حقوق کا خیال، دولت کے بے دریغ استعمال اور اس کے برعکس انتہائی بخیلی سے احتراز یعنیجہ اعتدال کی رعایت اور دولت کا اصل مصدر، قدرت الٰہیا ورغربی اور روزی کی عدم فراہمی کے بہانے قتل اولاد کا جرم، زنا کی فاحشیت اور اس کے راستہ کی برائی، ناحق انسانی جان لینے کی ممانعت، قتل مظلوم کے بدلہ میں وارثوں کو اختیار، یتیم کے مال کی حفاظت، وعدوں اور معاہدوں کی پاسداری، ناپ تول میں ایمانداری، بے ضرورت اور بے فائدہ چیزوں کے پیچھے پڑنے کی خرابی، آنکھ، کان اور دل کی جواب دہی اور غرور سے نفرت جیسے معاملات کو حکمت سے تعبیر کیا گیا اور تقریباً یہی باتیں لقمانی حکمت میں اختصار سے بیان کی گئیں۔

1.8 اسلام میں سائنس کا تصور

دیکھا جائے تو الٰہیات، معاشرت، معیشت، تمدن، تہذیب و ثقافت، عدم تشدد، قانون و عدالت، میثاق و معاہدے، ریاست کی ذمہ داری، تجارت، ذرائع ابلاغ کی ذمہ داریاں اور خود انسان کی اپنی ذمہ داریاں اور بے جا فخر و غرور اور اقتدار کے نشہ سے دور رہنے کی باتیں وہ بنیادی

باتیں ہیں جو قرآنی حکمت کو عقل انسانی کی وسعت کے ساتھ ان باتوں تک لے جاتی ہیں جو ان موضوعات کو اپنے دائرے میں لے آتے ہیں جن کا ذکر اوپر ابن سینا جیسے لوگوں کی کتابوں میں ان موضوعات کے بیان میں آ چکا ہے۔ جن کو ہم بڑی آسانی سے آج سائنسی علوم کا نام دیتے ہیں۔ یہ علوم آج کے تناظر میں عقلی علوم ہیں' اس لیے بڑی آسانی سے ان کو روحانی یا اخلاقی علوم سے الگ بتایا جاتا ہے لیکن اگر اسلام کے تصور حکمت کو زیادہ وسعت سے اور زیادہ گہرائی سے اور زیادہ غور سے دیکھا جائے تو حکمت کی جتنی لغوی اور اصطلاحی تعریفیں اوپر بیان کی گئیں وہ سب اسلام اور قرآن کے تصور حکمت سے الگ نہیں' بلکہ ان کی صحیح ترجمانی ہیں اور ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ محض غلط فہمی پر مبنی ہے کہ :اسلام نے دوسرے دنیاوی علوم، جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے اور جن پر انسانی معاشرت' عمرانی ضرورت اور جسمانی آسائش کا مدار ہے' ان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

علم وحکمت کے اسلامی تصور میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کا تعلق علم اور اس کے مقصد اعلیٰ سے ہے' ورنہ اس نے دنیاوی' عمرانی' اجتماعی اور معاشرتی ضرورتوں کے لیے کسی علم کا راستہ بند نہیں کیا' بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ حدیث میں ہے:

''تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ جاننے والے ہو۔''

یہ قول ارشاد نبی ﷺ ہے اور اس سے علم کے عموم اور اس کے جواز کی دلیل مل جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا علم کا مقصد برا بھی ہوسکتا ہے؟ جواب ہے کہ اسلام نے اس علم سے ضرور متنبہ کیا ہے' جس کا حاصل کرنے والا یہ نیت رکھے کہ اس سے محض دنیوی غرض حاصل کرنا' جب کہ وہ اس سے اللہ کی خوشنودی بھی حاصل کرنے کی نیت کرسکتا ہے تھا' ایسا نہ کرکے اس نے خود کو جنت کی خوشبو سے محروم کرلیا۔

اسلام کے تصور علم وحکمت کی تشریح وقت گزرنے اور نئے تقاضوں کے سامنے آنے کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی اور یہ قرآن وحدیث کی بنیاد اور ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوکر ہوتی رہی' بالکل اسی طرح جس طرح فقہی اور کلامی مسائل سامنے آتے رہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کی تشریحیں اور وضاحتیں ہوتی رہیں۔

امام غزالیؒ اور ابن خلدونؒ نے علم وحکمت کے موضوع پر نہایت عالمانہ گفتگو کی اور یہ ایسی جامع تھی کہ آج بھی ان کی معنویت میں فرق نہیں آیا۔

امام غزالیؒ نے علوم کی دو قسمیں بتائیں کہ ایک شرعی علوم ہیں دوسرے غیر شرعی' علوم شرعیہ تو ظاہر ہیں' علوم غیر شرعیہ میں انہوں نے طب' حساب وغیرہ کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ پسندیدہ علوم ہیں' ناپسندیدہ علوم میں انہوں نے سحر' شعبدہ بازی اور نظر بندی کا ذکر کیا اور ایک تیسری قسم مباح کی بتائی جیسے ان اشعار کا پڑھنا جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ سے دلچسپی رکھنا۔

امام غزالیؒ نے اس کے بعد علم میں ان پیشوں کو بھی داخل کیا اور کہا کہ انسان کی پیدائش کے مقاصد میں دین اور دنیا دونوں شامل ہیں۔ دین اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک دنیاوی نظام قائم نہ ہو اور دنیاوی نظام' انسان کے کاموں اور پیشوں پر موقوف ہے۔ امام صاحب نے چار بنیادی پیشوں کا ذکر کیا:

1-زراعت 2- پارچہ بافی 3- تعمیر 4- سیاست یعنی خاندان اور ملک کے انتظام اور معیشت کے اسباب مہیا کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کے لیے یہ چار بنیادی پیشے ہیں۔ امام صاحب نے لوہاری اور ندافی وغیرہ کو ان کی مدد کرنے والے پیشے بتائے ہیں۔

یہ باتیں اس لیے آ گئیں کہ اسلام کا یہ نظریہ سامنے آ جائے کہ علم دین کی فضیلت اپنی جگہ، لیکن دوسرے علوم غیر شرعی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا، امام غزالی نے لکھا ہے کہ:

''علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدوں سے دی جا سکتی ہے جو میدان میں دین کی حمایت کے لیے سربکف رہتے ہیں اور دوسرے علوم حاصل کرنیوالوں کی مثال فوج کے اس دستہ کی ہے جو سرحدی قلعوں پر سرحد کی حفاظت کے لیے متعین ہوتا ہے۔''

مشہور مورخ و دانشور ابن خلدون نے اور بھی وضاحت سے لکھا کہ اسلام کے تعلیمی نصاب میں صرف مذہبی تعلیم ہی کو شامل کرنا صحیح نہیں، بلکہ علمائے اسلام نے تمام علوم کو عقلی و نقلی دو بڑی قسموں میں بانٹ کر ظاہر کر دیا ہے کہ انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے عقلی علوم اور دین و مذہب اور آخرت کی بھلائی کے لیے نقلی علوم کو حاصل کرنا فرض ہے۔

معلومات کی جانچ

1- اسلام میں حکمت کے تصور پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیے۔

2- اسلام میں سائنسی نظریات کی بنیادیں کیا ہیں، لکھیے۔

3- اسلام میں علم کا مقصد کیا ہے، وضاحت کیجیے۔

1.9 خلاصہ

اس بحث کے خلاصہ کے طور پر ایک بار پھر جان لینا چاہیے کہ:

علم، جہل کی ضد ہے اور اس کا مطلب کسی شئے کی حقیقت کو جان لینا ہے، علم کے مترادف الفاظ ادراک، شعور اور معرفت اور صناعت بھی آتے ہیں۔ حکمت کا لفظ قرآن مجید میں علم کے ساتھ متعدد جگہوں پر آیا ہے۔ حکمت میں علم کے مقابلہ میں زیادہ معنی موجود ہیں۔

علم کے معنی میں وسعت آئی تو حکمت خاص طور پر فلسفہ اور سائنس کے دائرے میں آ گئی۔ علم کی تعریف، اسلام کی تاریخ، متعدد طرح سے ہوئی، اس کی وجہ نقطہ نظر کا اختلاف ہے۔

قرآن و حدیث میں علم کی بہت سی قسمیں آئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کی رو سے علم کو غیر معمولی بلکہ فوق الکل اہمیت حاصل ہے اور اسی لیے اسلام کی تاریخ میں فلسفہ، علم کلام، علم تاریخ، جغرافیہ، ہیئت و نجوم، مناظر و مرایا، جبر و مقابلہ، کیمیا، طب، ادب، علوم طبیعیہ، عملی طبیعیات، علوم حکمت عملی جیسے عنوانات، انسانی تاریخ میں پہلی بار ملتے ہیں اور ان کے ذیل میں ہزاروں کتابیں ہیں، جن کے بارے میں خاصی معلومات ابن ندیم کی کتاب الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون سے مل سکتی ہیں۔ زندگی میں علم کا کیا مقام ہے؟ اس کے بارے میں

امام ابوسفیان ثوریؒ اور امام شافعیؒ جیسی عہد ساز شخصیتوں کا یہ قول کافی ہے کہ: ''فرائض کی ادائی کے بعد علم کی طلب سے زیادہ فضیلت والی کوئی چیز نہیں۔''

قرآن مجید میں حکمت اور اس سے تعلق رکھنے والے الفاظ 200 سے زیادہ آیتوں میں آئے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علم کے ساتھ حکمت کی یہ صفت اسلام میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ مفسرین نے حکمت سے مراد قرآن کی تفسیر یا قرآنی حقیقتوں کی سمجھ بھی بیان کی ہے۔ ناسخ، منسوخ، محکمات اور متشابہات کے علم کے بارے میں کہا گیا کہ یہ بھی حکمت کے ذیل میں آتا ہے۔ یہ بھی تشریح کی گئی کہ حکمت کو سنت نبوی ﷺ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

حکمت، علم ہی ایک ایک شاخ ہے، یعنی علم اور حکمت میں ماہیت کا فرق نہیں، فرق اگر ہے تو غایت اور نوعیت کا ہے۔ علم و حکمت کے اسلامی تصور میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کا تعلق علم اور اس کے مقصد اعلیٰ سے ہے، ورنہ اس نے دنیاوی، عمرانی، اجتماعی اور معاشرتی ضرورتوں کے لیے کسی علم کا راستہ بند نہیں کیا، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ امام غزالیؒ نے علوم کی دو قسمیں بتائیں کہ ایک شرعی علوم ہیں دوسرے غیر شرعی، علوم شرعیہ تو ظاہر ہیں، علوم غیر شرعیہ میں انھوں نے طب، حساب وغیرہ کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ پسندیدہ علوم ہیں، ناپسندیدہ علوم میں انہوں نے سحر، شعبدہ بازی اور نظر بندی کا ذکر کیا اور ایک تیسری قسم مباح کی بتائی جیسے ان اشعار کا پڑھنا جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ سے دلچسپی رکھنا۔

مشہور مورخ و دانشور ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اسلام کے تعلیمی نصاب میں صرف مذہبی تعلیم ہی کو شامل کرنا صحیح نہیں، بلکہ علمائے اسلام نے تمام علوم کو عقلی و نقلی دو بڑی قسموں میں بانٹ کر ظاہر کر دیا ہے کہ انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے عقلی علوم اور دین و مذہب اور آخرت کی بھلائی کے لیے نقلی علوم کو حاصل کرنا فرض ہے۔

آخر کلام یہی ہے کہ علم، مسلمانوں کے لیے عین دین ہے، مشہور مستشرق روزنتھال کا یہ کہنا صحیح ہے۔ کیوں کہ دین انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے اور حواس و روح اور دنیا و آخرت سب اس میں شامل ہیں۔

1.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. قرآن میں علم کا کیا تصور بیان کیا گیا ہے؟
2. قرآن کے تصور حکمت کے بارے میں گفتگو کیجیے۔
3. اسلام اور سائنس کے موضوع پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے

4. اسلام نے علم کی اہمیت کس طرح بیان کی ہے؟

5. اسلام میں علم کا کیا مقصد بیان کیا گیا ہے؟

6. اسلام میں علم کی تاریخ پر روشنی ڈالیے؟

1.10 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. اسلامی نظام تعلیم — مولانا ریاست علی ندوی

2. اردو دائرۃ معارف اسلامیہ — پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

3. حکمائے اسلام — مولانا عبدالسلام ندوی

4. علوم عرب، ترجمہ تاریخ التمدن الاسلامی جرجی زیدان

اکائی 2: عہد اسلامی میں ترجمہ کی تحریک اور عقلی وسائنسی علوم کا ارتقاء

اکائی کے اجزا

2.1 تمہید:

علم وحکمت کا تعلق ظاہر ہے انسان کی بنیادی ضرورت اور شناخت سے ہے' یہ بھی ظاہر ہے کہ مذہب سے کوئی انسان کبھی بے تعلق نہیں رہ سکا وہ بھی جو بظاہر لامذہبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں' کسی نہ کسی منزل پر ان کو مذہب پر یقین نہ کرنے کے باوجود مذہب کی حیثیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

اسلام ایک مذہب ہے اس سے پہلے بھی اور مذاہب ہوئے اور ان مذہبوں میں علمی وفکری اور فلسفیانہ طبقات بھی ہوئے' انسانیت کو ان سے کتنا فائدہ ہوا اور خود انسانوں نے ان مذہبوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ ان سوالوں کے عموم سے قطع نظر اسلام کے مطالعہ میں بھی یہ سوالات خاص طور پر سامنے آتے یا لائے جاتے ہیں۔

ان سطروں میں یہ بتانے کی کوشش ہے کہ جب اسلامی دور کا آغاز ہوا اور پھر اس کی توسیع ہوئی تو انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کی

طرح علمی وفکری اور سائنسی لحاظ سے اسلامی عہد میں کیا کوششیں کی گئیں؟ قدیم علوم وفنون کا احیاء کیا گیا' نئے علمی مباحث سے روشناس کیا گیا اوران سائنسی ترقیات میں تنگ نظری کی جگہ نہایت فراخ دلی کا کس طرح مظاہرہ کیا گیا؟

عہد اسلامی میں ترجمہ کی تحریک اور علی وسائنسی علوم کا ارتقاء:

2.2 مقصد

اسلام اور سائنس کے موضوع پر اس اکائی کا عنوان ''عہد اسلامی میں ترجمہ کی تحریک اور عقلی وسائنسی علوم کا ارتقاء'' ہے یعنی جب سائنس پر اسلام کے حوالے سے گفتگو ہو تو یہ واقفیت رہے کہ اسلامی عہد میں حکمرانوں سے لے کر عوام تک میں علمی' عقلی اور سائنسی فکر اور ضرورت کے مطابق نئے نئے طریقوں سے انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے ایسا ماحول تیار کیا گیا جو عقلی وسائنسی علوم کے لئے ساز گار ہو۔ انسانی معاشرہ ترقی پذیر ہے' اسلام نے اس فطری ضابطہ کی مخالفت نہیں کی۔ علوم کے سرچشموں کو اسلام نے تلاش ہی نہیں کیا' ان سے نئے دھارے بھی نکالے۔ اس کے سامنے ہمیشہ یہ قول رہا کہ حکمت تو مومن کی گم شدہ میراث ہے' جہاں ملے اس پر اس کا حق ہے۔

2.3 اسلام کا اجمالی تعارف

دنیا میں آخری رسول کے ذریعہ خدا کے آخری پیغام یعنی اسلام کامل کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں 622ء سے ہوا یعنی جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے۔ اسی صدی کے اختتام تک اسلام سارے مشرق وسطیٰ' شمالی افریقہ اور اسپین تک پھیل گیا۔

یہ بات غور کرنے کے لائق ہے کہ اسلام خود کو معتدل مذہب یا درمیانی راستہ والا مذہب قرار دیتا ہے۔ ''امت وسط'' کی تعبیر یہی ہے' اسی طرح اس کی اشاعت بھی دنیا کے اس علاقہ میں ہوئی جو کرہ ارض کا درمیانی علاقہ کہا جاتا ہے۔

بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک کا یہ علاقہ اپنے تاریخی آثار وتمدنی باقیات کی وجہ سے کئی پرانی تہذیبوں کا گہوارہ مانا جاتا ہے' ظاہر بات ہے کہ جب اسلام کا تعلق اس علاقہ سے ہوا تو پرانی تہذیب اور علوم سے اس کا سابقہ پڑنا فطری بات تھی۔

تاریخ اسلام کے ابتدائی عہد ہی سے معلوم ہوتا ہے اور یہ مطالعہ دلچسپ بھی ہے کہ عرب مسلمانوں کو اگرچہ ایرانیوں اور رومیوں سے خلافت راشدہ ہی میں سابقہ پڑنا شروع ہو گیا تھا لیکن چونکہ اس وقت مسلمانوں کی تمام تر توجہ دین اور سیاست کی جانب تھی اور مفتوح قوموں سے یا ان کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنا زیادہ اہم تھا اس لئے خلافت راشدہ جس کی مدت چالیس سال سے زیادہ نہیں' اس کے عہد میں علوم کا مرکز دین ہی رہا اور اس کا اثر یہ تھا کہ وہ علوم جو عرب میں اسلام سے پہلے کے دور میں تھے' مثلاً شاعری' خطابت' انساب' طب' نجوم' قیافہ شناسی وغیرہ ان کی ترقی اور تنزلی میں بنیادی عنصر اس طرح کارفرما ہوا کہ ان میں جو علوم وفنون اسلام کے مزاج کے مطابق نہ تھے ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی' جیسے علم نجوم اور کہانت وغیرہ' لیکن جو علوم اصلاح کے لائق تھے مثلاً شاعری' اس میں وہ حصہ بے اثر کر دیا گیا جو فحاشی' ہجو اور بے جا فخر وغرور کو ہوا دینے والا تھا' اس کی جگہ اخلاقی اور حکیمانہ شاعری کو برقرار رکھا گیا۔

2.4 عہد خلافت راشدہ

خلافت راشدہ کے زمانہ کا اس لحاظ سے مطالعہ کیا گیا ہے کہ خلفائے راشدین خصوصاً حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ شعر و سخن کے بڑے نقاد تھے اور اس میں بلند پایہ ذوق رکھتے تھے۔ دونوں کی جانب کچھ اشعار بھی منسوب ہیں، خصوصاً حضرت علیؓ سے تو پورا دیوان ہی منسوب ہے۔ گو اس کی تحقیقی حیثیت مسلم نہیں تاہم شعری ذوق کا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔

شاعری کی طرح خطابت کے فن کو بھی اس عہد میں عروج حاصل ہوا اور مذہبی علوم میں اسی دور خلافت راشدہ میں تفسیر و حدیث اور فقہ کی بنیادیں مضبوط ہونی شروع ہوگئیں اور پھر علوم کی نئی نئی شکلیں سامنے آنے لگیں جیسے سیر و مغازی وغیرہ۔ علم نحو کا فن حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایجاد ہوا، وجہ ظاہر ہے عربوں کو عربی قواعد سیکھنے کی ضرورت کم تھی، لیکن جب اسلام کا پھیلاؤ شروع ہوا، دوسری قومیں اس سے آشنا ہونے لگیں تو قرآن و حدیث کے مطالعہ کے لئے اور صحیح طور پر عبارت سے واقفیت کے لئے اصول ضوابط مقرر ہونے لگے۔ حضرت علیؓ نے اپنے ایک شاگرد ابوالاسود دولی کو علم نحو کی تدوین کی ہدایت کی۔

خلافت راشدہ میں جس علمی ترقی کی راہیں کھلنے لگیں، ان کا اور عمدہ مظاہرہ بنی امیہ کے دور میں سامنے آیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اسلام میں سب سے پہلے تاریخ کی کتاب لکھوائی، ان کے وقت تک یعنی 59 ہجری تک اسلام کی پچاس ساٹھ سال کی زندگی میں تاریخ پر کسی کتاب کا وجود نہیں تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس زمانہ کے ایک مشہور شخص عبید بن شریہ سے فرمایا کہ وہ قدیم تاریخ کی داستانوں، عجم کے بادشاہوں کے حالات، زبانوں کی ابتداء اور اس کے پھیلنے سے متعلق اپنی معلومات کو مرتب کریں۔ عبید بن شریہ اس قسم کی معلومات میں ماہر تھے اسی لئے ان کو ''اخباری'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی فرمائش پر کتاب الامثال والملوک جیسی کتابیں لکھیں۔ یعنی اب اسلام کے ساٹھ سال ہوتے ہوتے تاریخ نگاری کی طرف توجہ مبذول ہونے لگی اور یہ ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کے حالات جاننے کے لئے عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کے جاننے اور ان کے مضامین عربی میں لانے کی صلاحیت مطلوب تھی۔ یہیں سے عہد اسلامی میں ترجمہ کی تحریک کا آغاز سمجھا جانا چاہئے۔

2.5 بنوامیہ اور ترجمہ کی تحریک کا آغاز

عہد اسلامی کا یہ دور، بنوامیہ کا دور بھی کہلاتا ہے۔ جس کی حالات میں تاریخوں میں آتا ہے کہ اس دور میں علوم میں زیادہ وسعت و ترقی ہوئی، علمائے تابعین اسی عہد میں تھے، ان کے مستقل حلقۂ درس تھے، جن سے بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے، اس کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اسی دور میں بعض نئے علوم پیدا ہوئے اور غیر قوموں کے بعض علوم سے بھی مسلمان روشناس ہوئے۔ ان جملوں کے اجمال کی کچھ تفصیل اس طرح آئی کہ حضرت معاویہؓ کے ایک پوتے خالد بن یزید (۸۵ ہجری م 704 عیسوی) پہلے شخص ہیں جنہوں نے عہد اسلامی میں ترجمہ کی بنیاد رکھی۔ خالد خود بڑے صاحب علم تھے، عقلی علوم سے خاص طور پر ان کو دلچسپی تھی۔ فلسفہ اور کیمیاء کا خاص ذوق تھا، کیمیاء پر خود ان کی کئی کتابیں ابن الندیم کی نظر سے گزری تھیں، جیسے کتاب الحرار، کتاب الصحیفہ الکبیر، کتاب الصحیفہ الصغیر، اب یہ کتابیں موجود نہیں، لیکن خالد بن یزید کا نام زندہ ہے کہ وہ ''حکیم آل مروان'' کے لقب سے یاد کئے گئے اور ترجمہ کے آغاز کا سہرا ان کے سر بندھا۔

اسلام میں ترجمہ کی تحریک کا جب بھی ذکر ہوگا' خالد بن یزید کو اس تحریک کے اولین بنیاد گزار کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ یہ تو متفق علیہ ہے کہ علم کیمیا میں انہوں نے مصر کے ایک طبیب اصطفن (اسٹیفن) سے کئی کتابوں کا ترجمہ کرایا' لیکن ان کے علاوہ طب' نجوم' حرب اور ادب میں بھی بقول ابن الندیم' خالد نے یونانی اور قبطی زبانوں سے کتابیں ترجمہ کرائیں۔ خالد کے حالات میں یہ بھی ملتا ہے کہ انہوں نے مدرسہ اسکندریہ کے ایک فاضل مریانوس کی شاگردی بھی حاصل کی۔ خالد کی ترجمہ کردہ یا ان کی تحریک پر دوسروں کی ترجمہ کی ہوئی کتابیں اس شان کی تھیں کہ ابن خلدون کو شک ہوا کہ کتابیں خالد بن یزید سے واقعتہً صحیح طور پر منسوب ہیں یا یہ کوئی اور خالد بن یزید ہیں۔ یہ شک اس بنیاد پر ہوا کہ اسلام کی پہلی صدی میں بقول ابن خلدون عرب ابھی بدویت سے پورے طور پر نکلے نہیں تھے' تو ان سے ایسی سائنسی کتابوں کے ترجمے بعید از قیاس ہیں۔ لیکن ابن الندیم (377ھ / 988ء) کا بیان ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ ابن خلدون (809ھ / 1406ء) سے کئی صدیاں پہلے گزرے ہیں۔ اسی وجہ سے تقریباً تمام متقدمین مورخین نے یہی تسلیم کیا کہ اسلام میں ترجمہ نگاری سب سے پہلے خالد بن یزید کے ذریعہ عمل میں آئی۔

2.6 ترجمہ نگاری کا فن

ترجمہ نگاری کے متعلق آج کی جدید دنیا میں کہا جاتا ہے کہ علوم جس سرعت سے پھیل رہے ہیں' اس کے نتیجے میں تمام قوموں کو ترجمے کی ضرورت کا احساس بہت بڑھ گیا' چنانچہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں دارالترجموں کا قیام ایک اہم ضرورت کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ یہ آج کی بات ہے لیکن اسلام کے دور آغاز میں اس کی ضرورت کا جس طرح احساس کیا گیا وہ حیرت انگیز ہے۔

آج اچھے مترجمین کی تلاش مغربی ملکوں کا ایک مسئلہ بھی ہے' امریکی مترجمین کی انجمن ATA نے 1979ء میں اپنی جو ڈائرکٹری شائع کی تھی اس میں صرف 511 مترجمین کے حالات دیئے گئے تھے۔ ترجمہ نگاری کی موجودہ مشکلات کو دیکھتے ہوئے عہد اسلامی کے آغاز میں جس شاندار پیمانہ پر ترجمہ نگاری کی تحریک کو فروغ ملا اس سے علمی مسائل سے مسلمانوں کی سنجیدہ کوششوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زبان وعلوم کی ترقی میں ترجمہ نویسی کی اہمیت کو کیسے سمجھا گیا؟ یہ حقیقت سامنے رہی کہ ترجمہ کے ذریعہ علوم کے نئے نئے گوشے وا ہوتے ہیں' مختلف خیالات اور عقائد سے واقفیت اور ان سے وابستگی ہی نہیں بڑھتی' بلکہ مختلف علوم سے انسانی ذہن لگاتار بڑھتا اور کشادہ ہوتا رہتا ہے۔ ترجمہ نگاری کی شاید یہی خوبی عہد اسلامی کے دور اول کی ان شخصیتوں کے سامنے تھی جن کو مذہبی لحاظ سے بھی فوقیت بلکہ امامت کا مقام حاصل تھا۔ مذہبی راسخ العقیدگی کے دور میں اگر خالد بن یزید اور ان جیسے لوگوں کے ذہن میں دوسری زبانوں اور ان کے علوم کی منتقلی کا خیال پیدا ہوا تو وجہ صاف ہے کہ ان کے سامنے ترجمہ نگاری کے وہ مقاصد تھے جن کا آج بھی بیان ہوتا رہتا ہے کہ ترجمہ ہی کے ذریعہ اچھی قدروں سے واقفیت ہوئی' انسان دوسرے انسان کے اور اس کی سوچ کے زیادہ قریب آتا ہے' زبان نہ جاننے کے باوجود زبان کے بولنے والوں کی معاشرت اور تہذیب کا علم ہوتا ہے' یعنی ترجمہ نگاری ہی سے ایک عالمی نقطۂ نظر پیدا ہوتا ہے' سوچ میں بے کراں وسعت آتی ہے' دوسری زبان والوں سے انسانیت اور اخوت کا رشتہ قائم ہونے میں نہ مشکل ہوتی ہے نہ دیر لگتی ہے۔ اسلام کے پیغام کی حقیقت سے واقفیت ہو تو اسلام میں ترجمہ نویسی کو تھوڑے ہی عرصہ میں قبول کرنے اور اس کو فروغ دینے کی وجہ عیاں ہو جاتی ہے کہ انسانیت اور اخوت کا پھیلاؤ ہی اسلام کا بنیادی کام ہے۔

ترجمہ نگاری کے سلسلے میں کچھ باتیں بہت اچھی کہی گئیں جیسے حاصل شدہ معلومات ہوں یا جذبہ واحساس کی ترجمانی ہو' دوسروں تک منتقل کرنے یا ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی خارجی وسیلہ ضروری ہے۔ یہ وسیلہ اشاراتی بھی ہوسکتا ہے اور عملی بھی' گفتگو کے ذریعہ بھی ممکن ہے اور نشانات اور تصویروں کے سہارے بھی کسی نہ کسی حد تک بروئے کار لایا جاسکتا ہے' لیکن سب سے زیادہ موثر' مفید' کارگر اور دیرپا ذریعہ تحریر ہے اور یہی تحریری ذریعہ ترجمہ کی بنیاد ہے اور ترجمہ سب سے عمدہ وہی ہے جو اصل سے زیادہ بہتر ہوجائے یا پھر اس سے کم اس طرح ہو کہ اصل کی نقل نہ لگے ورنہ پھر نقل کرنا' یہ ترجمہ کا وہ مقام ہے جس کو سپاٹ کے لفظ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

یہ حیرت انگیز سچ ہے کہ عہد اسلامی میں جو ترجمے کئے گئے وہ شروع ہی سے ایسے تھے جو اصل سے زیادہ دلکش اور بہتر سمجھے گئے۔ ترجمہ نگاری کی بات میں مذکورہ بالا چند باتیں اس لئے بیان کی گئیں کہ ان کے شعور ہی سے عہد اسلامی کی ترجمہ نگاری کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ خصوصاً مذہبی ونقلی علوم کی کثرت اور ان کی اہمیت کے ماحول میں عقلی اور سائنسی علوم کے ارتقاء کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے گا۔

عہد اسلامی میں ترجمہ کی تحریک کے متعلق اوپر خالد بن یزید کا ذکر آیا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ترجمہ کی بنیاد ڈالی' لیکن عام مورخین کا خیال ہے کہ اس اولیت کا سہرا عباسی خلیفہ ثانی ابوجعفر منصور کے سر ہے' علامہ شبلی کا خیال ہے کہ یہ منصور کے حق میں مورخین کی بے جا فیاضی ہے۔ انہوں نے بھی اسی قول کو زیادہ بہتر مانا ہے کہ خالد بن یزید بن معاویہ ہی درحقیقت اس اولیت کے مستحق ہیں۔

بنوامیہ کے زمانے میں خالد بن یزید کے بعد خلیفہ مروان بن الحکم کے دور میں ذکر آتا ہے کہ ایک یہودی عالم ماسرجویہ نے ہروان قس کی ایک کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا' یہ شاہی خاندان میں محفوظ رہا' حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اس کو عام فائدہ کے لئے منصۂ شہود پر لایا گیا۔ اسی طرح ہشام بن عبدالملک کے کاتب سالم نے ارسطو کے بعض ان خطوط کا عربی میں ترجمہ کیا جو اسکندر کے نام لکھے گئے تھے۔

بنی امیہ کے زمانے میں ترجمہ نگاری کی یہ مثالیں اگرچہ کم ہیں لیکن ان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ غیر عربی زبانوں کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کی کوششیں سنجیدہ اور مسلسل جاری تھیں۔

132ھ/749ء میں بنی امیہ کا دور خلافت ختم ہوگیا' یہ اسلام کی دوسری صدی کا گویا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس پہلی صدی میں علمی لحاظ سے رجحان مذہبی علوم کے درس وتدریس اور نقل وروایت کا رہا۔

2.7 عباسی دور

علم کی گرم بازاری' تصنیف وتالیف اور غیر قوموں اور زبانوں کے علوم کا شوق نمایاں شکل میں بنوعباس کے دور حکومت میں نمایاں ہوا۔ عباسیوں میں منصور دوسرا خلیفہ تھا' 137ھ/752ء میں وہ بغداد کے تخت پر بیٹھا تو مورخین کو پہلی بار یہ لکھنے کا موقع ملا کہ منصور نے ترجمہ وتصنیف پر حوصلہ شاہانہ سے توجہ کی۔ یہ توجہ کس انداز کی تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس نے قیصر روم کو خط لکھ کر فلسفہ کی کتابیں منگوائیں اور چونکہ اس وقت بغداد میں ان زبانوں کے جاننے والے نہیں تھے۔ اس لئے یہ فرمائش بھی کی کہ جو کتابیں آئیں وہ وہیں سے ترجمہ ہوکر آئیں۔ چنانچہ اقلیدس اور کچھ طبیعات کی کتابیں ترجمہ ہوکر بغداد پہنچیں تو علماء ان کو پڑھ کر اور بھی مشتاق ہوئے۔ منصور کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کی بناء پر ابن صاعد اندلسی نے کہا کہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے منصور نے علوم کی طرف توجہ کی۔ یہاں علوم سے مراد عقلی اور سائنسی علوم ہی ہوسکتے ہیں

' کیونکہ مذہبی علوم تو پہلے ہی عوام وخواص کی توجہ کا مرکز ہو چکے تھے۔ شاید اسی لئے ابن صاعد نے یہ بھی کہا کہ منصور فقہ اور نجوم وفلسفہ میں کامل مہارت رکھتا تھا۔ منصور کے اس علمی شوق کو دیکھ کر دور دور سے مترجمین اور فلاسفر اس کے دربار میں آنا شروع ہوگئے۔ دربار کو کہا جانے لگا کہ اس میں ہر فن کے اصحاب کمال جمع ہیں۔ جرجیورس' فرات بن سحنا تا' عیسیٰ' بطریق' نو بخت منجم' ابو سہل۔ یہ لوگ اگر چہ عیسائی اور مجوسی تھے لیکن اپنے فن ترجمہ نگاری کی وجہ سے منصور کے معزز درباری تھے۔ نو بخت منجم اور اس کی اولاد نے منصور کے لئے ستاروں اور ان کے احکام کے بارے میں متعدد کتابیں ترجمہ کیں۔ دربار منصوری کے مترجموں میں ابن المقفع مشہور مترجم بھی شامل ہے جو فارسی سے عربی میں ترجمہ کرنے کا ماہر تھا۔ ایک اور بڑی شخصیت ابراہیم فزاری منجم کی تھی۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اسلام کی تاریخ میں اصطرلاب بنایا اور علم ہیئت پر کتابیں لکھیں۔ 156ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی دان ہندو عالم بغداد پہنچا۔ اس نے ایک عمدہ زیچ کا خلاصہ کر کے منصور کی خدمت میں پیش کیا تو منصور کے حکم سے ابراہیم فزاری یا ایک روایت کے مطابق محمد بن ابراہیم فزاری نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا اور اس سے ایک اور کتاب مرتب کی جو ریاضی دانوں میں سند ہند کے نام سے مشہور ہے۔ دراصل یہ سدھانت کتاب ہے جو سنسکرت میں ہیئت کی مشہور کتاب مانی جاتی ہے۔

منصور کے زمانے ہی میں طبی کتابوں کے ترجمہ کا آغاز ہوا' منصور کی ایک بیماری میں جندیساپور کے مشہور طبیب جورجیس بن بختیشوع نے کامیاب علاج کیا' جس سے وہ منصور کا طبیب خاص بن گیا اور اس نے منصور کے لئے کئی طبی کتابوں کے ترجمے کئے۔ ایک درباری طبیب بطریق بھی تھا' اس نے سقراط اور جالینوس کی کتابوں کے ترجمے کئے۔

منطق' فلسفہ اور فارسی میں بھی ترجموں کی بہار آئی عبداللہ بن المقفع نے ارسطو کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ان کے نام کچھ اس طرح ہیں۔ قاطیغوریاس' باری آرمیناس' انالوطیقا اور منطق کی مشہور کتاب ایساغوجی ہے۔ کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ جو مشہور عالم ہے اسی نے کیا' فارسی سے علم الاخلاق کی کتاب کا ترجمہ الادب الکبیر اور الادب الصغیر بھی اسی ابن مقفع کی یادگار ہے۔ ابن المقفع کے علاوہ کچھ اور مترجموں نے مانو' دلسیان اور مرقون کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا۔

منصور نے جو راہ اپنائی وہ ویران نہیں ہوئی۔ منصور کے بعد اس کے بیٹے مہدی اور پھر ہادی کا زمانہ بہت طویل نہیں رہا' ان دونوں کی مجموعی مدت خلافت گیارہ سال رہی' لیکن ہارون رشید کے دور تک برامکہ کے وزارتی خاندان کا عروج ہوا۔ جس نے مہدی اور ہادی کے زمانہ کی خاموشی کو اس طرح توڑا کہ پوری تاریخ اسلام میں برامکہ کا نام زندہ جاوید ہوگیا۔ لکھا تو یہ گیا کہ عباسی عہد کی ترقیوں کا سہرا ہارون رشید سے زیادہ ان برمکی وزیروں کے سر ہے اس خاندان نے جس قدر عروج واقتدار حاصل کیا وہ بڑے بڑے فرماں رواؤں کو بھی نہیں ملا' خالد' یحییٰ' فضل' جعفر یہ سب خاندان برامکہ کے وہ فرزند ہیں جن کے متعلق دوسری خوبیوں کے ساتھ یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ ان کے اہتمام سے یونانی اور فارسی کی بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔

اس زمانہ کی ترجمہ نگاری کا تمغہ چاہے منصور کو دیا جائے یا ہارون و مامون اور برامکہ کے گلے میں ڈالا جائے اس کی اصل وجہ بیت الحکمت ہے۔

معلومات کی جانچ

1. علم کے فروغ کے لحاظ سے عہد خلافت راشد اور عہد بنی امیہ پر تبصرہ کیجیے۔

2. فن ترجمہ نگاری سے بحث کیجیے۔

3. عہد بنی عباس میں حکومت کی جانب سے علوم وفنون کی سرپرستی پر ایک نوٹ لکھیے۔

2.8 بیت الحکمت

بیت الحکمت ترجمہ اور تصنیف کا ایسا بڑا محکمہ تھا جس میں بقول علامہ شبلی "ہر زبان کے بڑے بڑے ماہر تصنیف اور ترجمہ کے کام پر مامور تھے۔ یوحنا بن ماسویہ ایک عیسائی عالم جس کی مادری زبان سریانی تھی، قدیم یونانی طب کی تصنیفات کے ترجمے کے لئے انتخاب کیا گیا۔

بیت الحکمت میں ژند، یونانی، شامی، سنسکرت زبانوں کے ترجمے مسلسل تیار ہوتے۔ دو ہندو فلاسفر منکہ اور سالح بھی عباسی دربار میں موجود تھے جو مترجم بھی تھے اور مصنف بھی۔ شاناق ہندی کی کتاب السموم منکہ ہی نے فارسی میں منتقل کی تھی۔ چرک اور ششرت کی طبی کتابیں اسی دور میں ان ہی ہندو مترجموں کے ذریعہ عربی میں منتقل ہوئیں۔

بیت الحکمت کو عربی اور ایرانی تمدن کی آمیزش سے تیار ایسے دو آتشہ تمدن کا سبب قرار دیا گیا جو اس دور کے اسلامی تمدن کا معیار بن گیا۔ بیت الحکمت کو قائم کرنے والا ہارون ہے یا مامون؟ اس سوال کا جواب زیادہ ضروری نہیں، مورخین میں یقیناً بانی بیت الحکمت کے تعین میں تضاد بیانی ہے، لیکن صحیح تطبیق یہی ہے کہ اس کو قائم تو کیا ہارون الرشید نے اور اس کی تشکیل میں یحییٰ برمکی کا ذہن کارفرما رہا، لیکن اس کو عروج عطا کیا مامون نے۔

بیت الحکمت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، مختصراً اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ تین اہم شعبوں پر مشتمل تھا۔ (1) خزینۃ الکتب یعنی کتب خانہ (2) دارالترجمہ والتصنیف (3) رصدگاہ

کتب خانہ میں یونانی، سریانی، کلدانی، نبطی، فارسی، سنسکرت، عربی جیسی زبانوں کی کتابیں تھیں اور ہر شعبہ زبان کا نگراں تھا اور ہر نگران اپنے شعبہ کی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے واقف ہوتا تھا۔ اس شعبہ میں کتنی کتابیں تھیں؟ مورخین سے تعداد نہیں ملتی، لیکن یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ کتابوں کا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، لیکن یہ اتنا بھی نہیں تھا جس سے مامون کا علمی شوق راضی اور مطمئن ہو جاتا۔

ارسطو کو خواب میں دیکھنے کے بعد مامون کا شوق جب اور فراواں ہوا تو اس نے بادشاہ روم سے کتابوں کی فراہمی کے متعلق خط وکتابت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ روم نے فلسفہ وحکمت کی کتابیں پانچ اونٹوں پر لاد کر بغداد بھیج دیں۔ اسی کے ساتھ آرمینیہ، مصر، شام، قبرص اور ہندوستان وایران میں بھی نمائندے بھیجے گئے اور بڑی قیمت پر کتابیں فراہم کی گئیں۔ المامون کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ذوق اور طبیعت کے رجحان کو دیکھ کر دوسرے ملکوں کے حکمراں تحفہ میں کتابیں اور ترجمہ نگار بھیجتے تھے۔ ہندوستان کے ایک راجہ نے اپنی ریاست کے مشہور دانشور دوہان کو یہ کہتے ہوئے بھیجا کہ "جو ہدیہ آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں دنیا میں اس سے بڑھ کر مفید، نامور اور معزز تحفہ نہیں

ہو سکتا''۔

کتابوں کے جمع کرنے کے شوق کے سلسلہ میں مامون کی اور بھی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ تو بادشاہ تھا عباسیوں کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی کے متعلق لکھا گیا کہ

''جس قدر کتابیں یحییٰ کے کتب خانہ میں تھیں کسی بادشاہ کے پاس اس قدر نہ ہوں گی۔ ہر کتاب کے تین تین نسخے موجود تھے۔ نامور خوش نویسوں کے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں تھیں۔ اس وقت یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی نایاب کتاب فروخت ہوتی تو سب سے پہلے یحییٰ کو دکھلائی جاتی' کیونکہ ایک ہزار درہم دینے والا صرف یحییٰ برمکی تھا۔

کتابوں کی تلاش کا یہ حال تھا کہ جالینوس کی کتابوں میں ایک کتاب البرہان کا نام ملا' کتاب نہیں مل رہی تھی' اس لئے اس کی تلاش میں شام' مصر اور فلسطین کے ایک ایک شہر میں وہ تلاش کی گئی' اس کا صرف آدھا حصہ ہی مل سکا تھا۔ اس کتب خانہ میں کتابوں کی کثرت کا اندازہ یوں لگایا گیا ہے کہ جب بغداد کئی تباہیوں سے دوچار ہوا' زمانہ کے ہاتھوں اس کا یہ خزانہ لٹتا رہا اس کے باوجود تیرھویں صدی عیسوی تک بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ بیت الحکمت کا دارالترجمہ والتصنیف کا شعبہ اتنا اہم اور وسیع تھا کہ مختلف ملکوں کے ماہرین علم یہاں جمع ہو کر پرانی علمی زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کرتے۔

بیت الحکمت' ہارون' مامون اور ارتقائے علوم عقلیہ کی اس داستان کا سب سے قیمتی حصہ وہ ہے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مامون نے یونان کے بادشاہ کو پانچ ٹن سونا دینے اور دائمی جنگ بندی کا اس شرط پر معاہدہ کیا کہ فلسفی لیو کو اجازت دی جائے کہ وہ کچھ دنوں کے لئے آ کر مامون کو فلسفہ سکھائے۔ صحیح کہا گیا کہ فلسفہ کے لئے اتنی قیمت ادا کرنے کی مثال بہت کم مل سکتی ہے۔

2.9 مابعد اثرات

بیت الحکمت کی وجہ سے جہاں عوامی انفرادی مثالیں ملنا شروع ہوئیں وہیں یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ شاہی خاندان میں بھی عقلی و سائنسی علوم سے تعلق اور ان کے ارتقاء کی روایت طاقتور ہوتی گئی۔ متوکل علی اللہ' ہارون رشید کا پوتا تھا۔ اس کے زمانے میں حسین بن اسحاق نے کثرت سے ترجمے کئے' متوکل نے اس کے لئے بیش قیمت تنخواہ اور جاگیریں مقرر کیں' اس کے بیٹے اسحاق اور بھانجے حبیش کو ترجمہ کے محکمہ میں عہدے دیئے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ پانچ سو اشرفیاں تھی۔ معتضد باللہ کا دور حکومت آیا تو ثابت بن قرہ نے اس روایت کو عظمت عطا کی' اس کی عزت معتضد باللہ اتنی کرتا تھا کہ وزیروں اور امیروں کو ثابت پر رشک آنے لگا۔

عباسی خلافت 750ء میں قائم ہوئی' متقی باللہ 944ء تک اس کا عہد زریں کہلاتا ہے' یعنی قریب دو سو سال تک یہ حکومت عروج کے منازل طے کرتی رہی۔ اس کے بعد زوال شروع ہوا اور مستعصم باللہ زوال بغداد کے المیے کا حصہ بن گئے۔ یہاں تاریخ کو دہرانے کی ضرورت نہیں' صرف یہ جاننا چاہئے کہ عہد زریں کے دو سو سال ہی مورخین کے نزدیک ترجموں کے عمل اور بیت الحکمت کے اثر و انتظام کے ہیں' پھر یہ انتظام باقی نہیں رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی کہ اتنی مدت کی پیہم تلاش و جستجو میں وسعت کا یہ عالم تھا کہ فلسفہ' حساب' ہیئت' نجوم' طب' ادب اور اخلاق وغیرہ سترہ اٹھارہ علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمے اس شعبے سے ہوتے رہے' اس شعبہ کے جو ذیلی شعبے تھے ان کے نام دیکھ کر آج بھی ان

کی ترتیب وسلیقہ کو مثال بنایا جاسکتا ہے' یہ ذیلی شعبے اس طرح تھے:

(1) شعبہ ترجمہ (2) شعبہ اصلاح ونظر ثانی (3) شعبہ تالیف (4) شعبہ تسوید (5) شعبہ جلد سازی

شعبہ ترجمہ میں ایک وقت میں ایک روایت کے مطابق ایک سونوے مترجمین کام کرتے تھے' اس شعبہ میں چار خانوادے سب سے نمایاں رہے:

(1) آل بختیشوع (2) آل ماسرجویہ (3) آل حنین (4) آل ثابت

یونانی' سریانی سے سب سے زیادہ ترجمے ہوئے کہ فلسفہ اور مبادی سائنس کی کتابیں ان میں زیادہ تھیں۔ فارسی اور سنسکرت کی کتابیں طب' ادب اور فلسفہ سے زیادہ تعلق رکھتی تھیں۔ نبطیا ور عبرانی زبان کی کتابوں میں توراۃ کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

شعبہ اصلاح ونظر ثانی کا پہلا سربراہ ابوزکریا یحییٰ بن ماسویہ تھا اس کے بعد ابوزید حسنین بن اسحاق العبادی اس کا نگراں مقرر ہوا اس نے ترجمہ کو نہ صرف بطور فن روشناس کرایا بلکہ اس کو ایک نیا رنگ وآہنگ اور نیا اسلوب دیا' قسطا بن لوقا بعلبکی نے بھی ترجمہ میں زبردست اصلاحات کیں' ثابت بن قرہ بھی اسی شعبہ سے متعلق رہا۔ اس کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے طب کی نسبت حکمت وفلسفہ کے تراجم کی اصلاح زیادہ اور بہتر طور پر کی۔

شعبہ تالیف میں طبع زاد کتابیں لکھی گئیں۔ ابوزکریا یوحنا بن ماسویہ کی مشہور کتاب ''کتاب المشجر'' اور ابوزید حنین بن اسحاق کی کتاب ''کتاب المسائل'' وغیرہ اسی شعبہ کی دین ہیں۔

شعبہ تسوید میں خوش نویس تھے' جو محض خوش نویسی ہی نہیں مختلف زبانوں کے عالم اور ماہر تھے۔ ان میں علان شعوبی اور ازرق بہت مشہور ہوئے۔ ان کے بیٹھنے کا الگ انتظام تھا' بعض لوگ ملازم نہیں تھے لیکن ذاتی شوق کی وجہ سے وہ یہاں آکر خوش نویسی سے دل بہلاتے تھے۔

بیت الحکمت کی رصدگاہ اس کے بہت اہم شعبہ کی حیثیت سے جانی جاتی تھی۔ علوم کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنے' تجربات کرنے میں مامون کو بڑی دلچسپی تھی' اس نے اس کے ایسے تمام قریبی ملکوں سے ماہرین کو جمع کیا۔ بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں بنائی گئیں' نہایت بیش قیمت آلات رصدیہ تیار ہوئے' سورج' اس کے مرکزوں کا خروج' اس کی بلندی کی منزلیں اور دوسرے سیاروں اور ستاروں کے حالات دریافت کئے گئے۔ مامون کے عہد ہی میں ابوجعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے ایک زیچ ترتیب دی' اس کی شہرت اور قبولیت ایسی ہوئی کہ دوسری تمام زیچوں کو اس نے بھلا دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ زیچ دنیا کی تمام مستند زیچوں سے ماخوذ تھی۔ مامون کے ایک دوسرے منجم حبش حاسب نے بھی تین زیچیں تیار کی تھیں ان میں مامون کے نام پر جو زیچ تھی وہ بہت مشہور ہوئی۔

اسی طرح کرہ ارض کی پیمائش کے لئے جدید آلات رصد استعمال کئے گئے' سنجار کے مسطح میدان میں اس کا تجربہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ اس حساب سے محیط زمین چوبیس ہزار میل ہے۔ حنین بن اسحاق کا ذکر اوپر آچکا ہے وہ مترجمین کا نگران تھا اور خود اس نے طب وحکمت کی کتابوں کے ترجموں کی شاندار روایت قائم کی۔ مامون تو اس کا ایسا قدرداں تھا کہ ہر کتب کے بدلے سونا' صلہ کے طور پر دیتا۔

بیت الحکمت' مامون رشید کے زمانہ حکومت کی سب سے شاندار یادگار ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ اس نے روم کے بادشاہوں سے جو معاہدے کئے ان میں یہ شرط بھی تھی کہ طب وفلسفہ کی نادر کتابیں بغداد بھیجی جائیں۔ مامون نے خود اہل علم وفضل کی ایک ٹیم دوسرے ملکوں میں اس مقصد سے بھیجی کہ وہ وہاں کی منتخب کتابیں بغداد لائیں اور ترجمہ کریں۔ اس ٹیم میں حجاج بن مطر' ابن بطریق جیسے لوگ شامل تھے۔

بیت الحکمت میں صرف ترجمے ہی نہیں ہوئے' طبع زاد کتابیں بھی تیار کی گئیں فلکیات و ریاضی میں محمد بن موسیٰ خوارزمی پہلے شخص ہیں جنہوں نے الجبراء' مقابلہ اور حساب میں کتاب لکھی' یہ کتاب مامون کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اسی طرح ہئیت ونجوم اور فلکیات میں سند بن علیؒ عباس بن سعید جوہری' خالد بن عبدالملک مروزی' عبداللہ بن سہل بن نوبخت' احمد بن محمد بن کثیر فرغانی' محمد بن موسیٰ جلیس' ماشاء اللہ منجم وغیرہ بڑے بڑے نام سامنے آئے۔

سائنسی اور عقلی علوم کی یہ گرم بازاری اور ان کا ارتقاء' حکومت' خلفاء اور بیت الحکمت جیسے عوامل کے ذریعہ اس طرح ہوا کہ یہ عوامی دلچسپی کا مرکز بھی بن گیا۔ سرکاری ادارے اور اشخاص کے علاوہ بھی لوگوں نے ان علوم کے اتقاء میں عملی حصہ لینا شروع کیا۔ اس سلسلے میں موسیٰ بن شاکر اور ان کے خاندان کی خدمات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا' جنہوں نے بہترین اور بیش قیمت کتابوں کی تلاش میں بہت زیادہ دولت خرچ کی' یہ بھی علماء کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اپنے خرچ سے بھیجتے اور اہم کتابوں کا ترجمہ کراتے' موسیٰ بن شاکر کی اولاد کے لئے ترجمہ کرنے والوں میں حنین بن اسحاق' حبیش بن الحسن اور ثابت بن قرہ جیسے نام شامل ہیں۔ کہتے ہیں کہ مامون نے جہاں ترجموں پر تین سو ہزار دینار صرف کئے وہیں بنوشاکر پانچ سو دینار ماہانہ صرف کرتے تھے۔ اسی طرح فتح بن خاقان نے بھی ان کاموں پر بے دریغ خرچ کیا۔ محمد بن عبدالملک الزیات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تراجم اور کتب پر دو ہزار دینار ماہانہ خرچ کرتا تھا۔ اس کے لئے جن کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ان میں ایک کتاب الصوت کا ذکر آتا ہے' اس کو بھی حنین بن اسحاق نے عربی میں منتقل کیا تھا' اسی طرح احمد بن مدبر کا نام بھی ہے جس نے ترجمہ اور ترجمہ نگاروں کی سرپرستی کی' ابن نوبخت مشہور فلسفی متکلم نے بھی ابن مدبر کے لئے کام کیا۔

ترجمہ کی تحریک اور عقلی و سائنسی علوم کے ارتقاء اور مسلمانوں کے اس میں حصہ لینے کی یہ داستان بڑی دلچسپ ہے اور عباسی حکومت کی تاریخ تو گویا اسی کی وجہ سے نہایت خوبصورت اور دلکش بن گئی ہے۔ اوپر مامون کا ذکر ہوا کہ وہ بین الاقوامی معاہدوں میں علمی و سائنسی کتابوں کے فروغ کی شرط رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے نمائندے آرمینیا' شام' مصر کتابوں کے جمع کرنے اور پھر ان کی تدوین وترجمہ کرنے میں لگ جاتے تھے۔ ابن لوقا بعلبکی روم گیا اور فلسفہ کی بہت سی کتابیں ساتھ لایا' مامون نے سنا تو اس کو بلا کر بیت الحکمت میں ترجمہ کے کام پر لگا دیا۔ مامون کا ایک خاص مترجم یعقوب کندی تھا' وہ خاص طور پر ارسطو کی کتابوں کے ترجمے پر مامور تھا' یہ فارسی' ہندی' یونانی زبان جانتا تھا۔ مامون نے یونانی زبان اسی سے سیکھی تھی۔ شاکر منجم اور اس کے بیٹوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ہندسہ' نجوم اور موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی اپنی کوششوں سے اور کتابیں حاصل کیں اور ان کا ترجمہ کرایا۔

روم و یونان کا کوئی علمی خزانہ ایسا باقی نہیں رہا جو مسلمانوں کی نظر سے چھپا رہ گیا ہو' یہ بھی بتایا گیا کہ اس مدت میں مسلمان فلاسفروں کا ایک بڑا گروہ خود ہی تیار ہو گیا تھا۔ اسحاق' ابو معشر' محمد بن موسیٰ احمد سرخسی' ابونصر فارابی وغیرہ ایسے فلاسفر اور سائنس داں تھے جن کی تازہ ایجادات اور تصنیفات نے فلسفہ و سائنس کو ارسطو وافلاطون کی اطاعت سے آزاد کر دیا تھا۔ پھر بھی خلفاء کا دربار ایک مدت تک ہر ملت و مذہب کے عالموں

سے بھرا رہا جو اپنے ذاتی شوق یا پھر بادشاہوں کی فرمائش پر کتابیں لکھتے یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کرتے۔ دسویں صدی عیسوی تک یہی عالم رہا۔ راضی باللہ کے عہد میں متی بن یونس نے ارسطو کی بعض کتابوں کا ترجمہ کر کے شہرت پائی، یحییٰ بن عدی اور عیسیٰ بن زرع نے نئے ترجمے کرنے کے علاوہ پہلے کیے گئے ترجموں کی اصلاح کی۔ محمد بن یحییٰ جوز جانی اور ابوالفرج وغیرہ نے سریانی زبان سے نئے ترجمے کیے اور شرحیں لکھیں، دسویں صدی عیسوی کے اواخر اور گیارہویں صدی عیسوی کے نصف تک عالم یہ رہا کہ بوعلی سینا جیسے علوم طب کے بابا آدم، اپنی مشہور عالم کتابوں القانون اور الشفاء کا تحفہ سائنس کی دنیا کو دے چکے تھے، وہیں البیرونی بھی ان کے معاصر بلکہ فلسفہ و ہیئت میں ان کے مقابل تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کے علوم کے شوق میں ہندوستان آ کر فلسفہ کی مزید تعلیم حاصل کی، سنسکرت سے ایسے واقف ہوئے کہ ہندوؤں کو یونانی فلسفہ سنسکرت میں سکھایا۔ محمد بن اسماعیل تنوخی نے بھی ہیئت و نجوم سیکھنے کے لئے ہندوستان کا سفر کیا۔

عہد اسلامی میں سائنس اور عقلی علوم کے ارتقاء میں عام طور پر خلافت اور اس کے پایہ تخت یا اس کی عملداری میں آنے والے علاقوں کا ذکر ہوتا ہے، لیکن ان کے اثرات صرف ایک جگہ کی ملکیت نہیں رہ سکے، اسی کا اثر ہے کہ ہندوستان میں بھی ایسی علمی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے، مثلاً سلطان فیروز شاہ تغلق نے ایک پہاڑ کے بت خانہ میں بارہ سو قدیم زمانہ کی کتابیں دیکھیں تو ان کے ترجمے کا حکم دیا۔

دیکھا جائے تو بیت الحکمت جیسے ادارے اسلام سے پہلے اور کافی پہلے کہیں کہیں نظر آتے ہیں جیسے ایتھنز میں افلاطون کی اکیڈمی، ارسطو وغیرہ کے میوزیم، اسکندریہ میں بطلیموس کے دارالعلوم اور مصر اور قبرص کے بھی کئی علمی مراکز، لیکن بیت الحکمت کے قیام نے علمی و سائنسی اہمیت کے ان مصادر کو جس طرح سارے عالم میں روشناس کرایا اور انسانی دنیا پر جو تہذیبی و علمی اثرات مرتب کیے اس کا دائرہ اثر ماضی کے اداروں کے مقابلہ میں کہیں بڑھ کر ہوا۔

ہارون رشید سے شروع ہونے والا بیت الحکمت کا سفر عہد بہ عہد جاری رہا اور ترقی کی راہ پر گامزن بھی رہا۔ 892ء میں اس میں ایک نئی جان پھونکنے کی کوشش کی گئی، لیکن اس کے بعد کتب خانہ کا وجود تو ملتا ہے لیکن ترجمہ و تصنیف اور تجربات رصدیہ کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے بعد کتب خانہ بیت الحکمت کی بہت سی کتابیں خلفاء اور امراء کے ذاتی کتب خانوں میں منتقل ہو گئیں، مشہور ہے کہ المستنصر (1242ء) کے ذاتی کتب خانہ کی بیشتر کتابیں خزینۃ الکتب ہی کی تھیں۔ اس کے بعد 1258ء، 1392ء اور 1400ء میں بغداد پے در پے حملوں کا سامنا نہیں کر سکا۔ زوال بغداد دراصل عہد اسلامی کی عقلی و سائنسی حکمرانی کا زوال بھی ثابت ہوا۔ لیکن تاریخ کے سامنے یہ حقیقت بہر حال رہی کہ بیت الحکمت نے ذہن سازی اور علمی شعور اور سائنسی انداز فکر کا جو تحفہ پوری انسانیت کو دیا اس کے اثرات ہمیشہ قائم رہے۔ اور آج بھی ان اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ان اثرات کا نتیجہ تھا کہ بعد کے ادوار میں ایسے کئی ادارے اور ملکوں میں قائم ہوئے، جیسے قیروان کا بیت الحکمت جس کا بانی زیادۃ اللہ ثالث تھا، فاطمی حکمرانوں نے قاہرہ میں دارالحکمت قائم کیا، جس میں چھ لاکھ کتابیں تھیں اور اپنے عہد میں یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا کتب خانہ تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی 1017ء میں طرابلس میں ابوطالب حسن بن العمار نے دارالعلم قائم کیا۔

انفرادی کوششوں کے نتیجے میں بھی اس قسم کے اداروں کا ذکر جا بجا ملتا ہے، جیسے موصل کا دارالعلم، عراق میں ابوالحسن علی منجم کا خزانۃ الحکمت، نیشاپور میں قاضی ابن حبان کا دارالعلم، بغداد کے بیمارستان عضدی سے وابستہ ابن مارستانیہ کا دارالعلم وغیرہ یہ داستان سناتے ہیں کہ عہد اسلامی میں ترجمہ اور عقلی و سائنسی علوم کی جو خدمات انجام دی گئیں ان کی مثال ان سے پہلے اور ان کے ہم عصر زمانہ میں کہیں نہیں ملتی۔ چودھویں

صدی عیسوی تک یہ صرف عباسی اور ان کے ہم سایہ کچھ اسلامی ریاستوں کی معلومات ہیں۔ ان میں اندلس، ہندوستان، چین جیسے ملکوں کے حالات کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔ ورنہ موجودہ سائنسی عہد کو سمجھنے اور اس کے اصل سرچشمہ کے فیضان کے اعتراف میں ابھی بہت کچھ جاننا اور کہنا باقی ہے۔

معلومات کی جانچ

1. بیت الحکمت پر ایک نوٹ لکھیے۔

2. ترجمے کی تحریک کے اسلامی تاریخ پر کیا اثرات مرتب ہوئے، لکھیے۔

3. ترجمے کی تحریک میں منصور کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2.10 خلاصہ

خلاصہ کے طور پر مطالعہ کا نتیجہ یہی کہتا ہے کہ عہد اسلامی میں ترجمہ کی تحریک، دراصل نئے عہد انسانی میں علوم وفنون کی نئی زندگی کی تحریک کہلانے کا حق رکھتی ہے۔

عہد اسلامی کا آغاز رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے ہوتا ہے، خلفائے راشدین کا عہد خلافت اور پھر بنو امیہ اور بنو عباس کا دور حکمرانی، اسلامی اقتدار کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ ان کو تاریخ اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جزوی طور پر خلافت عثمانیہ اور اندلس میں اموی حکمرانی اور ہندوستان میں سلاطین اور مغل حکومتیں بھی ہیں، لیکن جب تاریخ اسلام کا عمومی حیثیت سے جائزہ لیا جاتا ہے تو خلافت کی بنیاد پر قائم حکومتوں کو مرکزی اہمیت دی جاتی ہے۔

سیاست، عسکری قوت، معیشت، معاشرت اور علوم وفنون میں اسلامی رنگ وآہنگ کو تلاش کرنا ہو تو مطالعہ کا مرکز فطری طور پر دور خلافت پر نظر جاتی ہے۔ علوم وفنون میں ترجمہ نگاری کا فن اور اس کی اہمیت یقینی طور پر عہد اسلامی کا عطیہ ہے۔

اسلام سے پہلے ترجمہ نگاری کو مستقل ایک فن کی حیثیت میں دیکھنا بہت مشکل ہے۔ اسلام سے پہلے شاید ہی کہیں اس پہلو پر بحث کی گئی ہو کہ ترجمہ کے شرائط کیا ہیں؟

آج یہ کہنا کوئی مشکل نہیں کہ ترجمہ کرنے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ مترجم دونوں زبانوں پر پوری طرح قدرت رکھتا ہو، دونوں زبانوں کی اصطلاحات، مترادفات، لغات، جملوں کی نشست وبرخاست اور ان کے معانی ومطالب سے پوری طرح واقف ہو۔ اسے الفاظ کی فیاضی آتی ہو اور دونوں زبانوں کے لب ولہجہ سے وہ اس طرح آشنا ہو کہ ترجمہ کرتے وقت اور اس ترجمہ کو پڑھتے وقت لکھنے اور پڑھنے والے کو نقل سے زیادہ اصل کا لطف میسر ہو، جو بات ایک زبان میں بہ آسانی سمجھ میں آنے والی ہو وہی بات دوسری زبان میں بھی اسی آسانی سے سمجھی جاسکے۔

ترجمہ میں ضبط واحتیاط اور داخلی وخارجی مطالعہ ومشاہدہ کا بھی پورا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ترجمہ نگاری کے ان اوصاف کا عالمی طور پر اور اعلیٰ پیمانہ پر سب سے پہلا مشاہدہ عہد اسلامی میں کیا گیا' حضرت امیر معاویہؓ کے پوتے خالد بن یزید سے شروع ہونے والے اس علمی سلسلہ کو مضبوطی اور تابانی بنوعباس کے عہد میں ملی' منصور' ہارون اور مامون جیسے عظیم الشان فرماں رواؤں کی ذاتی دلچسپی اور توجہ اور سرپرستی نے ترجمہ نگاری کو ان بلندیوں پر پہنچا دیا جہاں سے عقلی وسائنسی علوم کی نئی دنیا کا سراغ ملنے لگا۔ عہد بنی عباس میں بیت الحکمت' دنیا کی سب سے بڑی علمی اکیڈمی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور اس نے فلسفہ وحکمت' ریاضی اور تمام سائنسی علوم میں قدیم علوم کا احیاء کر کے مستقبل کی نئی ایجادات کی منتظر تحقیقی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ علوم جو دنیا کے مختلف گوشوں میں محدود اور دوسروں کی نظر سے دور تھے' وہ اسلامی عہد کی کوششوں سے بین الاقوامی ہو گئے۔ ترجموں کے ذریعہ چین وہند اور یونان وروما کے علوم کی کثرت کو وحدت میں بدلنے کا عمل' اسی بیت الحکمت کی محنت کا نتیجہ ہے۔

بیت الحکمت کے مترجموں میں ابوزکریا' یوحنا بن ماسویہ' حنین بن اسحاق' قسطا بن لوقا بعلبکی' جیش بن الاعم دمشقی' ابویعقوب' ابوالحسن ثابت بن قرہ الحرانی' سرجیوس بن الیاس رومی' اصطیفن بن باسل' موسیٰ بن خالد' عیسیٰ بن یحییٰ بن ابراہیم' ابوایوب الابرش وغیرہ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کی کتابوں اور ترجموں کی فہرست میں سینکڑوں کتابیں اور ترجمے ہیں جن کا ذکر کتاب الفہرست' ابن ندیم اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون' ابن ابی اصیبعہ کی عیون الانباء' مسعودی کی مروج الذہب' سیوطی کی تاریخ الخلفاء اور صاعد اندلسی کی طبقات الامم جیسی کتابوں میں تفصیل سے ہے اور ان کے موضوعات ومشمولات ہی تھے جن کی وجہ سے بجا طور پر کہا گیا کہ بیت الحکمت نے صرف ترجمہ وتالیف ہی کا کام نہیں کیا' اس نے نئی دنیا کو یعنی اسلام کے دور کی دنیا کو نئی ذہن سازی کی نعمت دے کر علمی وفکری شعور کو پروان چڑھایا۔

علمی وفکری شعور کی بالیدگی کے ساتھ' دنیا میں کتب خانوں کی اہمیت بھی سامنے آئی۔ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ایسا دور نہیں گزرا جس میں اتنے زیادہ اور اتنے آباد کتب خانے دیکھے گئے ہوں۔

ترجمے اور پھر ان کے ذریعہ طبع زاد تالیفات' کتب خانے کیا کم تھے' لیکن بیت الحکمت کی علمی تحریک نے عملی تجربہ گاہوں' رصد خانوں' زیچوں کا ایک ایسا سلسلہ قائم کیا جس نے سائنسی وعقلی علوم کو نیا اعتبار اور مستحکم اعتماد بخشا۔ صرف طب ہی میں دیکھا جائے تو مرکبات' مجربات میں بدل گئے اور جراحت میں تو انقلاب آگیا۔

عباسی عہد کے خاتمہ کو اسلامی عہد کا ایک دور تصور کیا جائے تو 1400ء تک عقلی وسائنسی علوم کی آبیاری اور ان کی پختگی میں خلفائے عباسیہ اور ان کے بیت الحکمت کی خدمات بلکہ احسانات کا ذکر ناگزیر ہوگا اور یہ اعتراف تو بہر حال کیا جائے گا کہ عقلی وسائنسی علوم کا ارتقاء جتنا عہد اسلامی میں ہوا' ہم عصر ملکوں اور تہذیبوں میں کوئی اس کے حریف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ ارتقاء کی بات ہے ترقی اور عروج کے جس مقام پر آج سائنس فائز ہے اس میں مسلمانوں کا کیا اور کتنا حصہ ہے؟ اس کی بحث جدا ہے۔

2.11 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1- علوم وفنون کی اشاعت میں بیت الحکمت کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

-2 اسلامی تاریخ میں ترجمے کی تحریک کس طرح شروع ہوئی، حوالوں اور مثالوں کے ساتھ لکھیے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. ترجمے کی تحریک میں مامون کے کردار کا جائزہ لیجیے۔
2. عہد عباسی کے مترجمین کون تھے اور انہوں نے کن موضوعات پر کون سی کتابوں کا ترجمہ کیا؟ لکھیے۔
3. عہد اسلامی میں علوم وفنون کی سرگرمیوں اور خدمات کے مابعد زمانوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

2.12 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1.	مقالات شبلی جلد سوم	علامہ شبلی نعمانی
2.	المامون	علامہ شبلی نعمانی
3.	تاریخ اسلام حصہ دوم	شاہ معین الدین احمد ندوی
4.	تاریخ اسلام حصہ سوم	شاہ معین الدین احمد ندوی
5.	بیت الحکمت کی طبی خدمات	حکیم وسیم احمد اعظمی

اکائی 3 : یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں مسلمانوں کا حصہ

اکائی کے اجزاء

3.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کی غرض وغایت یہ ہے کہ یورپ میں گزشتہ تین صدیوں میں جو عظیم، علمی، سائنسی، فکری، معاشی، سیاسی، عسکری، اور صنعتی ترقیاں ہوئیں ان کے اسباب اور پس منظر سے واقف ہو جائیں، یورپ کے اس انقلاب کو نشاۃ ثانیہ کے لفظ سے عموماً تعبیر کیا جاتا ہے۔

3.2 تمہید

یورپ کی نشاۃ جدیدہ کیا ہے؟ کیا یہ صرف اسی تعبیر میں منحصر ہے یا اس کو دوسرے الفاظ میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے؟ نشاۃ جدیدہ میں کن تحریکوں اور اشخاص کے نام آتے ہیں؟ یورپ پر اس کا کیا اثر ہوا اور سب سے بڑھ کر اس یوروپی نشاۃ جدیدہ میں مسلمانوں کے علوم وفنون کا کیا اثر و کردار رہا؟ ایسے سوالوں کے جواب اس اکائی میں پیش کرنے کی ایک کوشش کی جائے گی۔

3.3 یورپ کی نشاۃ جدیدہ

آج دنیا میں کسی بھی تعلیم یافتہ شخص کے لیے لفظ نشاۃ جدیدہ' اجنبی اور غیر نامانوس نہیں' یورپ نے تاریخ انسانی میں ایک کروٹ لی اور یہی کروٹ اس کی اس بیداری کا سبب بن گئی' جس کے بعد عملاً یورپ کی سیاسی' فکری' ذہنی اور علمی بالادستی ساری دنیا پر قائم ہوگئی اور آج بھی یہ بدستور جاری ہے۔اس عہد ساز کروٹ کا نام نشاۃ جدیدہ رکھا گیا ۔ Renaissance یا Renascence رینائسنس یا رینا سینس کی یہ تعبیر اصطلاح ہے' ایسی اصطلاح جو اچھی طرح معروف لیکن غیر متعین عرصہ زبان اور یورپ کی ترقی کے ایک خاص دور کی ترجمان ہے' یعنی ایک جانب تو یہ تاریخ کے اس دور سے نکلنے کی طرف اشارہ کرتی جس کو قرون وسطیٰ کے عہد سے یاد کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی قرون وسطیٰ کے عہد سے دور جدید میں منتقلی کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔دوسری طرف مغربی قوتوں میں جو علمی و اخلاقی اقدار و تصورات تغیر پذیر ہوئے اور جن سے علم و اخلاق کی تبدیلی نے ایک عملی شکل اختیار کی' یہ مفہوم بھی اس اصطلاح میں شامل ہے۔اس کے مفہوم کی اور گہرائی میں جانے کے بعد اس کو تولید نو (Rebirth) بھی کہا جاسکتا ہے۔اس کی تشریح اور وضاحت میں کیا گیا کہ یوروپین قوموں کو غیر معمولی توانائی کی تازہ سطح سے متعارف ہونے کا ایک عہد مل گیا۔جہاں علمی اور سائنسی امکانات کے فروغ کی نئی راہیں ہر طرف کے لیے کھلی ہوئی تھیں۔یہ بھی کہا گیا کہ اصلاً یہ علوم قدیمہ کے احیائے نو کی کروٹ تھی' جس کا مقصد دور جدید کو قدیم ادب و فنون لطیفہ سے روشناس کرنا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگاروں کے خیال میں ان دونوں نظریات کو باہم تطبیق دینے میں دشواری آتی ہے' یعنی یہ تحریک اصلاح ہے Reformation یا پھر محض تحریک احیائے علوم۔آخر میں فیصلہ یہی کیا جاسکتا ہے کہ رینا سینس میں اصلاح اور احیائے علوم دونوں شامل ہیں۔

اس کی تشریح میں اطالوی انسانیات کا مفہوم بھی آتا ہے' احیاء علوم میں دانتے' پیٹر اک' بوکا شیو اور ولانی کے باہمی رابطوں کا ذکر کیا جاتا ہے' انسانیات کے علوم و معارف اور ادب سے رشتوں کو بھی دیکھا جاتا ہے' فنون لطیفہ کے ساتھ سائنس' فلسفہ' تعلیم' تنقید اور سماجی اخلاقیات کا ذکر بھی کیا جاتا ہے' اس نشاۃ جدیدہ میں اطالوی' جرمن اور ہسپانوی اور کیتھولک عناصر کی کارفرمائی بھی مطالعہ کا اہم مرکز بنتی ہے۔بحری جستجو اور نئی آبادیوں کی تلاش اور کیتھولک ردعمل کے ساتھ اس نشاۃ جدیدہ میں فرانس اپنی تعمیر' مصوری' مجسمہ سازی' ادب' تحقیق اور اصلاحات کے ساتھ اپنا وجود الگ اور نمایاں طور پر ظاہر کرتا نظر آتا ہے۔وہیں شمالی یورپ کے عہد وسطیٰ کی فلینڈری اور ڈچ مصوری اور ان کے روایتی علوم اور انگلش کلاسیکی روایات' ناٹک اور ادب اور کیتھولک کے خلاف ردعمل کی تحریکات اور ان کے مطالعہ سے نشاۃ ثانیہ کی اصل تصویر اور تعبیر سامنے آتی ہے۔

3.4 نشاۃ ثانیہ کا سررشتہ

سولہویں صدی کی اولین دو دہائیوں کے واقعات سے اس نشاۃ ثانیہ کا اصل سررشتہ ملتا ہے' کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب اٹلی میں احیائے انسانیت کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔لوتھر نے 1517ء میں اپنے مباحث شائع کیے اور یہ قسطنطنیہ (Constantinople) کے تیئس سال بعد کی بات ہے۔سقوط روم سے دس سال قبل جب فرانس اسپین اور انگلینڈ نے اطالوی کلچر کی کارفرمائی کو معاندانہ نظر سے دیکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دو ایسے فریق بن گئے جو یورپ میں اقتدار اعلیٰ کے حصول کے لیے معرکہ آرا ہو گئے' یعنی روشن خیالی اور قدامت پرستی کے حاملین۔یہ دو

طبقے ہوگئے۔ ایک طبقہ ترقی کے نام پر اور دوسرا قائم شدہ اداروں کے نام پر عام یورپ کی حمایت ومخالفت کی لہروں پر چلتا رہا۔ یہ ساری کہانی 1400ء سے 1600ء تک کی ہے۔ اسی دور کو نشاۃ ثانیہ کے نام سے بالعموم یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں کتاب ''یورپ سولہویں صدی میں'' کے مصنف اے ایچ جانسن کا یہ قول یاد رکھنے کے لائق ہے' جنہوں نے اس دور کے تغیرات کی وجہ سے اس کو 'عہد اصلاح' کا نام دینا زیادہ پسند کیا' انہوں نے لکھا کہ:

> ''عہد اصلاح دو قوتوں کا نتیجہ تھا جو فی الاصل ایک دوسرے سے جدا تھیں اور جو کبھی آپس میں اتفاق نہیں پیدا کر سکیں' یعنی نشاۃ ثانیہ اور اعتقاد و عمل میں اصلاح کی خواہش سب سے پہلے اٹلی میں عالم وجود میں آئی۔''

اس اجمال کی کچھ تفصیل یوں ہے کہ:

اطالوی اگر چہ مادی راحت اور خوش حالی میں دوسری قوموں سے زیادہ بہتر حالت میں تھے لیکن سیاسی وحدت اور استحکام سے مایوس ہو کر انہوں نے قدیم روم کی روایات اور زبان سے تعلق کی بنا پر عہد ماضی کا مطالعہ کرنا شروع کیا' ظاہر ہے اپنی روایات کی وجہ سے وہ اس کام کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ یہ کام یعنی نشاۃ جدیدہ کی تحریک پندرہویں صدی کے ابتدائی دہوں میں شروع ہوئی اور صدی کے خاتمہ تک تیز رفتاری سے بہت آگے نکل گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. سولہویں صدی میں کن واقعات سے نشاۃ جدیدہ کا سر رشتہ ملتا ہے؟
2. اس کو عہد اصلاح کس اعتبار سے کہا گیا؟
3. جانسن کی تشریح اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

3.5 نشاۃ جدیدہ کی نوعیتیں

نشاۃ جدیدہ کی نوعیتیں مختلف تھیں' فنون میں وہ آثار قدیمہ کی تحقیق کی طرف واپس آئی' ادب میں نظم و نثر کا ایک نیا شوق پیدا کیا جو قدیم زبانوں کے نمونے پر قائم ہوا تھا' علم وفضل میں قدیم علمی مخطوطات کی دریافت اور جدید تنقید اس کے ہم راہ رہی' فلسفہ میں وہ افلاطون کے علوم کی تجدید کا باعث بنی' علم طبیعی میں زمین کی نوعیت اور نظام کائنات سے تعلق کی تجدید کا سبب بھی بنی' لیکن ان مختلف قوتوں کے بنیادی اور محرک اصول باہم ایک ہی تھے۔ قرون وسطی کی سوچ نے انفرادی قربانی کی جدوجہد کی تھی' اس کی تعلیم تھی کہ انسانی خواہش کو فنا کیا جانا چاہیے' خود مختاری اور انفرادی وجود کے لیے جو باغیانہ جذبات پیدا ہوں' ان کو روکا جائے' اس نے حکم دے رکھا تھا کہ بے چوں و چرا کلیسا کے اقتدار کو قبول کیا جائے' لیکن نشاۃ جدیدہ کے نام پر نئی روح نے ان تمام اصولوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا' وہ انسانی عظمت اور موجودہ زندگی کی تبلیغ اور نفس کشی کی نیکی وفضیلت پر اعتراض کرنے لگی اور خیال و عمل میں اس کا مقصود اصلی دنیا ہی نظر آنے لگی۔ اس نے اعلان کیا کہ ہر شخص کو سوچنے' محسوس کرنے اور اپنی عقل کے مطابق اپنا ایک مذہب گھڑ لینے کا حق ہے' اس نے تحقیق' تنقید اور فطرت کے اصول کے سبق بار بار ذہن نشین بلکہ دل نشین

کرائے۔اس طرح تخیل کے سامنے ایک نئی بہشت کا دروازہ کھل گیا اور لوگ آزادی کے دل خوش کرنے والے احساس کے ساتھ اس کی طرف بے تحاشا لپکنے لگے۔اس تحریک میں بہت سی باتیں واقعی قیمتی اور ترقی کے لیے ضروری تھیں۔زیادہ محتاط تنقید اور ادب کے احترام میں اضافہ ایسی چیز ہے جو فرد کی انفرادیت کے فروغ کا سبب بن جایا کرتی ہے' لیکن اس کا یعنی تحریک نشاۃ جدیدہ کا ایک تاریک پہلو بھی تھا اور وہ تھا ہنگامہ وفساد اور زیادتی اور بے لگامی۔صورت اور رنگ کی محسوس مسرتوں نے شہوات نفسانی میں لوگوں کو مبتلا کرنا شروع کیا' دنیاوی چیزوں کے ساتھ حد سے زیادہ دل بستگی نے ایک دنیا دارانہ غیر مسیحی روح پیدا کر دی اور تنقید نے تشکیک اور بے دینی کی وہ فضا بنا دی جو نشاۃ جدیدہ کے لیے مناسب نہیں تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہویں صدی میں ایک عجیب اضطراب اس نشاۃ جدیدہ کے زیر اثر دکھائی دیتا ہے۔اے۔ایچ جانسن کے مطابق۔

''نشاۃ جدیدہ کی تحریک کو آلپس کو عبور کر کے جیسے ہی سنجیدہ دماغ جرمنوں کے ہاتھوں میں پہنچی' وہ بہت زیادہ سنجیدہ اور مذہبی ہو گئی یعنی فلسفیانہ کم اور اعتقادانہ زیادہ' وہ کلیسا یا یہ کہیے کہ انجیل پر تنقید کرنے لگے لیکن عیسائیت کو تباہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی اصل پاکیزگی کو قائم کرنے کی غرض سے پندرہویں صدی کے اواخر میں جرمنی میں جو متعدد باکمال علماء پیدا ہوئے ان میں اس عہد کے سب سے زیادہ خاص دو نمائندے جان ریوچلن (1455ء/1522ء) اور ڈیزیڈیلیس اسمس (1467ء/ 1536ھ) تھے۔نشاۃ جدیدہ کی تحریک میں ان دونوں کا مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے' جنھوں نے اٹلی سے دامن کشی میں بڑا کردار ادا کیا' لیکن جس شخص کا کردار سب سے زیادہ قابل توجہ اور قابل بحث رہا وہ مارٹن لوتھر (1483ء/1546ھ) تھا' جس کے متعلق کہا گیا کہ پوپ' کلیسا یا روم سے یورپ کی قطعی علاحدگی' علماء فضلا سے زیادہ تھورنجی کسان کے بیٹے کی وجہ سے عمل میں آئی۔جانسن نے اس کسان کے بیٹے یعنی لوتھر کو 'ناملائم دماغ' والا کہا لیکن یہ کہنے سے خود کو روک نہ سکا کہ یہ یونانی زبان کا بے غرض فاضل اور عبرانی زبان سے ناآشنا شخص تھا' جس نے روحانی امن کی تلاش میں سخت ترین ریاضتیں کی لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔اس کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا کہ ''اگر کسی راہب نے رہبانیت کی بدولت آسمان تک رسائی حاصل کی ہوتی تو وہ میں ہی ہوتا۔''

نشاۃ جدیدہ کی تاریخ اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ مذہب کی اصلاح اور اس کے ردعمل کے طور پر حکمرانوں' مذہبی پیشواؤں اور علماء وفضلاء کے درمیان ایک معرکہ بپا رہا' یہ فوجی اور جنگی بھی تھا اور ذہنی وفکری بھی تھا۔اصلاح مذہب کا نعرہ ایسا تھا جس نے پورے یورپ کو متاثر کیا اور پندرہویں صدی میں یہ تمام سیاسی تحریکوں کو بناتا بگاڑتا رہا۔

یہاں یہ خیال اور بھی دلچسپی کے لائق ہے کہ اصلاح مذہب کے رد اور مخالفت کا سب سے بڑا گہوارہ اسپین تھا۔جہاں تیرہویں صدی میں ٹامس اقوناس نے تعلیم کو باضابطہ اور پرجوش زندگی سے ملانے کی بات کہی تھی اور یہی وہ زمانہ ہے جب اسپین سے مسلمانوں اور یورپ کے مورخوں کی زبان میں ''موروں'' (مسلمانوں) پر زندگی کا دامن تنگ ہونے لگا تھا۔جانسن ہی نے لکھا کہ 1566ء تک یہ قانون جاری رہا کہ غرناطہ سے دس فرسنگ یا میل کے اندر جو مسلمان قدم رکھنے کی جرات کرے اس کو سزائے موت دیدی جائے۔یہ بھی اعلان تھا کہ جو شخص عربی کتاب اپنے قبضہ میں رکھے گا وہ چابک کی مار اور سمندر پر چار سال تک خدمت کرنے کی سزا کا مستحق ہوگا۔یہ واقعات کیا محض سیاسی اور جنگی دشمنی کا نتیجہ تھے؟ یا پھر ان مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ ان کے علوم وحکمت اور مذہب نے یورپ کی سیاہ راتوں کو روز روشن میں بدلنے کی تحریک پیدا کی' وہی تحریک جس کو نشاۃ جدیدہ کے نام سے ظاہر کیا گیا لیکن اس روح کو پوشیدہ ہی رکھا گیا جس نے اس نشاۃ کو زندگی دی۔

3.6 نشاۃ جدیدہ اور مسلمان

جانسن اور ان کے جیسے یورپ کی تاریخ لکھنے والوں نے مسلمانوں کا ذکر کرنے سے اجتناب کیا ہے لیکن پھر بھی کہیں اثنائے بحث یہ لکھ ہی گئے کہ:

''اندلس اب تک ایک ویرانہ بن گیا' تمام ظالمانہ قوانین کے باوجود یہ مسلمان فن زراعت اور صنعت کی بدولت 1609ء تک وطن کی دولت بڑھاتے رہے جب کہ اسپینیوں کا مذہبی جنون اور قومی منافرت آخر کار اسپین سے ان بدقسمت لوگوں کے اخراج ہی کا باعث ہوئی' اسپینی موروں کے ساتھ' اہل اسپین کا سلوک تاریخ کی انتہا درجہ کی دردناک داستانوں میں سے ایک ہے۔''

یورپ کی نشاۃ جدیدہ میں مسلمانوں کا حصہ ایک بدیہی حقیقت ہے اور یہ حقیقت اسپینی مسلمانوں کے اس وجود سے وابستہ ہے جو پندرہویں صدی کی نشاۃ جدیدہ کی بنیادوں کا پتہ دیتی ہے۔ اسٹینلی لین پول کی کتاب 'مورس ان اسپین' کو سب جانتے ہیں' اس کا ترجمہ اردو میں 'مسلمانان اندلس' کے نام سے ہوا' لین پول بھی ان مورخوں میں ہے جن کو فراخ دلی کی نعمت کم ملی تھی اس کے باوجود ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

''قرطبہ دراصل قابل فخر دارالسلطنت تھا' یورپ کا کوئی شہر عمارتوں کی خوبصورتی' خوش اسلوبی' بود و باش کے تکلفات' صفائی اور باشندوں کی تعلیم اور سلیقہ شعاری میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا...... یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارے سیکسن آباءواجداد لکڑی کے جھونپڑوں میں رہتے اور میلے گھاس پھونس پر اٹھتے بیٹھتے تھے' جب کہ ہماری زبان انگھڑ تھی اور اس قسم کے ہنر جیسے کہ لکھنا' پڑھنا' صرف چند راہبوں تک محدود تھا' تب ہم کو مسلمانوں کی عجیب و غریب تمدنی حالت کا کچھ کچھ پتہ لگتا ہے اور جب اتنا اور بھی یاد کرلیا جاتا ہے کہ اس وقت سارا یورپ وحشیانہ جہالت اور درندگی والی حالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور جہاں ٹوٹی پھوٹی رومی سلطنت قدیم تہذیب و تمدن کی علامتیں باقی رکھ سکی تھی یعنی صرف قسطنطنیہ میں اور اطالیہ کے بعض حصوں میں کچھ تھوڑے سے آثار شائستگی کے پائے جاتے تھے۔ تب اس حیرت انگیز تضاد کی زیادہ قدر معلوم ہوتی ہے جو اندلس کے دارالسلطنت میں دوسری جگہوں کے مقابلہ میں پایا جاتا تھا۔

لین پول نے دوسروں کی زبان اسپین یا اندلس کی کہانی سنائی ہے' عمارتوں' بازاروں' جھرنوں' باغوں' پھولوں' پھلوں' اور سیسہ' سونا' چاندی' پیتل کے نلوں۔ سترہ سترہ محرابوں کے پلوں' حماموں' مسجدوں کا ذکر کسی دلچسپ ترین جادوئی داستان کا مزہ دے جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ درمیان میں سہی' وہ باتیں بھی قلم کی زبان پر آجاتی ہیں جن کا مطالعہ ہمارا موضوع ہے۔ ایک جگہ لین پول دوسروں کی زبان سے یہ بات دہراتا ہے کہ:

'' قرطبہ میں ہی دنیا کے ہر حصہ سے نظم میں صلاحیت پیدا کرنے' علوم حاصل کرنے یا الٰہیات و فقہ سیکھنے کے شایق طلبہ آیا کرتے تھے' یہاں تک کہ وہ کل علوم و فنون کے مشاہیر کے آپس میں ملنے کا مقام' علماء

کا مسکن اور طلبہ کا ماوی و ملجا بن گیا...... اس کے ارباب کتب (ادباء) اور اصحاب کتائب (اہل لشکر) نام و نمود حاصل کرنے میں مسابقت کرتے تھے اس کے میدان ہمیشہ نام آوروں کے لیے ورزش گاہ اور پڑھنے والوں کے لیے جولان گاہ رہے۔''

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ

''جس زمانہ میں میلا کچیلا رہنا عیسائی تقدس کا تمغہ تھا' اس زمانہ میں مسلمان صفائی ستھرائی کے بارے میں نہایت خیال رکھنے والے تھے۔''

یہ بھی لکھا کہ

''جیسے جسم خوش آئند تھے ویسے ہی اذہان بھی۔''

اور پھر یہ جملہ جو ہماری بحث کا مرکزی موضوع ہے کہ:

''قرطبہ کے علماء و معلموں نے اسے یورپ کی تعلیم کا مرکز بنا دیا تھا' یورپ کے ہر حصے سے طلبہ' اس کے شہرۂ آفاق ماہران علوم سے سبق لینے آتے تھے' ہروس دی تھانن (راہبہ) بھی دور دراز مقام یعنی گاڈرشیم کی سیکشن خانقاہ میں بیٹھ کر' قرطبہ کی مدح سرائی کو ضبط نہ کر سکی اور بے اختیار اس کی زبان سے بھی یہ لفظ نکل پڑے ''قرطبہ' جس کی دنیا میں سب سے زیادہ شان و شوکت ہے' سائنس (علوم) کی ہر شاخ کی وہاں تعلیم ہوتی ہے اور علم طب میں جتنی ترقیاں جالینوس کے زمانے سے اس وقت مکمل صدیوں میں ہوئی تھیں اس سے کہیں زیادہ اور عمدہ اضافے' اندلس کے حکماء و اطباء کی تحقیقات اور تجربوں سے ہوئے' ابوالقاسم خلف جس کو یورپ والے البوکیسس کہتے ہیں' گیارہویں صدی عیسوی کا نامور سرجن تھا جس کا فن جراحی موجودہ طرز عمل کے مطابق تھا۔ ابن الزبیر نے جس کو یورپ والے آون زور کہتے ہیں اس کے تھوڑے سے عرصہ کے بعد بہت سی اہم باتیں طب و جراحی کے متعلق نئی دریافت کیں۔ ابن بیطار عالم نباتات نے سارے مشرق میں جڑی بوٹیوں کا پتہ لگانے کے لیے سیاحت کی اور اس پر ایک مکمل کتاب لکھی اور ابن رشد جسے یورپ والے آدمیر روز کہتے ہیں اس زنجیر کی جو قدیم یونان کے فلسفہ کو قرون وسطیٰ کے فلسفے سے ملاتی ہے' اصل کڑی ہے' علم ہیئت ' جغرافیہ' کیمسٹری' نیچرل ہسٹری' (علم الحیوانات) سب قرطبہ میں شوق سے پڑھے اور پڑھائے جاتے تھے اور علم و ادب کی موشگافیاں تو ایسی تھیں کہ یورپ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں ہر شخص کی زبان پر نظم نہ ہو اور جب کہ ہر طبقہ کے آدمی عربی کے ایسے اشعار کہتے ہوں جو اسپین کے کلاونتوں اور پرودنس و اطالیہ کے بھانٹوں کے آلھوں یا بحر خفیف کے گیتوں کی بنیاد قرار پاتے ہوں' کوئی تحریر یا تقریر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک اس میں اشعار کی چاشنی نہ ہوتی تھی جو یا تو وہ محرر یا مقرر خود فی البدیہہ نظم کر لیتا تھا یا اپنی یاد سے کسی مشہور شاعر کا کلام ہوتا تھا...... فنون میں اندلس بہت فائق تھا...... ہر آدمی نے

طلیطلہ کی تلواروں کی دھار کا ذکر سنا ہے' اگرچہ فولاد کو صیقل کرنے کا کام اسپین میں عربوں کی موجودگی سے زیادہ قدیم ہے مگر طلیطلہ کے اسلحہ سازوں کی ہنرمندی کو قرطبہ کے خلفاء وسلاطین کے گودوں میں پالا' ولمریہ' اشبیلہ' مرسیا اور غرناطہ بھی اسلحہ اور ہتھیاروں کے لیے مشہور مقامات تھے......علوم وفنون وتہذیب میں مسلمانوں کا شہر قرطبہ فی الحقیقت' ساری دنیا کا سب سے زیادہ چمکیلا اور پر رونق تھا۔''

یہ سب لین پول کی زبان سے بیان ہوا ہے' اس کی کتاب کا خاتمہ بھی جن الفاظ میں ہوا ہے وہ ایک بار غور کرنے کے لائق ہیں' اس نے لکھا کہ بدراہ اسپینی عیسائی نہیں سمجھے کہ وہ مسلمانوں کا خاتمہ کر کے کیا کر رہے ہیں' یہ لوگ یہ نہیں سمجھے کہ اپنی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو کھو بیٹھے' کئی صدیوں تک اسپین تہذیب کا مرکز علوم وفنون کا ملجا' تعلیم کا ماوی اور ہر قسم کی عالی خیالی کا مسکن رہا' یورپ کا کوئی دوسرا ملک عربوں کی ترقی یافتہ مملکت کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچا تھا۔

3.7 سب سے بڑا عنصر

یورپ کی نشاۃ جدیدہ کی تاریخ اور اس کی بنیاد میں سب سے بڑا عنصر جو کارفرما ہے وہ اسپین کے مسلمانوں کے اس وجود کا ہے جس کی ایک جھلک اوپر گزر چکی ہے' لیکن جب بھی یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ اور اس کے اثرات کا ذکر ہوگا تو علمی دیانت کا تقاضہ ہوگا کہ گذشتہ پانچ صدیاں' دنیا میں یورپ کے علوم وفنون کی حکمرانی اور بالادستی کی اگر مانی جاتی ہیں تو پانچ سو سال پہلے اس نشاۃ جدیدہ کا خمیر آخر کہاں اور کیسے تیار ہوا؟ دور ظلمت اچانک کس طرح عہد روشنی میں بدل گیا؟

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام نے علوم وفنون کی جس طرح سرپرستی روز اول سے کی اور دنیا کے قدیم علوم کو جس طرح زندہ کیا وہ ایسا کارنامہ ہے جو صرف دمشق و بغداد تک محدود نہیں رہ سکتا تھا' اسپین یا اندلس ایک طرف تو عالم اسلام سے جڑا ہوا تھا تو دوسری طرف وہ آباد انسانی دنیا کے لیے یورپ کا دروازہ بھی تھا' اٹلی اور فرانس اور جرمنی یہ اسپین سے زیادہ قریب تھے' اس لیے ان کا اسپین کے علمی سرچشموں سے سیراب ہونا زیادہ آسان تھا۔ یہاں یہ بھی سامنے رہے کہ مسلمان علماء اور سائنس دانوں نے علم کی سوغات تقسیم کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کسی بھید بھاؤ کو اپنے ذہنوں میں جگہ دی۔ انہوں نے علم کو ہمیشہ اپنی قیمتی میراث سمجھا' بالکل صحیح کہا گیا کہ مسلمان فلسفہ وطب کے پہلے مرحلے میں بے شبہ یونان و روم کے احسان مند ہیں۔ ان کی تصنیفات کے ہر صفحے سے اس احسان مندی کا اظہار ہوتا ہے' لیکن یہ بھی سچ ہے کہ افلاطون و ارسطو وغیرہ کے ناموں کو مسلمانوں نے جو عزت دی یونان میں بھی ان کو نصیب نہیں ہوئی ہوگی۔ مسلمانوں نے ایک ذرہ پایا اور اس کو آفتاب بنا دیا' ہیئت کو ترقی دی' طبیعیات کے متعلق ارسطو کی بہت سی غلطیاں دریافت کیں' منطق کو بالکل نئے طرز سے مرتب کیا' چند اصول کا اس میں اضافہ کیا' نئے نئے آلات رصد یہ ایجاد کیے' نور کی رفتار دریافت کی' علم مناظر میں انعکاس کا قاعدہ معلوم کیا' جبر ومقابلہ جو چند جزئی مسئلوں کا نام تھا' مسلمانوں کی ذہانت کی وجہ سے ایک علم کے رتبہ پر پہنچ گیا' دواسازی' نسخوں کی ترتیب' عرق نکالنے کے آلات' تیزابوں کا باہمی فرق یہ سب مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ کیمسٹری کی بنیاد انہوں نے رکھی' نباتات میں اپنے تجربوں سے دو ہزار پودے اور بڑھائے' یعنی یونانی واسلامی تصنیفات کا موازنہ کیا جائے تو قطرہ اور دریا کا فرق ملے گا۔

3.8 اندلس کی علمی سخاوت

یورپ کی نشاۃ جدیدہ کے اسباب جب بھی تلاش کیے جائیں گے تو صرف اسپین کے مسلمانوں کے علوم ہی نہیں' پورے عالم اسلام کی علمی وفنی اور سائنسی ترقیات پر نظر ڈالنا ضروری ہوگا اور تب یہ یقین سے کہا جائے گا کہ آج یورپ جو بھی ہے اس سے انکار نہیں' اس سے بھی انکار نہیں کہ آج کی یورپ کی خیرہ کن علمی و سائنسی ترقی کی بنیاد اس کی تحریک نشاۃ جدیدہ ہے' ٹھیک اسی طرح اس کا بھی انکار ممکن نہیں کہ اس نشاۃ جدیدہ کی تحریک کا خمیر مسلمانوں کے علوم وفنون سے تیار کیا گیا۔

لین پول ہوں یا لی بان ان سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ابوالقاسم زہراوی بارہویں صدی کا اندلس کا ایسا سرجن ہے جس نے پہلی بار پتھری نکالنے کا طریقہ نکالا' لی بان کے الفاظ میں ابوالقاسم زہراوی کی کتابیں ایسی ہیں کہ اس فن کو کوئی اور نصیب نہیں ہوئیں اور یہ لحاظ قول وعمل اس قسم کی کتابیں نہیں مل سکتیں' یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا۔ زہراوی کے بعض عملیات (آپریشن) بعینہ زمانہ حال کے مطابق تھے' ابن ظہر بھی جراحی کا ایسا نامور گزرا جس نے علمی اور نظری میدانوں میں بالکل نئی ایجادات کیں۔

قرطبہ میں خلیفہ حکم نے چار لاکھ کتابیں لکھوا کر جمع کیں' یہ کہنا جتنا آسان ہے تصور کرنا اتنا ہی مشکل ہے کہ پریس کی سہولت جب نہیں تھی تو کاتبوں سے چار لاکھ کتابیں کس طرح لکھوائی گئی ہوں گی اور کمال یہ ہے کہ خلیفہ الحکم نے ان تمام کتابوں کا بغور مطالعہ بھی کیا۔ان میں سے بعض پر حواشی بھی لکھے تھے' لین پول کے مطابق ان حواشی کو بعد میں بڑی قدر ومنزلت سے دیکھا گیا۔

حاکم روم نے ایک اور کتب خانہ بنایا جس کا نام کتب خانہ مروانی تھا۔ اس کی فہرست کتب کا حال بقول ابن خلدون یہ تھا کہ صرف دواوین کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی۔

ان کتابوں کے استعمال کی عام اجازت بھی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ اسپین ہر قسم کے علوم وفنون کا معدن بنا دیا گیا تھا۔ان سے استفادہ کی بات جہاں جہاں مورخین نے لکھی ہے وہاں یہ بھی ذکر کیا گیا کہ قرطبہ اور اس کے کتب خانے صرف اندلس کا علمی مرکز نہیں تھے' تمام یورپ نے اس سے فائدہ اٹھایا' فرانس' جرمنی' انگلینڈ سے متعلمین جوق در جوق آتے اور ان علوم وفنون کے سرچشموں سے سیراب ہو کر جاتے

ایک امریکی فلسفی نے لکھا کہ اندلس جنت نظیر تھا' جہاں یہودی اور عیسائی دونوں مذہب کے لوگ امن وآزادی سے زندگی گزارتے اور یورپین علماء کو اندلس میں علم افلاک کی تحصیل کے لیے آتے دیکھتے۔

ایک ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار طلبہ درس گاہوں میں شریک ہوتے' عورتوں کا بھی یہی حال تھا۔اشبیلہ کا زنانہ مدرسہ مریم بنت یعقوب نے قائم کیا تھا یہاں کی طالبات کے بارے میں کتاب اخبار الاندلس میں ہے کہ وہ علم وفن میں یکتا ہوتیں۔

علم کے ساتھ فن کا مطلب ظاہر ہے کہ صنعت وحرفت میں غیر معمولی ترقی یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد اصلاح مذہب کا محکمہ کامیاب رہا یا نہیں رہا' یہ زیر بحث آ سکتا ہے لیکن یورپ کی صنعتی وحرفتی ترقی کسی بھی بحث سے بالاتر حقیقت ہے۔صنعت وحرفت کا ذکر اپنے کمال کے اعتبار سے مسلمانوں کی تاریخ خصوصاً اندلس کی تاریخ کا سب سے زریں باب ہے اور اس کے متعلق یہ الفاظ صراحت سے ملتے ہیں کہ رصد خانے اور کتب خانے تو تھے ہی' تعلیم کے دو طریقے تھے' چھوٹے شہروں اور قصبوں اور ابتدائی مدارس جہاں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہوتا' بڑے

شہروں میں زراعت وزمین داری کے مختلف شعبوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوتا۔ تکمیل تعلیم اور علمی ریسرچ کے لیے قرطبہ اشبیلیہ مالقہ سرقسطہ نشونہ جیان طلیطلہ وہ شہر تھے جہاں طلبہ اطالیہ فرانس جرمنی اور انگلینڈ سے آتے تھے۔

ایک مورخ نے لکھا کہ یورپ کے مردہ علوم مسلمانوں سے زندہ ہوئے۔ اس قول میں تلخ لہجہ اس کے باوجود حقیقت ہے کہ علوم مسلمانوں کی وجہ سے زندہ ہوئے ورنہ یورپ میں مسلمانوں سے پہلے علوم تھے ہی کہاں جو مردہ ہوتے۔

یورپ کے دور جدید کی تفصیل کی ضرورت نہیں مصنوعات ایجادات اور تہذیب وتمدن کے مشاہدات کافی ہیں لیکن پندرہویں صدی سے تین صدی قبل کا یہ حال تھا کہ وہاں پختہ سڑک نہیں تھی جب کہ اندلس کا ہر شہر پتھر کی سڑکوں سے آباد تھا۔

مصنوعات کا یہ عالم کہ صرف قرطبہ میں ایک لاکھ بیس ہزار ریشم باف موجود تھے روئی شکر اور چاول کی کاشت غیر معمولی تھی ہتھیار اور کاغذ کے کارخانے مشہور عالم تھے معدنی اشیا برتن وغیرہ کو ڈھالنے کے کارخانے آہنی صندوق الماریاں تالے چینی کے برتن کے کارخانوں کے ذکر سے سارے مورخوں کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

بارود اور توپ کے کارخانے اعلیٰ درجہ کے تھے۔

قطب نما کا آلہ سب سے پہلے یورپ والوں نے اسپین ہی میں دیکھا۔

جنگی جہازوں کے بیڑے اسپین کی دین ہیں عبدالرحمٰن ناصر کے زمانے میں اس کا بحری بیڑہ دوسو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا۔

یہ تفصیل بہت طولانی ہے۔

معلومات کی جانچ:

1. یورپ میں نشاۃ جدیدہ کی بنیادمیں سب سے بڑا عنصر کیا ہے؟
2. یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا خمیر کہاں تیار ہوا؟ وضاحت کریں۔
3. مسلمانوں نے علم کو ہمیشہ اپنی میراث سمجھا اس کی وضاحت کریں۔

3.9 خلاصہ

بحث کا مرکزی موضوع یورپ کی نشاۃ جدیدہ ہے۔ اس کے اثرات سے زیادہ اس کے اسباب ومحرکات کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ موضوع کا بنیادی نقطہ یہی ہے کہ اگر اس تحریک نشاۃ جدیدہ کا ایک یا کئی محرکات ہیں تو کیا اس میں اسلام اور مسلمانوں کا بھی کوئی حصہ ہے؟ یہ سوال اس لیے اٹھتا ہے کہ یورپ نے گذشتہ پانچ چھ صدیوں میں جو کچھ ترقی کے نام پر حاصل کیا اور اس کا اعتراف ساری دنیا کو ہے وہ سب اچانک تھا یا اس کی بنیادیں کہیں موجود تھیں۔ عموماً یورپ کے مورخین اس مقام سے آسانی اور تیزی سے گزر جاتے ہیں لیکن محقق اور منصف مورخین اس مقام پر رکتے ہیں اور تب یہ سامنے آتا ہے کہ یورپ کی نشاۃ جدیدہ خواہ وہ اصلاح مذہب کی ہو یا علمی ترقیات کی ممکن نہ ہوتی اگر وہ

اسلامی علوم اور سائنس میں ان کی ایجادی کارناموں سے سیراب نہ ہوئے ہوتے اور اس کا سب سے بڑا خزانہ اندلس کی سرزمین تھی' جہاں مسلمانوں نے وہ سب کر کے دکھایا جو آج کے مغرب جس میں امریکہ اپنی فاصلاتی دوری کے باوجود شامل ہے کا سب سے بڑا سرمایہ اور فخر کی پونجی ہے۔

مسلمان' اسلام کے سایہ میں یونان و روم وغیرہ کے علوم کے محافظ ہیں اور پھر ان کی ترقی جس طرح تاریخ اسلام میں درج ہے اس کا پھل یہ نکلا کہ یعقوب کندی' زکریا رازی' فارابی' الفرغانی' البتانی' ابومعشر فلکی' ابن ہیثم فرازی' جابر بن حیان' ابن الجزار' ابن المجوسی جیسے سائنس دانوں کی میراث عام ہوتی گئی اور اس میراث میں بغداد اور دمشق و قاہرہ جیسے شہروں کے ساتھ جب قرطبہ' اشتبام اور غرناطہ شامل ہوئے تو ابن الصفار' الزہری' الکرمانی' ابن خلدون' ابن الصفار' سرقسطی' ابراہیم النہری' حمد بن ابان' الحرانی' یحییٰ بن اسحاق' ابن الکتانی' بن عساکر' ابن خمیس' قاضی صاعد' ابن حزم اور ابن رشد جیسے علماء' فضلا اور سائنس داں پیدا ہوئے' جن کی وجہ سے اسلامی اسپین کا چپہ چپہ' علم و ہنر کا مرکز بن گیا۔ وہاں سے علم و فن کی روشنی ایسی بکھری کہ یورپ جو خود بھی کہتا ہے کہ پندرھویں صدی سے پہلے عہد ظلمت میں تھا' مسلمانوں کے علوم و فنون کی روشنی سے منور ہوا۔ ہر علمی و فکری تحریک جو نشاۃ جدیدہ کا حصہ بنی' اس کی بنیادوں میں مسلمانوں کی علمی' عقلی اور سائنسی نشانیاں ضرور ملتی ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی سے اسلام کے آفتاب علم کی ضیا پاشیاں سارے عالم کے لیے تھیں' دنیا کی نشاۃ جدیدہ' اسلام کا عطیہ ہے' یورپ کی نشاۃ جدیدہ پندرھویں اور سولہویں صدی سے دیکھی جاتی ہے' لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس نشاۃ کا آغاز تو ساتویں صدی میں اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔

گزشتہ سطروں میں اسی حقیقت کا تاریخی بنیادوں پر غیر جانبداری سے مطالعہ کیا گیا ہے' تجزیے ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے اور یہ جیسے جیسے حقیقتوں کی روشنی میں تعصّبات اور جانبداری سے دور ہو کر کیے جائیں گے' اتنا ہی یہ صاف ہوتا جائے گا کہ یورپ کی مشہور نشاۃ ثانیہ میں مسلمانوں کے علوم و فنون کا ناقابل انکار حصہ ہے۔ یہاں فرنچ عالم پروفیسر سیدیو کا یہ قول نقل کرنے کے لائق ہے کہ:

> ''ہمارے موجودہ دور تمدن کے ہر ایک شعبۂ عمل میں اہل عرب (مسلمانوں) کے اثرات صاف نمایاں ہیں' نویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی تک اس عظیم الشان لٹریچر کی بنیاد پڑ چکی تھی جو اب تک قائم ہے' قسم قسم کی پیداواریں اور بیش بہا ایجادات جو دماغ کی حیرت انگیز فعالیت نے اس زمانہ میں کیں اور ان کا اثر مسیحی یورپ پر پڑا۔ اس سے ہمارے اس خیال کو تقویت پہنچی ہے کہ اہل عرب نے تمام چیزوں میں ہماری رہنمائی کی ہے' ایک طرف ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کے لیے ہم بے اندازہ مواد پاتے ہیں جو سفرناموں اور سوانح عمریوں میں بکثرت موجود ہے' دوسری طرف ہم بے نظیر صنعت و حرفت اور اصول انجینیر ی بالفعل و بالخیال اور دیگر علوم و فنون میں ان کے اہم اکتشافات کو معلوم کرتے ہیں۔
>
> (ہسٹوریَن ہسٹری آف دی ورلڈ)

اس کے بعد گستاؤلی بان کا یہ اعتراف سمجھ میں آتا ہے کہ:

''عربوں کا اثر مغرب کی زمین پر بھی اتنا ہی ہوا جتنا کہ مشرق میں ہوا اور ان ہی کی بدولت یورپ نے تمدن حاصل کیا''۔ (تمدن عرب ترجمہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی)

یہاں یہ نکتہ بھی نظر میں رکھنے کے قابل ہے کہ اگر چہ بنو عباس کے زمانہ کے عقلی علوم اور ان کی بیش بہا کتابوں کا وجود اور اس کے اثرات کا اندلس تک پھیلنا اور ترقی پانا' یورپ کی نشاۃ جدید کا سب سے طاقتور محرک ہے لیکن یہ بھی ماننا چاہیے کہ صلیبی جنگوں کے زمانہ سے یورپ اور عرب کا جو باہمی اختلاط ہوا خواہ وہ جنگ ہی کے بہانہ ہوا' اس کا سب سے مفید اثر یورپ کی تہذیب وتمدن کی تشکیل کی شکل میں سامنے آیا۔ صحیح کہا گیا کہ مختلف ذہنی اور دماغی کارروائیوں کی ابتدا جن سے یورپ میں علوم وفنون کی تجدید ہوئی اسی زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ (تاریخ تمدن یورپ اور علوم عرب جرجی زیدان)

لی بان محقق ہیں ان کا تجزیہ گہرے مطالعہ پر منحصر ہے' لکھتے ہیں:

> ''جس وقت ہم ان تجارتی تعلقات اور صنعتی وحرفتی ترقیوں پر جو صلیبیوں کے مشرق جانے سے پیدا ہوئیں' نظر ڈالیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہی صلیبی جنگیں تھی جنہوں نے یورپ سے وحشیانہ اخلاق وحالات کو دور کیا اور وہ رجحان طبیعت پیدا کر دیا جس پر علمی وادبی ترقی نے جو یورپ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طریقے سے عام ہوئی' ایک دن یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں ظاہر ہونے والا تھا۔'' (تمدن عرب)

شروع میں اصلاح مذہب کو نشاۃ ثانیہ کی پہلی بڑی غرض بتایا گیا' مارٹن لوتھر کا ذکر بھی آیا' پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانی کی حیثیت سے لوتھر کو سب جانتے ہیں۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس نے اٹلی کی ان درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی جہاں ارسطو اور عربی فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی' لوتھر' قرطبہ اور طلیطلہ بھی گیا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے' اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اسلام کے مطالعہ ہی سے کیتھولک چرچ میں لوتھر کو اصلاح کا خیال آیا اور یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ لوتھر نے خود قرآن کا مطالعہ اس طرح کیا کہ لاطینی زبان میں وہ قرآن مجید کا مترجم ہوا۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور لوتھر کا تعلق سب کو مسلم ہے۔ مذکورہ حقائق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نشاۃ ثانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کے اثرات کا بڑا حصہ ہے۔ جس کی ابتدا یہاں سے ہو چکی تھی' بارہویں صدی میں پیرس میں ابن سینا اور فارابی کی کتابوں کا مطالعہ' تیرہویں صدی میں راجر بیکن اور ریمنڈول' چودھویں صدی میں پوپ کی طرف سے روم' پیرس' بولونا میں عراقی اور عربی تعلیم کا نتیجہ اگر پندرہویں صدی میں نشاۃ جدیدہ کی شکل میں ظاہر ہوا تو یہ حیرت کی بات نہیں۔

خلاصہ کے خلاصہ کے طور پر اتنا جاننا ضروری ہے کہ عربی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ ہونے والی کتابیں خود بتاتی ہیں کہ اس نشاۃ جدیدہ میں مسلمانوں کا حصہ کیسا اور کتنا ہے' فلسفہ وطبیعیات میں نوے' ریاضی میں ستر' طب میں نوے اور کیمیا' کیمسٹری اور زولوجی میں چالیس۔ اسی سے اس گلستاں کی بہار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

3.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجیے۔

1. یورپ کی تاریخ میں نشاۃ جدیدہ کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

2. نشاۃ جدیدہ کی نوعیتوں پر بحث کیجیے۔

3. یورپ کے نشاۃ جدیدہ میں اندلس کا بڑا رول ہے، بحث کیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. قرطبہ کے بارے میں مؤرخین کا نقطہ نظر بیان کیجیے۔

3. اندلس کے اہم مسلم سائنس دانوں کا تذکرہ کیجیے۔

3.10 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

	کتاب	مصنف
1.	تاریخ اندلس	مولانا سید ریاست علی ندوی
2.	یورپ سولہویں صدی عیسوی میں	اے ایچ جانسن، ترجمہ مولوی رحیم الدین
3.	طبقات الامم	قاضی ابوالقاسم صاعد، ترجمہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
4.	مسلمانان اندلس کے علوم وفنون	عثمان علی مرزا
5.	مقالات شبلی جلد سوم	علامہ شبلی نعمانی
6.	مسلمانان اندلس	اسٹینلی لین پول، ترجمہ مولانا سید عبدالغنی وارثی
7.	مسلمانوں کے سائنسی کارنامے	ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

اکائی 4 : عالم اسلام میں سائنسی علوم کا زوال' اسباب ونتائج

اکائی کے اجزاء

4.1 مقصد

اس میں کچھ باتیں اسلام میں سائنسی علوم کے عروج پر ہوں گی' زوال کہاں سے شروع ہوا؟ اس پر بات ہوگی اور ایسا کیوں ہوا اور دنیا پر اس کا کیا اثر پڑا؟ اس پر بھی گفتگو کی کوشش کی جائے گی۔ اس اکائی کے مطالعہ سے طلبہ مذکورہ باتوں سے واقف ہوسکیں گے۔

4.2 تمہید

اسلام میں علوم دینیہ کی ترویج واشاعت کے ساتھ' علوم عقلیہ کی جانب کامل توجہ ملتی ہے۔ بنی امیہ' بنوعباس' فاطمیین اور اندلس کی اموی حکومت' ان کے علاوہ مغلوں اور ترکوں کے زمانہ حکومت میں بھی سائنسی علوم کی ترویج وتعلیم ہوتی رہی' اس کے باوجود کیوں اس کی رفتار سست پڑی اور یورپ اور دیگر قوموں کو مسلمانوں سے آگے بڑھنے کا موقع ملا' اس اکائی میں اس کے اسباب اور نتائج کو دیکھنے اور پانے کی کوشش کی جائے گی۔

4.3 عالم اسلام میں سائنسی علوم

عالم اسلام سے صرف ایک جغرافیائی تصور ہی مقصود نہیں' عالم اسلام کو جب کسی علمی یا تاریخی بحث کے تعلق سے بولا جاتا ہے تو اس سے اسلام کی تاریخ اپنی ابتدا سے اب تک اپنے پورے تکوینی وتشریعی نظام کے ساتھ نظر میں آجاتی ہے' اور موجودہ حالات میں جب اسلام کے ساتھ سائنس کا لفظ آتا ہے تو بعض ذہنوں کو یہ ساتھ اجنبی سا معلوم ہوتا ہے' اور اگر وہ اسلام کی ایک خاص نظریہ عبادت سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں تو سائنس کو روحانیت سے عاری پاکر اور مادیت سے ملوث دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ علوم دینیہ کے ہوتے ہوئے علوم عقلیہ یعنی سائنس کی جانب توجہ یا رجحان یا اس میں انہماک غیر شرعی یعنی خدا اور رسول ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ حالانکہ لفظ سائنس زبان کے اعتبار سے انگریزی ہے اور اصل اس کی لاطینی زبان ہے۔ لاطینی میں لفظ سائنٹیا Scientia علم و دانش کے مفہوم میں ہے' یہی مفہوم انگریزی کا بھی ہے' عربی زبان میں اس کا سب سے صحیح اور مناسب ترجمہ العلم ہے۔ علم اگر مطلق ہے تو اس کے فضائل' اس کے حصول کی کوشش اور اس کی کوشش کو بدرجہ فرض قرار دینے جانے کی اہمیت کسی پڑھے لکھے مسلمان سے پوشیدہ نہیں' لیکن سائنس یا علوم اگر اصطلاحی شکل میں سامنے آتی ہے یعنی اس کے معانی کو کسی خاص مفہوم کے ساتھ متعین کیا جاتا ہے تو پھر موجودہ انداز فکر میں ہلچل سی دکھائی دیتی ہے۔

4.4 سائنس کیا ہے؟

سائنس کے اصطلاحی معانی کم نہیں مگر عام تعریف یہی ہے کہ نظام فطرت کا ایسا علم جو مشاہدہ' تجربہ اور غور و فکر کے ساتھ خاص ہو۔ ورنہ اور تعریفیں بھی ہیں جیسے " سائنس مظاہر فطرت کے مربوط علم اور مختلف مظاہر کے باہمی تعلق کے تعقل کا نام ہے" یا یہ کہ " سائنس' مربوط' مثبت علم کا نام ہے" تعریفیں تو اور بھی ہیں لیکن قدرے لفظی اختلاف کے ساتھ' اصل مفہوم سب کا یکساں ہی ہے یعنی کائنات کے قدرتی واقعات اور حالات کے مشاہدے سے کچھ نتائج اخذ کرنا پھر ان کو ایک نظم و ترتیب سے جمع کر دینا ہے۔ ہر درست سائنسی نتیجہ کو ایک علمی حقیقت یا قانون قدرت باور کر لیا جاتا ہے اور جب مشاہدہ' تجربہ اور غور و فکر سے حاصل ہونے والے علمی حقائق' ترتیب کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں تو ان ہی کو سائنس کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بات یہاں اسلام کے حوالہ سے ہو رہی ہے' اسلام پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ علم ہی مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہے' ان کی پہچان "اطلبوا العلم من المهد الى اللحد" (علم حاصل کرو' گہوارہ سے گور تک) جیسی حقیقت رہی۔ ان کو پہلا الٰہی حکم پڑھنے کا ملا۔ پہلی قرآنی نصیحت علم اور قلم کے الفاظ کے ظہور کے ساتھ ملی۔

قرآن مجید کتاب ہدایت ہے' کتاب نور ہے' کتاب مبین اور کتاب حکیم ہے۔ اور پھر صفات ہیں' قرآن مجید ان صفات کا مجموعہ ہے' جس میں احکام عبادات و اخلاق کے ساتھ کائنات میں غور و فکر کی آیات ہیں جن میں کائنات کے نظام کو سمجھنے غور و فکر کرنے اور مناظر قدرت کو دیکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے' ان کو اپنے بس میں کرنے اور ان سے انسانی زندگی کو اعلیٰ اور برتر شکل میں سنوارنے کی بات کہی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ قرآن کریم ہی پہلی ایسی آسمانی کتاب ہے جس میں مظاہر قدرت کا بغور مطالعہ کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا حکم دیا گیا۔ تفکر' تدبر' تعقل' شعور و نظر جیسے الفاظ کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہوا ہے۔ اس کائنات کے ذرہ ذرہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کی

جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

ایسی آیتوں کو اگر یہاں نقل کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے۔

4.5 قرآن کا مقصد

ان آیات کے مطالعہ کے بعد قرآن مجید کا ایک مقصود یہ سامنے آتا ہے کہ زمین پر اللہ کی خلافت کا فریضہ انجام دینے' انسان دشمن طاقتو ں کو پسپا کرنے اور حقیقی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے اس دنیا یا کائنات سے بھی یقین و اعتماد کی دولت حاصل کر کے ایمان بالغیب کو مزید مستحکم کیا جائے۔ اور یہ چیز مشاہدہ اور غور و فکر ہے' موجودہ لفظ سائنس کی بنیاد بھی ان ہی دو چیزوں پر ہے۔

مشاہدات کا تعلق حواس سے ہے اور غور و فکر کا دماغ سے۔ قرآن کریم کے قریب ایک تہائی حصہ میں قدرت کے گونا گوں مظاہر کی طرف توجہ دلا کر اسی مشاہدہ اور غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

سائنس' مادی دنیا کی تسخیر کے منظم طریقہ کا اگر نام ہے تو یہ قرآن کی بھی بڑی تعلیم ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ قرآن مجید اگر تین سو علوم کا منبع ہے تو اس میں سائنس بھی ہے لیکن صرف سائنسی علوم سے بحث کرنا ہی قرآن کا مقصد نہیں ہے' لیکن سائنس کو غیر اسلامی یا غیر قرآنی بھی کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ یعنی سائنس' اسلام کی مخالف نہیں۔

سائنس کے بارے میں یہ چند بڑی واضح اور صاف باتیں ہیں اور جب تک ان میں یہ فصاحت اور صفائی رہی' ذہنوں میں یہ خلش نہیں پہنچنے پائی کہ سائنس یا عقلی علوم' غیر اسلامی یا غیر شرعی ہیں۔

اسلام میں سائنسی علوم کے زوال کے اسباب تلاش کرنے سے پہلے اس کے عروج پر نظر ڈالنا چاہیے۔ اس میں سب سے پہلا مرحلہ قرآن کریم ہے' جس کے متعلق چند باتیں آ چکی ہیں' حدیث شریف کے بڑے ذخیرے میں بھی کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ عقلی علوم غیر اہم یا غیر معتبر یا غیر مفید ہیں۔

علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے' یہ مطلق اعلان ہے اس کو شرطوں سے مقید کرنے کا کام بعد کا ہے اور اس کے لیے کچھ اسباب بھی تلاش کیے گئے' لیکن اگر علم نافع کے حدیثی الفاظ سامنے رہیں تو سائنس کو اسلام بدر نہیں کیا جا سکتا۔ ''دانش و بینش' حکمت مومن کی گمشدہ ملکیت ہے' جہاں ملے اس پر اسی کا حق ہے'' اس قسم کے اقوال سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ سائنس یا العلم اسلام کے دائرہ سے باہر نہیں بلکہ یہ عین اسلام کے وسیع دائرہ میں عزت کے ساتھ شامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے صاحب نظر و فکر لوگوں کی نظر قرآن مجید پر رہی اور انہوں نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کسی بھی سائنسی تحقیق اور انکشاف کو عمل صالح سے جوڑ دیا جائے یعنی اس چیز کو صحیح راستہ کے لیے استعمال کیا جائے اور اس کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے جو کائنات کے لیے مفید اور نافع ہوں اور اس کے مضر اثرات سے بچا جا سکے۔

4.6 اسلام کے سائنسی سفر کے سنگ میل

اس نکتہ نظر کا نتیجہ تھا کہ ابتدائے اسلام سے دینی علوم کے ساتھ عقلی علوم کا واسطہ حلیف و رفیق کا رہا۔ جغرافیہ' معدنیات' نباتیات' حیوانیات' ارضیات' کیمیا' فلکیات' طب' فلسفہ یعنی وہ تمام علوم جو روئے زمین پر پائے جاتے ہیں' ان میں ہر دور کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

خالد بن یزید بن معاویہ نے سائنسی اور عقلی علوم کے سنجیدہ مطالعہ اور کائنات کے مشاہدے کا جو فریضہ انجام دیا گیا' وہ ہماری تاریخ کا ایسا حصہ ہے جس کو اسلام کی تاریخ سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا' اسلام کی ہر صدی میں کچھ نام موجود ہیں جو سائنسی یا عقلی علوم کے ارتقائی سفر کے سنگ میل ہیں۔

آٹھویں صدی میں خالد بن یزید (704ء) ابو اسحٰق ابراہیم بن جندب (776ء) بغداد کے ہیئت داں' کیمیا داں اور ماہرین فلکیات و علم نجوم بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں' اسی صدی میں ایران میں جرجیس بن جبرئیل اور بغداد میں نوبخت نظر آتے ہیں۔

نویں صدی میں محمد بن ابراہیم (806ء) ماشاء اللہ (810ء) عمر بن فرحان (815ھ) جابر بن حیان (817ء) احمد بن عبداللہ حبش حاسب (830ء) جبرئیل بن بختیشوع (830ء) عبدالمالک اصمعی (831ء) عطارد الکاتب (832ء) یحیٰی بن ابی منصور (833ء) محمد بن موسیٰ خوارزمی (850ء) احمد بن موسیٰ شاکر (858ء) سند بن علی (863ء) عمرو الجاحظ (869ء) محمد بن شاکر (872ء) حسن بن موسیٰ شاکر (873ء) یعقوب بن اسحٰق کندی (873ء) حنین بن اسحاق (877ء) ابو معشر بلخی (886ء) ابوحنیفہ دینوری (895ء) جیسے نام نظر آتے ہیں۔ جو ہیئت' ہندسہ' کیمیا' معدنیات' نباتیات' ریاضی' طب' امراض چشم' میکانک' فلکیات' طبیعیات جیسے علوم میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے' یہی سلسلہ دسویں صدی میں بھی نظر آتا ہے۔

دسویں صدی میں ثابت بن قرہ (901ء) علی بن سہل الطبری (903ء) یعقوب بن حنین (910ء) ابن خردازبہ (912ء) جابر بن سنان (925ء) محمد بن جابر البتانی (929ء) ابوبکر زکریا رازی (932ء)' ابونصر محمد بن فارابی (950ء) علی بن حسین المسعودی (907ء) ابوالقاسم محمد بن حوقل (973ء) عریب بن سعد الکاتب القرطبی (976ء) یوسف الخوارزمی (980ء) احمد بن محمد صنعانی (990ء) ابوبکر المقدسی (996ء) جیسے نام سامنے آتے ہیں۔ ایک فہرست کے مطابق قریب چالیس نامور ترین اشخاص ہیں جو اس صدی میں علوم عقلیہ کے اسلامی نمائندے ہیں' ان میں علی بن سہل الطبری کو پہلی طبی انسائیکلوپیڈیا اور یوسف الخوارزمی کو دنیا کی پہلی اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مصنف کی حیثیت حاصل ہے۔

گیارہویں صدی کا بھی یہی حال ہے' کتابوں میں اس صدی کے تیس کے قریب عظیم الشان سائنس دانوں کے نام بتائے گئے ہیں۔ ان میں ابوالقاسم عمار موصلی (1005ء) سے ابوالحاکم الکافی (1100ء) تک کی فہرست میں ابوالقاسم مسلمہ المجریطی' ابوالقاسم زہراوی' مساویہ مروانی' حسن الحاسب' ابن الہیثم' کشیا ابن لبان الجیلی' احمد بن محمد بن مسکویہ' ابومنصور بغدادی' ابن سینا' احمد البیرونی' ابواسحاق الزرقانی جیسے مشہور ترین نام شامل ہیں۔

بارہویں صدی عیسوی میں امام محمد بن احمد غزالی' عمر خیام' ابن باجہ، ابوالبرکات بغدادی' شریف ادریسی' طفیل القیسی' ابن رشد' الاقلیدسی، جابر بن افلح جیسے ماہرین فن کے نام ہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی میں موسیٰ بن میمون سے سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں شرف الدین طوسی' البطروجی' یاقوت الحموی' ضیاء الدین بن البیطار' ابن ابی اصیبعہ' نصیر الدین طوسی' شمس الدین سمرقندی' زکریا بن محمد' ابن نفیس' محی الدین مغربی جیسے نامور ماہرین سائنس کے نام ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی میں بھی کم از کم دس نام بتائے گئے' ان میں قطب الدین شیرازی' ابن البنا المراکشی' ابوالفداء' ابن الخطیب' ابن الشاطر' ابن بطوطہ جیسے نابغۂ روزگار شامل ہیں۔

پندرہویں صدی عیسوی میں ماہر حیوانیات محمد بن موسیٰ دمیری سے ابن خلدون غیاث الدین الکاشی' قاضی زادہ رومی' الغ بیگ' ابن ماجد' ابن الوردی' محمد علی القلصادی کا ذکر ملتا ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں محی الدین پری رئیس' الحسن بن محمد' حاجی خلیفہ کاتب چلپی جیسے نام ملتے ہیں۔

یعنی سولہویں صدی عیسوی تک سائنس کی دنیا میں حکمرانی مسلمانوں ہی کی رہی۔

4.7 ایک سوال کا جواب

پھر یہ کیا ہوا کہ سترہویں صدی سے یہ طرۂ امتیاز ان سے ہٹ کر' بلکہ غائب ہو کر یورپ کی نشاۃ جدیدہ کی پیداوار کے حوالے ہو گیا۔ اس کا جواب آسان نہیں اور دیکھا جائے تو مشکل بھی نہیں۔ سائنسی علوم کے زوال کے سوال کو اسلامی دنیا کے تنزل کے اسباب سے ملا کر دیکھا گیا تو جس طرح خلافت راشدہ کے بعد سیاست میں تنزل ہوا اس کی وجہ بیان کی گئی کہ ملوکیت کے اثرات نے معاشرہ میں یہ تبدیلی پیدا کی کہ دین و سیاست میں عملی تفریق ہو گئی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تنزل کا ایک ذمہ دار یہ سبب بھی بتایا گیا کہ مسلمان علماء بالفاظ دیگر علوم عقلیہ کے ماہرین نے جس قدر علوم مابعد الطبیعیات اور یونانیوں کی الٰہیات کی طرف توجہ کی' اس قدر علوم طبیعیہ اور علمی اور نتیجہ خیز فنون کی طرف توجہ نہیں کی۔ حالانکہ یہ یونانی فلسفہ اور الٰہیات محض یونانیوں کا علم الاصنام تھا جس کو انہوں نے اپنی چالاکی سے فلسفیانہ الفاظ و اصطلاحات میں ایک عقلی فن کے لباس میں پیش کیا تھا' وہ محض چند خیالات و قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا جس کے پیچھے کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں تھی۔ یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے اور اس کا اگر آسان مفہوم تلاش کیا جائے تو شاید ایک قسم کا تصوفانہ رجحان سامنے آجائے گا' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مابعد الطبیعیات اور فلسفہ الٰہیات کہہ کر شاید اسی طرف اشارہ کیا اور پھر یہ بھی لکھا کہ ''اس طرح سے انہوں نے فلسفہ اشراق کے مباحث اور وحدۃ الوجود کے مسائل میں اپنا ضرورت سے زیادہ وقت اور طاقت صرف کی' ممکن ہے اس نقطہ نظر سے اختلاف ہو' لیکن تاریخ اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اوپر سولہویں صدی عیسوی تک جس طرح سائنسی علوم میں عبقری شخصیات سامنے آتی ہیں' ٹھیک اسی طرح دوسری جانب علوم نقلیہ یعنی تفسیر' حدیث' فقہ کی فراوانی بھی نظر آتی ہے' معاشرہ ترقی پذیر بلکہ ترقی یافتہ تھا' حکومتیں' طاقتور اور معاشی لحاظ سے عام خوش حالی تھی' ایسے میں علوم نقلیہ کی قدر و قیمت قدرتاً زیادہ تھی۔ محدثین کی اہمیت' علم حدیث سے عوامی اشتغال اور اس سے بھی زیادہ مسائل فقہیہ کی گرم

بازاری بھی عالم اسلام میں پوری شان سے نظر آتی ہے' حتی کہ ان کے مقابلہ میں ادب وشعر کی کمتری کا احساس ہوتا نظر آتا ہے۔

سرکاری سطح پر ان علوم کی حوصلہ افزائی ظاہر ہے' لیکن علمائے علوم عقلیہ کی قدر افزائی بھی سیاست اور حکومت واقتدار کے دور عروج میں کم نہیں رہی' ہارون رشید' المامون سے لے کر حاکم اندلسی تک یہ حقیقت عیاں ہے' لیکن عوامی طور پر علوم دینیہ کی اہمیت بہر حال غالب رہی' امام ابو حنیفہ' امام شافعی' امام احمد بن حنبل اور امام مالک یا امام بخاری ومسلم کے درجہ قبولیت واحترام سے فارابی' رازی' ابن سینا یا زہراوی کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

4.8 اسباب زوال

اس پہلو پر بحث ہوتی رہی کہ اس پت جھڑ کی اصل وجہ کیا ہے جس کے سبب مسلمانوں کے گلشن علم کی سرسبزی وشادابی جاتی رہی۔ چند صدیوں کی علمی سرگرمیوں کا یہاں ذکر گیا ہے اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آٹھویں صدی میں جہاں چار ناموروں کا ذکر ہے وہیں نویں صدی میں یہ تعداد 34 تک پہنچ جاتی ہے' دسویں صدی میں یہ اور بھی بڑھ کر اکتالیس ہو جاتی ہے' گیارہویں صدی میں یہ تعداد گھٹتی ہے' یہ کل ستائس ہے لیکن بارہویں صدی میں یہ تعداد چودہ ہی تک پہنچتی ہے' تیرھویں صدی میں یہ سترہ ہے' لیکن چودھویں اور پندرہویں صدی ملا کر صرف اٹھارہ نام ملتے ہیں اور سولہویں صدی میں دیکھنے والوں کے سامنے صرف تین بڑے نام آئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ سائنسی علوم کی بہاریں اپنے شباب پر نویں' دسویں اور گیارہویں صدی تک رہی' یعنی خلافت عباسیہ اور ہم عصر اندلس کی حکومت کے شباب کا زمانہ ہی ان علوم کی گرم بازاری کا زمانہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ حکومت کے اقتدار واستحکام سے علوم نقلیہ کا استحکام وابستہ ہے' گرچہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ علوم نقلیہ کے استحکام سے حکومتیں بھی مستحکم رہیں۔

یہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ جب فکر واجتہاد کا ملکہ باقی نہیں رہا تو مسلمانوں کے ذہن کی قوت' دماغ کی بالیدگی' طبیعت کی جولانی اور جدت وابتکار کی ساری صلاحیت ختم ہوگئی۔ جمود وتعطل اور تقلید' ذہن ودماغ پر چھا گئی' علم وفن کے کسی زاویہ اور گوشے میں نئے پہلو نہیں رہے' بنی بنائی دیوار کی لیپا پوتی ہوتی رہی' اب جو اکتسابات سامنے آتے یا جو کتابیں لکھی جاتی تھیں ان میں نہ کوئی اختراع وجدت ہوتی نہ ایجاد واپچ۔ جب علم ونظر' فقہ واستدلال اور اجتہاد وایجاد کی قوت رخصت ہوئی تو مسلمان علوم وفنون میں زوال کی حد انتہا کو پہنچ گئے۔

یہ سب درست لیکن ایسا کیوں ہوا؟ اس کا تسلی بخش جواب تلاش کرنا اب بھی باقی ہے۔ ویسے یہ کہا جاتا ہے کہ فقہ وکلام کے مختلف مکاتب فکر پیدا ہوئے۔ ان کے باہمی اختلاف نے جنگ وجدال کی شکل اختیار کر لی' فرقہ آرائی اور تحزب نے جمعیت اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کر دیا' علماء اور تعلیمی مراکز کسی ایک فقہی وکلامی مسلک سے وابستہ ہوگئے اور پھر اسی مسلک کی کتابوں اور درس گاہوں کے اندر مقید ومحصور ہو کر رہ گئے۔

یہ سب علوم دینیہ ونقلیہ کے زوال کے بارے میں کہا جاسکتا ہے لیکن وہ سائنسی اور عقلی علوم جو تاریخ انسانی میں نیا انقلاب برپا کر رہے تھے' ان میں کون سا باہمی اختلاف یا مسلک کا معاملہ تھا جو ان کے زوال کا باعث بنتا؟

ایک نکتہ البتہ قابل لحاظ ہے کہ اس زوال کی وجہوں میں یہ بھی ہے کہ علوم وفنون کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا' جس سے ان کی ترقی و

وسعت کی راہ بند ہوگئی' سوال یہ ہے کہ مختلف خانوں میں بانٹنے کا یہ عمل کس کی جانب سے ہوا؟

مولانا ابوالکلام آزاد نے تفسیر ترجمان القرآن میں ایک جگہ لکھا کہ:

''چوتھی صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہوگیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ وہ عام شاہ راہ تقلید کی شاہ راہ ہوگئی''۔

یہاں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ المیہ علوم اسلامیہ کے ساتھ پیش آیا اور لوگوں نے اس کا جائزہ لیا تو اس کے اسباب میں نصاب تعلیم کی نشاندہی کی۔

نصاب تعلیم کی بحث میں طریقہ تعلیم کا ذکر بھی کیا جاتا ہے کہ جب علمی عروج کا دور تھا تو لکچر کا طریقہ عام تھا۔ بعد میں یہ طریقہ متروک ہوگیا۔ اب تعلیم کا انحصار صرف کتابوں پر رہ گیا' ذہن و دماغ کے وہ دروازے جو درس کے وقت استاد کی آواز سے کھلتے تھے اب بند ہی رہ گئے۔ اس طرز تعلیم کے متعلق یہ بھی کہا گیا کہ اگرچہ طلبہ کو اس سے کچھ خاص کتابوں سے واقفیت ہو جاتی تھی لیکن وہ نفس علوم سے بے بہرہ رہ جاتے تھے' چند کتابوں کا علم اور ہے اور نفس علم وفن کی تحصیل اور ہے' دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس کی ایک مثال بعد کے نصاب میں شامل فن تفسیر کی دو کتابوں بیضاوی اور جلالین سے دی گئی کہ طلبہ و مدرسین کی ساری صلاحیتیں ان کی مجمل اور پیچیدہ عبارتوں کو حل کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ قرآن کے حقائق و معارف تو دور کی بات ہے ان میں قرآنیات کا ذوق بھی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔

نویں دسویں صدی عیسوی تک یہی طرز رائج ہو چکا تھا' زوال کا ایک سبب یہ بھی بنا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ درس میں داخل کتابوں میں مخلوط فنون ہوا کرتے تھے' ان کی تعلیم کا بوجھ غالب آیا' جیسے منطق کی کتابوں الٰہیات و مابعد الطبیعیات کے مباحث عام طور پر شامل کیے گئے' فلسفہ کے ایک مبتدی طالب علم کے لیے الٰہیات وطبعیات کا یہ اختلاط الجھن کا باعث بنتا ہی تھا۔ اس سے بھی زوال علم میں اضافہ ہوا' یہ بھی کہا گیا کہ اس دور میں یہ بھی ہوا کہ نفس مسائل سے زیادہ لفظی مباحث اور کتاب کی عبارت پر زور دیا گیا۔ اسی بنا پر متون' حواشی اور شرحیں لکھنے کا عام رواج ہوا' اور جیسے جیسے علمی تنزل بڑھتا گیا' شرح نویسی اور حاشیہ نگاری بھی حد اعتدال سے تجاوز کرتی گئی جو علم وفن کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوئی' متن بھی غیر معیاری یوں لکھے گئے کہ وہ مختصر' پیچیدہ اور مشکل سے سمجھ میں آنے والے تھے' اس لیے جب ان کی شرحیں لکھی گئیں تو نفس مضمون تو غائب ہوگیا' سارا زور عبارتوں' الفاظ' ضمیروں کے حل اور ان کے مرجع کی تلاش پر صرف ہونے لگا۔ غرض اس طرح کی موشگافیاں عام ہوگئیں' کہتے ہیں کہ یہ علمی تنزل کا پہلا دن تھا۔

ایک جگہ کہا گیا کہ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ منتخب اور بنیادی کتابیں نکال باہر کی گئیں' چنانچہ معانی و بلاغت کے لیے مختصر المعانی اور مطول' جیسی کتابیں نعمت غیر مترقبہ سمجھ لی گئیں ان کو پڑھا لینا ہر کس و ناکس کے لیے اس لیے آسان ہوا کیوں کہ ان کے بیسیوں حواشی اور شرحیں موجود تھیں' اس کے بالمقابل عبدالقاہر جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ جو فن بلاغت کی جان ہیں اس لیے داخل درس نہ ہوسکیں کہ ان کو پڑھنے پڑھانے سے لوگ عموماً عاجز و قاصر تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مروجہ نصاب میں اصلی اور مقصود بالذات علوم کی اہمیت بہت کم اور علوم آلیہ کی کتابوں کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

علامہ شبلی نے لکھا کہ:

''اس بات نے تعلیم کو بہت ابتر کر دیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق وغیرہ ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ ان ہی کی نذر ہو گیا اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصود تھی، ان پر پوری توجہ ہو سکتی۔''

اب تک کی بحث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ منطق، صرف و نحو، بلاغت جیسے مضامین میں پستی ان کے نصاب اور طریقہ تعلیم و تدریس کی وجہ سے آئی، لیکن علوم عقلیہ کے زوال کا بھی کیا یہی سبب ہے یا پھر کچھ اور، اس سوال کا تسلی بخش جواب اب بھی نہیں ملتا۔ ہاں علامہ شبلی کے قول میں اشارہ ضرور ہے کہ جن علوم کی تکمیل مقصود تھی یا ہمارے لحاظ سے جن علوم عقلیہ و سائنسیہ کی تعلیم مقصود تھی، ان پر پوری توجہ نہیں دی جا سکی، ایک اور بات بھی ہے کہ شروع زمانہ میں علوم و فنون، دین و مذہب ہی کا جز و سمجھے جاتے تھے، فلسفہ تک علم کلام بن کر مذہبی علوم میں شامل ہو گیا، اسی طرح تقریباً ہر علم و فن مذہبی دائرے میں شامل تھا، مذہبی آمیزش سے سائنسی علوم بھی ذوق و شوق سے حاصل کیے جاتے تھے، مگر بعد میں اس کے بجائے ان علوم کو پیشہ اور رزق و معیشت کا سبب اور وسیلہ بنا لیا گیا تو اس کی وجہ سے کئی خرابیاں رونما ہوئیں اور اسی سے علم و فن پر زوال آ گیا۔

مذکورہ خیال خود محل بحث ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سائنسی علوم یا عقلی علوم، وسیلہ معیشت بن گئے تو وہ کون سی خرابیاں تھیں جن سے ان پر زوال آ گیا۔

زوال علم کے اسباب میں یہ بھی سامنے آیا کہ جب مسلمانوں کا زریں تعلیمی یا علمی دور تھا تو علم و فن پر کسی خاص گروہ یا فرقے کی اجارہ داری نہیں تھی، ہر طبقہ اور ہر فرقہ میں تعلیم کا عام رواج تھا، جن کو آج معمولی اور ادنی طبقہ کہہ دیا جاتا ہے ان میں بھی اصحاب علم و فن بلکہ ارباب کمال پیدا ہوتے تھے، دوسری طرف امراء کا گروہ بھی علم و فن کا دلدادہ ہوتا تھا۔ بعد کے زمانہ میں جب علم پیشہ بنا اور مخصوص طبقوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی تو کئی طبقوں سے علم غائب ہو گیا۔ اسی طرح دور عروج میں مسجدوں، درس گاہوں اور علماء کے حلقوں میں ہی علم محدود نہیں تھا بلکہ بازاروں اور شاہی ایوانوں میں بھی اس کا چرچا تھا، وزیر، افسر، فوجی حکام، اپنے فرائض کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کا کام بھی کرتے تھے، بو علی سینا وزیر تھے، مگر طلبہ کا ایک گروہ مستقل ان کے پاس حاضر رہتا تھا، لیکن جب علم پیشہ بن گیا تو مخصوص طبقوں کی اجارہ داری میں آ کر مدرسوں میں سمٹ گیا، انحطاط علم کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

ایک اور وجہ بھی بیان کی گئی کہ شروع میں تعلیم میں آزادی تھی یعنی کسی مقررہ نصاب کی پابندی نہیں تھی، ہر شخص جس فن خاص کو چاہتا تھا، حاصل کر سکتا تھا، لیکن جب مدرسے قائم ہوئے اور ایک مقررہ نصاب کی تعلیم اور مقررہ مدت میں اس کی تکمیل ضروری قرار پائی تو طالب علم کو ان فنون کی تحصیل کے لیے مجبور ہونا پڑا جن سے ان کو مناسبت نہیں تھی، جب ذوق اور دلچسپی کا فقدان ہوا تو توجہ لامحالہ کم ہوئی ایسی صورت میں علم و فن کی ترقی کی رفتار کو رکنا ہی تھا۔

اور بھی اسباب بیان کیے گئے جیسے پہلے امراء اور حکومت کے ذمہ دار علم کی سرپرستی ہی نہیں کرتے تھے خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور رتبہ شناس ہوتے تھے، وہ علماء اور ارباب فضل و کمال کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے، اس وجہ سے لیاقت و شہرت پیدا کرنے کا لوگوں میں جذبہ ابھرتا تھا، لیکن جب امراء و روساء قدر شناس نہیں رہے بلکہ علماء و فضلا کو اپنے غلط کاموں یا مطلب کے لیے استعمال کرنا شروع کیا گیا تو

ان کی قدر و قیمت کم ہوئی اور نتیجہ میں علم وفن کا معیار پست ہوا۔

یہ اور اس قسم کے اور بھی اسباب بیان کیے گئے ہیں لیکن سچ بات یہ ہے کہ ان اسباب سے علوم عقلیہ اور سائنسی فنون پر جو اتنا بڑا زوال آیا اس کی وجہ اور معقول وجہ اب بھی سامنے نہیں آئی۔

ہاں یہ جو کہا گیا کہ مذہبی طبقوں' علماء کی قدامت پسندی اور سخت گیری بھی علمی تنزل کا سبب بنی' کیونکہ مسلمانوں میں علوم کی بنیاد مذہب کی زمین پر رکھی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مذہبی پیشواؤں کی اجتہادی راہیں جدھر رخ کرتیں' علوم کی اہمیت بھی اسی جانب اپنا رخ کر لیتی۔ چنانچہ علماء اور مذہبی لوگوں نے بہت سے علوم کو مذہب کے خلاف بتا کر ان کے حصول سے لوگوں کو روکا' بالکل اسی طرح جس طرح کبھی عیسائیوں نے کیا تھا اور جدید علوم کی مخالفت کی تھی' گلیلیو جیسے سائنس داں کو آخر تختہ دار پر کن لوگوں نے چڑھایا' وہی مزاج مسلمانوں کے بعض مذہبی حلقوں میں بنا۔ نویں صدی عیسوی میں خلیفہ معتضد نے کتب فروشوں کو فلسفہ کی کتابیں بیچنے سے روک دیا تھا' بارہویں صدی عیسوی میں ابن رشد کو اپنی کتابوں سے اس لیے خود انکار کرنا پڑا کہ خاندان عبدالمومن نے ان کتابوں کے لکھے جانے پر اس کو قید کر دیا تھا۔

اسباب جو بھی ہوں اور جتنے بھی ہوں' ان کے اثرات نے جہاں عام طور پر تعلیم کے معیار کو متاثر کیا، اس اثر پذیری میں دینی علوم پیش پیش رہے' یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عقلی علوم کے انحطاط میں یہی اثرات کارفرما رہے۔ خاص طور پر مذہبی علماء کی سخت گیری اور دین و مذہب کی تنگ ذہن ترجمانی نے مسلمانوں کے قافلہ سائنس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں کہ اس کی منزل ہی اس سے اوجھل ہوگئی' لیکن ایک بڑی وجہ اور بھی ہے، جس کو کچھ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ' جس طرح کی تاتاریوں نے بغداد کے کتب خانوں کی بیش قیمت کتابوں کو را کھ بنا کر دریا برد کیا اور اندلس وصقلیہ سے مسلمانوں کو جس بیدردی سے نکالا گیا' ان کا قتل عام ہوا اور سولہویں صدی تک جس طرح مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری قوت گھٹتی چلی گئی اس کے بعد ان کے لیے شاید یہی بہت تھا کہ وہ بچی کچی کتابوں کو سینے سے لگائے رکھیں' مخطوطات کی شکل میں جہاں جائے امان ملی ان کو محفوظ کیا گیا' لیکن ان کو پڑھنے والے اور پڑھانے والے جا چکے تھے۔ سیاسی زوال نے عوام کو دنیا سے بے رغبت کرنے میں مدد کی' جب دنیا سے دل اچاٹ ہوا تو دنیوی علوم کی شکل میں دیکھے جانے والے عقلی و سائنسی علوم سے رغبت ہی نہیں ہٹی' ان سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی' اب یہ تاریخ ہی سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو عافیت اور امن پسندی اور گوشہ نشینی کے نام پر ترک دنیا کی تلقین کرتے کرتے خود اپنی تاریخ کے عروج و زوال کے اسباب سے چشم پوشی کرتے رہے۔ نتیجہ تاریخ نے پیش کر دیا کہ سولہویں صدی سے بیسویں صدی تک اسلام اور اسلامی علوم وفنون کو غیر اہم بتایا جاتا رہا' غیروں کے ساتھ اپنے بھی اس جرم میں شریک ہوگئے۔ یورپ نے مسلمان سائنسدانوں اور علوم عقلیہ کے مسلم ماہروں کو یوں یاد کیا کہ ان کے نام کے ہجے تک مسخ کر دیے۔

ایک مصنف نے ایسے کئی نام شمار کیے ہیں، جیسے: البتانی کو Albategnius ، ثابت بن قرہ کو Thebit' عبدالرحمٰن الصوفی کو Azophi' ابن الہیثم کو الہازن، الزرقالی کو Arzachel' جابر کو Geber' البطروجی کو Alpetragius کے ناموں سے لکھا گیا۔

یورپ کی بالادستی نے آج مسلمانوں کی سائنسی خدمات پر پردہ ضرور ڈال رکھا ہے' لیکن اکیسویں صدی میں ایک بار سولہویں صدی سے پہلے کے ماحول کی روشنی محسوس کرنے کے کچھ اسباب نظر آنے لگے ہیں' ایک مجلّہ کے خاص نمبر میں سولہویں صدی عیسوی کے بعد بیسوی صدی کا عنوان یہی بتاتا ہے کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں' سر شاہ سلیمان' ڈاکٹر ضیاء الدین' میاں افضل حسین' ڈاکٹر ولی حمد' ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

'ڈاکٹر رضی الدین صدیقی' حکیم محمد سعید' حکیم عبدالحمید' ڈاکٹر عبدالقدیر' ڈاکٹر آئی۔ ایچ عثمان اور ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام جیسے طب' ریاضی' طبعیات' زراعت' حیوانیات' کیمیا' ایٹم اور میزائیل ٹکنالوجی کے ماہرین نے مستقبل میں اسلام کے اس پہلو کو زندہ اور روشن دیکھے جانے کے امکانات پیدا کر دیے ہیں۔

بہت پہلے یعنی 1922ء میں 'اسلام کا اثر یورپ پر' کے عنوان سے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی' جو مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر بہترین اور مفید ترین کتاب ہے' اس میں قاضی صاحب نے اپنے دعووں کو خود یوروپین مورخوں کے اعترافات سے ثابت کیا ہے۔

اس کتاب کا آغاز لیبان کے اس قول سے کیا گیا ہے کہ:

> ''کسی قوم کو برباد کر دینا' اس کی کتابوں کو جلا دینا' اس کی یادگاروں کو منہدم کر دینا' ممکن ہے' لیکن جو کچھ اثر وہ قوم چھوڑ گئی ہے وہ کانسی کی بنیادوں سے بھی زیادہ مضبوط ہے' انسان کی قوت اس کو اکھیڑ نہیں سکتی اور صدیوں کی صدیاں بھی بہ مشکل اس کو مٹا سکتی ہیں''

4.9 خلاصہ

قرآن کریم ہی پہلی ایسی آسمانی کتاب ہے جس میں مظاہر قدرت کا بغور مطالعہ کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا حکم دیا گیا۔ تفکر' تدبر' تعقل' شعور و نظر جیسے الفاظ کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہوا ہے۔ اس کائنات کے ذرہ ذرہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

قرآن مجید کا ایک مقصود یہ سامنے آتا ہے کہ زمین پر اللہ کی خلافت کا فریضہ انجام دینے' انسان دشمن طاقتوں کو پسپا کرنے اور حقیقی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے اس دنیا یا کائنات سے بھی یقین واعتماد کی دولت حاصل کر کے ایمان بالغیب کو مزید مستحکم کیا جائے۔ اور یہ چیز مشاہدہ اور غور وفکر ہے' موجودہ لفظ سائنس کی بنیاد بھی ان ہی دو چیزوں پر ہے۔

خالد بن یزید بن معاویہ نے سائنسی اور عقلی علوم کے سنجیدہ مطالعہ اور کائنات کے مشاہدے کا جو فریضہ انجام دیا گیا' وہ ہماری تاریخ کا ایسا حصہ ہے جس کو اسلام کی تاریخ سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا' اسلام کی ہر صدی میں کچھ نام موجود ہیں جو سائنسی یا عقلی علوم کے ارتقائی سفر کے سنگ میل ہیں۔ آٹھویں صدی سے سولہویں صدی تک علمائے اسلام کی ایسی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے جنہوں نے علوم عقلیہ کے میدان میں زبردست خدمات انجام دیں لیکن سولہویں صدی کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ اور امت مسلمہ زوال کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس زوال کے مختلف اسباب تھے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ مسلمان علماء بالفاظ دیگر علوم عقلیہ کے ماہرین نے جس قدر علوم مابعد الطبیعیات اور یونانیوں کی الٰہیات کی طرف توجہ کی' اس قدر علوم طبیعیہ اور علمی اور نتیجہ خیز فنون کی طرف توجہ نہیں کی۔

زوال علم کے اسباب میں یہ بھی سامنے آیا کہ جب مسلمانوں کا زریں تعلیمی یا علمی دور تھا تو علم وفن پر کسی خاص گروہ یا فرقے کی اجارہ

داری نہیں تھی' ہر طبقہ اور ہر فرقہ میں تعلیم کا عام رواج تھا' جن کو آج معمولی اور ادنی طبقہ کہہ دیا جاتا ہے ان میں بھی اصحاب علم وفن بلکہ ارباب کمال پیدا ہوتے تھے' دوسری طرف امراء کا گروہ بھی علم وفن کا دلدادہ ہوتا تھا۔ بعد کے زمانہ میں جب علم پیشہ بنا اور مخصوص طبقوں کی اجارہ داری قائم ہوگئی تو کئی طبقوں سے علم غائب ہوگیا۔ اسی طرح دور عروج میں مسجدوں' درس گاہوں اور علماء کے حلقوں میں ہی علم محدود نہیں تھا بلکہ بازاروں اور شاہی ایوانوں میں بھی اس کا چرچا تھا' وزیر' افسر' فوجی حکام' اپنے فرائض کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کا کام بھی کرتے تھے' بوعلی سینا وزیر تھے' مگر طلبہ کا ایک گروہ مستقل ان کے پاس حاضر رہتا تھا' لیکن جب علم پیشہ بن گیا تو مخصوص طبقوں کی اجارہ داری میں آ کر مدرسوں میں سمٹ گیا۔

اس اقتباس کو پوری بحث کا خلاصہ سمجھنا چاہیے کہ

''دنیا بدلتی رہتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے' یہ قدرت کا اٹل قانون ہے' اگر آئندہ کوئی مورخ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا معائنہ کرنے کے بعد یہ کہے کہ یورپ کسی بات میں ان کا گراں بار احسان نہیں ہے تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہوگی' ہمارے حال کو ماضی سے مطابق کرنا اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یورپ اپنے تمدن وتہذیب کے لیے اہل اسلام کا رہین منت نہیں ہے ایک عاجلانہ اور بعید از غور وفکر کام ہے' اقوام یورپ کی ترقی یافتہ زندگی کے کسی شعبہ عمل کی جانچ کرو تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ وہ ان ہی مسلمانوں سے ماخوذ ہے جو نفرت وحقارت سے دیکھے جاتے ہیں' حاشا' ہم مسلمانوں کو یورپ کے تمام علوم وفنون کو ترقی دینے پر کسی قسم کا رشک وحسد نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ان کا سنگ بنیاد نصب کرنے والے ہم ہی تھے''۔

4.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجیے۔

1. سائنسی علوم سے کیا مراد ہے؟ بیان کرو۔
2. اسلام میں سائنس کا سفر کس طرح جاری رہا؟
3. مسلمانوں میں سائنسی علوم کا زوال کیوں ہوا' اسباب کیا ہے؟

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. سائنس کے بارے میں قرآن نے کیا تصور پیش کیا ہے؟
2. چند اہم مسلم سائنسدانوں کا تذکرہ کیجیے۔
3. بیسوی صدی میں سائنسی ارتقاء کے امکان پر گفتگو کیجیے۔

4.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. مسلمانوں کی تعلیم — مولانا ضیاء الدین

.2	مسلمانوں کے سائنسی کارنامے	ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی
.3	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
.4	تفہیمات (مسلمان اور سائنس)	سراج الدین ندوی
.5	اسلام کا اثر یورپ پر	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

بلاک : 2 علوم وفنون میں مسلمانوں کا حصہ

فہرست

اکائی 5: طب، کیمیا، حیوانات، نباتیات

اکائی کے اجزاء

5.1 مقصد

اسلام نے اپنے پیروؤں میں تحقیق و دریافت کا مزاج پیدا کیا، اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ جلد ہی مسلم ملکوں میں طب، کیمیا، حیوانات اور نباتات کی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے، مسلم ملکوں میں اطباء، کیمیادانوں، ماہرین حیوانات و نباتات پیدا ہوئے، جنہوں نے بیش بہا تحقیقات اور اختراعات سے ان علوم میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اس کو اس بلندی تک پہنچا دیا جس کی بنیاد پر یوروپ نے ان علوم کی موجودہ عمارت کھڑی کی۔ ہم اس اکائی میں ان علوم کے تدریجی ارتقا کو دیکھیں گے، اور مسلم علماء کی خدمات کا جائزہ لیں گے۔

5.2 تمہید

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ ہم اسلام کے ابتدائی دور سے لیکر زریں دور اور مابعد زریں دور میں طب، کیمیا، حیوانات اور نباتیات کے میدانوں میں اسلامی ملکوں میں ہونے ہونے والی ترقیات کو جانیں، اس اکائی کو پڑھنے کے بعد ہم ان نامور مسلم اطباء، کیمیاداں، ماہرین حیوانات و نباتات کے بارے میں جانیں، جنہوں نے یونانی، ہندی اور دیگر تہذیبوں سے گذشتہ علوم کے دفینے حاصل کئے، ان میں اضافہ کیا، اور اپنی بیش بہا تحقیقات سے اس کو مالا مال کیا۔ ہم ان کی کتابیں، آلات، تجربات اور ان علوم کی ترقی میں مسلمانوں کی حصہ داری کو جان سکیں گے۔

5.3 علم طب (Medicine)

5.3.1 علم طب ابتدائے اسلام میں

علم طب کا شمار ان علوم میں ہوتا ہے جو انسانی معاشرہ کی بنیادی ضرورتوں میں شامل ہیں، انسان اور طب دونوں کا وجود لازم وملزوم ہے، اسلام سے پہلے علم طب نام تھا جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے کا، بیماریوں کو بلائیں سمجھ کر ان کا علاج کاہنوں اور جادوگروں سے کرایا جاتا تھا،

طبابت ایک ایسا پیشہ تھا جو نادر تھا، اور بڑے بڑے علاقوں میں چند ہی اطباء مل پاتے تھے۔

اسلام نے شروع سے پیشۂ طب کی ہمت افزائی کی، اور علم طب کا رشتہ آسمان سے جوڑا، رسول اللہ ﷺ نے ہر مرض کو قابل علاج بتایا، فرمایا: ''ما أنزل اللہ داء الا أنزل لہ دواء''، ''اللہ نے جو بیماری بھی نازل کی تو اس کے ساتھ اس کی دوا اور علاج کو بھی نازل فرمایا'' (صحیح البخاری عن ابی ہریرہ)، رسول اللہ ﷺ نے ماہر اطباء سے علاج کروانے کی طرف رہنمائی کی، حارث ابن کلدہ عرب کا ایک مشہور طبیب تھا، جو مسلمان نہ تھا، آپ ﷺ نے اپنے مریضوں کو اس کے پاس بھیجا (ابوداود: باب فی تمر العجوہ، عن سعد)، اور یہ بھی فرمایا کہ ''جو شخص طب میں مہارت نہ رکھتے ہوئے لوگوں کا علاج کر کے اگر نقصان پہونچاتا ہے، تو وہ ضامن ہوگا'' (ابوداود: باب فی من تطبب بغیر علم)، یعنی اس پر جرمانہ اور سزا جاری ہوگی۔ کتب حدیث میں ''کتاب الطب'' کے نام سے مستقل ابواب محدثین نے قائم کئے ہیں، اور طب سے متعلق احادیث کا خاصہ ذخیرہ اس میں جمع کیا ہے۔ ان میں ہم کو متعدد بیماریوں کے نام اور طریقہ علاج مل جاتے ہیں، بلکہ ''الطب النبوی'' کے نام سے دسیوں کتابیں علماء اور اطباء نے تصنیف کی ہیں۔

5.3.2 طبی کتابوں کے ترجمہ کا آغاز

اسلام سے پہلے دنیا میں جو تہذیبیں گذری ہیں ان میں ہندوستان اور یونان کے حکماء اپنی شہرت رکھتے تھے، یونانی حکماء میں بقراط، سقراط، ارسطاطالیس، جالینوس وغیرہ متعدد اطباء گذرے ہیں، جن کی کتابیں یونان اور روم سے مسلمانوں کے پاس آئیں، ابتدائی دور کے اطباء جو عالم اسلام میں ہوئے ان میں عرب اطباء میں ہم کو حارث کے علاوہ ابن ابی رمثہ تمیمی اور قبیلہ بنی اور کی ایک طبیبہ زینب کا بھی ذکر ملتا ہے، اس طبیبہ کو علاج معالجہ کے امور، زخموں کی مرہم پٹی اور خصوصاً آنکھ کے امراض میں مہارت تھی، اور وہ اس حوالہ سے عرب میں مشہور تھی۔ غیر عرب اطباء میں ابن اثال دمشقی اور عبدالملک بن ابجر کنانی وغیرہ کے نام ملتے ہیں، اول الذکر حضرت معاویہ کے طبیب خاص تھے، اور نصرانی المذہب تھے، مفرد اور مرکب دواؤں کے خواص اور ان کو بنانے میں مہارت رکھتے تھے، اس وجہ سے معاویہ ان کو بہت قریب رکھتے تھے اور اکثر ان سے گفتگو کرتے تھے۔ ثانی الذکر یعنی ابن ابجر اسکندریہ کے رہنے والے تھے، اور وہاں طب کی تعلیم دیتے تھے، جب مصر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو ابن ابجر نے عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، جو مصر کے گورنر تھے، خلیفہ بننے کے بعد وہ ابن ابجر سے اپنا علاج کرواتے، اور طبی امور میں ان کی رائے پر اعتماد کرتے تھے۔

عباسی دور میں جندی سابور کے سریانی اطباء نے کافی خدمات انجام دیں، اور عالم اسلام میں طب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، جندی سابور میں اس وقت ایک اسپتال اور طب کا مدرسہ تھا، جہاں جورجیس نامی طبیب اپنی ماہرانہ خدمات انجام دیتے تھے، ابوجعفر منصور ایک مرتبہ بیمار ہوا تو اس نے جندی سابور سے جورجیس بن جبریل کو بلا بھیجا، اور اس کے ساتھ نہایت اکرام کا معاملہ کیا، ایک مدت تک اس نے منصور کی خدمت کی، طب میں اس کی تصانیف میں سے کتاب ''الکناشہ'' کا ذکر مؤرخین نے کیا ہے، جس کو حنین بن اسحاق نے عربی کا جامہ پہنایا۔

جورجیس کے بیٹے بختیشوع کو ہارون رشید نے بغداد آنے کی دعوت دی، اور اس کو رئیس الاطباء کا لقب عطا کیا، اس نے مختصر کتاب الکناشہ اور کتاب التذکرہ تصنیف کی، ہارون الرشید کے دربار سے ابوقریش عیسی، عبداللہ طیفوری وغیرہ اطباء بھی وابستہ تھے۔ ابوعیسی قریشی دوا ساز تھا، جو مہدی، ہادی اور ہارون کے لشکر میں ساتھ رہتا تھا، تاریخ میں اس کے کئی قصے بادشاہوں کے ساتھ کے لکھے ہیں، عبداللہ طیفوری طبیب

تھا، اوراس نے بھی متعدد خلفاء کے دربار سے وابستہ رہ کر خدمات انجام دیں۔ بختیشوع کا لڑکا جبرئیل بھی علم طب میں مہارت رکھتا تھا، خلفاء اور وزراء کی خدمت میں رہا، ہارون ہی کے زمانہ میں اس کو شہرت نصیب ہوئی، امین اور مامون کے دربار سے بھی وابستہ رہا۔

حنین بن اسحاق بھی ایک مشہور طبیب تھا، جو یونانی، سریانی اور فارسی زبانوں کا ماہر تھا، یہ اصلا نصرانی عرب تھا، عربی زبان کی تعلیم خلیل بن احمد فراہیدی سے بصرہ میں حاصل کی، پھر یوحنا بن ماسویہ سے تعلق پیدا کیا، اس کے لئے رومی اور یونانی سے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا، اور علم طب میں مزید ترقی حاصل کی۔ مامون نے جب بیت الحکمت قائم کرنے کے لئے روم کے بادشاہ سے یونانی اور رومی کتابوں کے ذخائر منگوائے تو حنین ہی تھا جس نے بڑی تعداد میں ان کتابوں کو عربی میں منتقل کیا، خصوصا جالینوس کی کتابیں اسی کی اصلاح اور ترجمہ سے منظر عام پر آئیں، مامون سے متوکل تک خلفاء کے درباروں میں اس نے رسوخ حاصل کیا۔ ۲۶۴ھ میں انتقال ہوا۔ اس کی تصنیفات میں کتاب المسائل نامی کتاب ہے، جو علم طب میں مدخل کا کام دیتی ہے، ایک کتاب کتاب العشر مقالات فی العین ہے، جو آنکھ کے امراض وعلاج پر ہے، ایک کتاب کتاب التریاق ہے، جس میں دو مقالے ہیں، جالینوس کی کتابوں کے تراجم اور مختصرات بھی ہیں۔ اس کے مقالات، رسائل اور کتابوں کی تعداد ساٹھ تک پہونچتی ہے۔

حنین کا بیٹا اسحاق تھا، جس کے لئے حنین نے طب کی کئی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا، اور حنین کے بعد اسحاق کی شہرت ہوئی، اور علم طب میں کئی کتابیں اس نے تصنیف کیں۔

ان دونوں صدیوں میں علم طب پر مترجمین کا غلبہ رہا، جو عام طور سے عیسائی، یہودی، مجوسی یا صابئی مذہب کے ماننے والے تھے، لیکن جلد ہی مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ کی، ان علوم کو حاصل کیا، اور پھر اپنے اساتذہ سے بھی بازی لے گئے، ذیل میں مشہور مسلمان اطباء کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

5.3.3 زکریا رازی

ابو بکر محمد بن زکریا رازی 240ھ/854ء میں رئے میں پیدا ہوئے، جو ایران کے موجودہ دار السلطنت تہران کے قریب واقع ہے، یورپ میں ان کی شہرت ''Rhazes'' کے نام سے ہے۔ رازی بچپن میں ساز بجاتے تھے، بڑے ہو کر بغداد گئے، اور عقلی علوم کی طرف توجہ کی، کئی ملکوں کا سفر کیا، مختلف علوم میں مہارت حاصل کی، ریاضیات، فلسفہ، فلکیات، کیمیا، اور منطق وادب کا درس لیا، اور طب میں بڑا مقام پیدا کیا، علم طب میں علی بن ربن طبری کی شاگردی بھی اختیار کی، جو طب کی مشہور کتاب فردوس الحکمت کے مصنف اور عالی قدر طبیب تھے۔ ابو بکر رازی کے زمانہ میں بغداد کے بیت الحکمت کے فیض سے یونانی، ایرانی، ہندی اور مصری زبانوں کی طبی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا، ابو بکر رازی نے ان تمام اقوام کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور صرف تقلید پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے تجربات، ملاحظات، استخراج واستنباط کا راستہ اختیار کیا، یونانی طب جو علم طب کا اہم مرجع تھی، اس کی بنیاد تجربہ کے بجائے نظریات پر تھی، اطبائے یونان اس طریقہ کی پیروی کی وجہ سے طب کے فلاسفہ کہلاتے تھے، وہ حقیقی زندگی پر اپنے نظریات کا اطلاق کم ہی کرتے تھے، اس قاعدہ سے ابقراط اور جالینوس بھی مستثنی نہ تھے، لیکن محمد بن زکریا رازی نے علم کی بنیاد تجربہ پر رکھی، اور تجربہ کے مقابلہ میں نظریات کو رد کردیا، اور گذشتہ اطباء کی کتابوں پر تنقید کی، اپنی کتاب ''الشکوک والمناقضات التی فی کتب جالینوس'' میں انہوں نے مشہور یونانی طبیب جالینوس پر تنقید کی ہے۔ جس میں ان کی غلطیوں اور غلط ہونے کے اسباب

کو نیز اس کے مقابلہ میں صحیح تجربات کو ذکر کیا ہے۔اپنی کتاب الحاوی میں انہوں نے امراض اور ان کی تفصیلات کو ذکر کرنے کے بعد کئی جگہ ''تجارب المارستان'' کا عنوان قائم کر کے اسپتال کے تجربات کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ابو بکر رازی مریضوں سے بہت زیادہ سوال کرتے، مرض کے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات دریافت کرتے، ان کا مقولہ ہے: ''طبیب کو چاہئے کہ بیماری کے متعلق جو کچھ بھی اندرونی یا بیرونی اسباب ہوں ان کو مریض سے دریافت کرے، اور اس کو ہر گز ترک نہ کرے''۔اس کے بعد وہ مریض کی کیفیت دیکھتے، درجہ حرارت اور نبض کا معائنہ کرتے، اگر ضرورت ہوتی تو اسپتال میں داخل کر کے اپنی مسلسل نگرانی میں رکھتے، مرض کے اسباب معلوم کرنے اور علاج کی تشخیص کے لئے تمام معلومات نوٹ کرتے، ان کی کتابوں میں ہم کو مریض اور مرض کے متعلق باریک باریک باتوں کو اہمیت کے ساتھ نوٹ کرنے کے عجیب وغریب نمونے ملتے ہیں۔

البتہ ابو بکر رازی نے کتابوں کو بالکل ترک کرنے کی دعوت نہیں دی، بلکہ علم اور تجربہ دونوں کو جمع کرنے پر ابھارا ہے، ان کا قول ہے، جاہل اور مقلد اطباء، اور ایسے نو آموز طبیب جن کو تجربہ نہیں ہوتا قاتل ہوتے ہیں۔

ابو بکر رازی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حیوانات پر تجربے کئے، انہوں نے اس کے لئے بندروں کا انتخاب کیا، بعض دواؤں کو تجربہ کے لئے پہلے انہوں نے بندروں پر استعمال کیا، جب ان دواؤں کی صلاحیت اور ان کے اثرات کے سلسلہ میں اطمینان حاصل کر لیا تو انسانوں پر ان کو استعمال کیا۔الحاوی میں انہوں نے زہر کا ذکر کرتے ہوئے عنوان قائم کیا ہے: زہر کو دیکھنے یا کھانے سے حیوانات میں کیا علامتیں پائی جاتی ہیں، یہاں انہوں نے سات جانوروں کا ذکر کیا ہے، جن میں مور، شتر مرغ، کوا، بندر اور نیولا شامل ہیں۔

ول ڈیورانت نے قصۃ الحضارۃ میں لکھا ہے کہ رازی پہلے شخص ہیں جنھوں نے پارہ سے مرہم بنایا۔انہوں نے زخموں کو سینے کے لئے بلی کی آنتوں کا دھاگہ کے طور پر استعمال کیا۔انہوں نے سب سے پہلے شریان سے جاری ہونے والے خون اور ورید سے جاری ہونے والے خون کے درمیان فرق کیا، شریان سے جاری ہونے والے خون کو روکنے کے لئے انگلیوں کا اور ورید سے جاری ہونے والے خون کو روکنے کے لئے ان کو باندھنے کا طریقہ استعمال کیا۔

ابو بکر رازی نے سب سے پہلے چیچک اور خسرہ کی تعریف کی، عوام کے غلط اعتقادات اور شعبدہ بازوں کے خیالات کا انکار کرتے ہوئے حکیمانہ طریقہ سے ان امراض کی تفصیلات تحریر کیں، اور علاج بتایا، رازی کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے چیچک کا ٹیکہ ایجاد کیا۔انہوں نے ایک کتاب ان دونوں امراض چیچک اور خسرہ پر تصنیف کی، جو شائد اس موضوع پر سب سے قدیم ترین تصنیف ہے، اس کتاب کی مقبولیت اور شہرت کا یہ عالم ہوا کہ یہ کتاب یوروپ میں 1498 سے 1866ء کے درمیان چالیس مرتبہ چھپی۔لندن میں بھی طبع ہوئی، اور یوروپ کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ابو بکر رازی نے وراثتی متعدی امراض پر کلام کیا۔دواؤں کے تجربات میں جانوروں کو استعمال کیا، محمد بن زکریا رازی نے جڑی بوٹیوں کے علاوہ غیر نامیاتی مرکبات سے بھی تیار کیں، انہوں نے گندھک اور لوہے کے سلفائڈوں سے بھی کچھ دوائیں تیار کیں۔۔انہوں نے سب سے پہلے ٹھنڈے پانی سے بخار کا علاج کیا۔جرمن مصنف الماں (Ullmann) نے لکھا ہے کہ الرجی کے مرض کو دریافت کرنے والے پہلے طبیب رازی تھے، اس نے الرجی کا مرض گلاب کے پھول کے ذریعہ دریافت کیا، جو بعض اشخاص کو نزلہ، زکام میں مبتلا کر دیتا ہے۔رازی نے گلاب کے پھول کی الرجی کے بعد لہسن اور پیاز وغیرہ سے ہونے والی الرجی بھی دریافت کی، رازی نے تقریباً ڈیڑھ سو

امراض کے نام اور علاج بتائے ہیں۔

محمد بن زکریا رازی نباتات سے علاج کو دواؤں سے علاج پر ترجیح دیتے، طبیب کو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ: اگر تم غذا سے علاج کر سکو تو دوا سے مت کرو، اور اگر مفرد دوا سے علاج کر سکو تو مرکب دوا سے مت کرو۔

ابوبکر رازی کی تصانیف کی تعداد ابن ابی اصیبعہ نے دو سو سے زائد ذکر کی ہے، ان میں زیادہ مشہور کتاب ''الحاوی فی الطب'' یا ''الحاوی فی صناعۃ الطب'' ہے جو ان کی شہرت کا بڑا سبب ہے، اس کتاب میں انہوں نے یونانی عہد سے ان کے دور تک تمام طبی علوم و معارف کو جمع کیا ہے، یہ کتاب یورپ میں 400 سال تک مرجع بنی رہی، اور اس کے ترجمے لاطینی اور دیگر یوروپی زبانوں میں ہوئے۔ الحاوی فی الطب کی حیثیت ایک انسائیکلو پیڈیا کی ہے، جس میں یونانی، رومی، مصری، ہندی اور عربی اطباء کے علوم کا خلاصہ مذکور ہے، ساتھ ہی امام رازی نے اپنے دقیق ملاحظات و تجربات کو ذکر کیا ہے، اس کتاب میں طب کی تقریباً تمام اقسام کا ذکر ہے۔ اس کتاب کا لاطینی ترجمہ سب سے پہلے 1486ء میں اٹلی میں چھپا، لاطینی زبان میں اس کا نام Liber Centinens ہے۔ جو بعد میں بریشیا (Brascia) اٹلی میں دوبارہ طبع ہوئی۔ اس کتاب کا اصل نسخہ سات مخطوطات پر تصحیح کے بعد سب سے پہلے دائرۃ المعارف میں 1390ھ میں طبع ہوا، جو 24 جلدوں میں ہے۔

ان کی ایک اور کتاب ''کتاب المنصوری فی الطب'' ہے، جو آپ نے منصور بن اسحاق سامانی کے لئے تصنیف کی تھی، یہ کتاب دس جلدوں میں ہے، اور یہ بھی بہت عظیم اور مشہور کتاب ہے، اس کی افادیت کے پیش نظر گیراڈ کریمونا لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ کیا، اس کی نویں جلد جو یوروپ میں (Nonus Almansoris) کے نام سے جانی جاتی ہے، سولہوں صدی عیسوی تک طب کے طالب علموں کا مرجع بنی رہی۔

ایک کتاب ''کتاب صفۃ المارستان'' کے نام سے ہے، مارستان یا بیمارستان کا لفظ اسپتال (Hospital) کے لئے استعمال ہوتا تھا، اور عالم اسلام میں کئی شفاخانے مختلف بڑے شہروں میں قائم تھے۔ بغداد میں کئی سال علم حاصل کرنے کے بعد ابوبکر رازی اپنے وطن رئے واپس ہوئے، تو ان کو رئے کے مشہور اسپتال کا نگراں مقرر کیا گیا تھا، اور رئیس الاطباء منصب بھی عطا ہوا، رئے کا اسپتال عالم اسلام کے مشہور اور ترقی یافتہ اسپتالوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں ان کے فن کے جوہر کھلے، کئی پیچیدہ امراض کے علاج میں کامیاب ہوئے، ان کی شہرت پھلتی گئی، یہاں تک کہ معتضد باللہ نے ان کی مہارت و شہرت سن کر بغداد آنے کی دعوت دی، تاکہ وہ بیمارستان معتضدی میں رئیس الاطباء کا منصب سنبھالیں۔ تذکرہ نگاروں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ جب معتضد باللہ نے ان کو بیمارستان بنانے کا حکم دیا، تو انہوں نے اس کی جگہ کے انتخاب کے لئے ایک انوکھا طریقہ اپنایا، وہ اپنے شاگردوں کو لیکر بغداد کے مختلف حصوں میں گئے، اور الگ الگ مقامات پر گوشت کے ٹکڑے لٹکا دئے، چند دنوں بعد ان کا معاینہ کیا، اور جس جگہ کے گوشت میں سب سے کم خراب ہوا تھا، اس جگہ کو اسپتال بنانے کے لئے منتخب کیا۔

بیمارستان معتضدی دار الخلافہ بغداد میں عالم اسلام کا بلکہ دنیا کا سب سے بڑا اسپتال تھا، جہاں پچاس اطباء خدمت پر مامور تھے، یہ صرف اسپتال نہ تھا، بلکہ اعلی درجہ کا میڈیکل کالج تھا، جہاں علم طب کی مختلف شاخوں کے الگ الگ شعبے قائم تھے، جہاں ابوبکر رازی کو سب سے اونچا علمی مرتبہ حاصل تھا۔

محمد بن زکریا رازی کی علمی مجلس کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ مجلس میں تشریف لاتے، ان کے سامنے شاگردوں کا مجمع ہوتا، ان کے بعد

شاگردوں کے شاگرد بیٹھتے، اوران کے بعدان کے شاگرد ہوتے۔ مریض آکر سب سے پہلے ان سے ملتا، اگران کے پاس علم نہ ہوتا تو اگلوں سے ملاقات کرتا، اخیر میں محمد بن زکریا رازی کلام کرتے۔ وہ انتہائی ذہین وفطین شخص تھے، مریضوں سے نرمی سے پیش آتے، محنت سے ان کا علاج معالجہ کرتے، علم طب کی باریکیوں اور حقائق واسرار میں غور وفکر فرماتے، بقراط اور جالینوس کی کتابوں کا مطالعہ کرتے، وہ اپنے شاگردوں کو نصیحت کرتے کہ ان کا مقصد مریض کی شفایابی ہونا چاہئے، نہ کہ مریضوں سے مال کمانا۔ اور جس طرح امراء ووزراء کے علاج کا خیال رکھا جاتا ہے، فقراء کے علاج کا بھی پورا پورا خیال رکھنا چاہئے۔ خود امام رازی بھی مریضوں پر اپنا مال خرچ کرتے، فقراء کے علاج کی فکر ہی کی وجہ سے انہوں نے ایک کتاب تالیف کی جس میں امراض، ان کی علامتیں، ان کے علاج کے آسان طریقے اور ہر گھر میں عموماً دستیاب وسائل کا استعمال بتلایا ہے۔ اس کتاب کی شہرت ''طب الفقراء'' کے نام سے ہوئی۔

ان کا قول ہے: طبیب کو چاہئے کہ مریض کو صحت کی امید دلاتا رہے، اگر چہ کہ خود اس کو امید نہ ہو، کیوں کہ بدن کا مزاج نفس کے مزاج کے تابع ہوتا ہے۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ مریض کو کسی ایک قابل اعتماد طبیب سے ہی علاج کرانا چاہئے، جو شخص کئی طبیبوں سے علاج کراتا ہے وہ سب کی غلطیوں کا شکار ہوتا ہے۔

ابوبکر رازی کو اخیر عمر میں آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا، جب ایک جراح نے ان سے علاج کروانے کے لئے کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں دنیا کو بہت دیکھ چکا ہوں، اب مزید کی آرزو نہیں۔ 313ھ/925ء میں رئے میں وفات پائی۔

ول ڈیورانٹ نے لکھا ہے کہ رازی مسلمان اطباء میں سب سے بڑا طبیب تھا۔ جارج سارٹن نے تحریر کیا ہے کہ رازی صرف اسلام کا نہیں بلکہ قرون وسطی کا سب سے بڑا طبیب تھا۔ مغربی دنیا نے رازی کی کتابوں سے بہت فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے رازی کو جدید علم طب کا باوا آدم تسلیم کیا ہے۔

5.3.4 الشیخ الرئیس ابوعلی ابن سینا

آپ کا نام ابوعلی حسین بن عبداللہ ہے، شرف الملک آپ کا لقب ہے، علمی دنیا میں الشیخ الرئیس سے آپ کو یاد کیا جاتا ہے، لیکن شہرت ابن سینا کے نام سے پائی، جو آپ کے جداعلی کی طرف نسبت ہے، اہل یورپ میں ان کی شہرت Avicenna کے نام سے ہے۔

ابن سینا کی پیدائش ماوراء النہر کے مردم خیز قصبہ بخاری کے قریب افشنہ نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی، آپ کے والد عبد اللہ بلخ کے رہنے والے تھے، بلخ سے بخاری منتقل ہو کر والی بخاری نوح بن منصور سامانی کے یہاں ملازمت اختیار کی، اور خرمیثن نامی گاؤں میں تقرری ہوئی، عبداللہ نے قریبی گاؤں افشنہ میں شادی کی، اور وہیں 370ھ/980ء میں ابوعلی ابن سینا کی پیدائش ہوئی۔ اس کے بعد یہ خاندان بخاری منتقل ہو گیا، جہاں ابن سینا نے دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ ساتھ ہی عربی زبان وادب، ریاضی، جبر ومقابلہ اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ ابوعبداللہ ناتلی سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی، یہاں تک کہ اس میں استاذ سے بھی فوقیت لے گئے۔ اور فلسفہ کے علاوہ منطق، اقلیدس، اور مجسطی میں کمال حاصل کیا، اس کے بعد علم طب کی طرف توجہ کی، ابن سینا خود بیان کرتے ہیں: چوں کہ یہ مشکل فن نہ تھا؛ اس لئے میں بہت جلد اس میں ماہر ہو گیا، حتی کہ علم طب کے فضلاء میرے پاس آکر پڑھنے لگے، اور میں نے علاج معالجہ شروع کیا تو تجرباتی معالجہ سے اس قدر نفع ہوا

کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سال کی تھی۔

ابن سینا کے دست شفا کی شہرت پھیلتی گئی، اسی زمانہ میں والی بخاری نوح بن منصور کو ایسا مرض لاحق ہوا جس کے علاج سے اطبا عاجز ہو گئے، اور انہوں نے ابن سینا کا والی بخاری سے تذکرہ کیا، چنانچہ ابن سینا کو دعوت دی گئی، اور اس نے دیگر اطبا کے ساتھ مل کر اس کا علاج کیا، جس سے اس کو شفا ہو گئی، ابن سینا نے نوح بن منصور سے اس کا کتب خانہ دیکھنے کی خواہش کی، جس کو والی نے قبول کیا اور ابن سینا کو خزانہ ہاتھ آ گیا، والی بخاری کے کتب خانہ میں ہر علم وفن کی بے شمار نایاب کتابیں تھیں، جن سے ابن سینا نے استفادہ کیا، اور مختلف علوم میں کمال حاصل کیا۔

ابوعلی ابن سینا کی بقیہ زندگی سفر میں گذری، اور اس نے نسا، ابیورد، طوس، جاجرم اور جرجان میں امراء اور سلاطین کے درباروں میں خدمت کی۔ اور فلسفہ وطب میں کتابیں تصنیف کیں۔ اخیر میں رے منتقل ہوئے، اور وہاں مجد الدولہ اور اس کی والدہ کے مہمان بنے۔ ہمدان میں ابن سینا نے امیر ہمدان کا علاج کیا، جس کو قولنج کا مرض لاحق تھا، جس کے صلہ میں وزارت کا عہدہ دیا گیا۔ امیر ہمدان کی وفات کے بعد وہاں سے نکل کر اصفہان میں قیام کیا، علاء الدولہ والی اصبہان نے ان سے انتہائی تعظیم وتکریم کا معاملہ کیا۔ ابن سینا نے اپنی اکثر کتابیں یہیں تصنیف کیں، اور اپنی عمر کے اخیر تک یہاں مقیم رہے۔

علم طب میں ابن سینا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، کہا جاتا ہے کہ علم طب معدوم تھا، بقراط نے اس کو وجود بخشا، علم طب مردہ ہو چکا تھا تو جالینوس نے اس کو زندہ کیا، وہ متفرق تھا تو رازی نے اس کو جمع کیا، اور وہ ناقص تھا تو ابن سینا نے اس کو مکمل کیا۔ ابن سینا نے اگرچہ اپنی طب کی بنیاد بقراط اور جالینوس کے تجربوں پر رکھی، لیکن بہت سی جگہوں پر ان سے بنیادی اختلاف کیا، ان کی غلطیوں کو واضح کیا، مثلاً انہوں نے بصارت کے عمل میں آنکھ کے عدسہ سے زیادہ اس کے شبکیہ (Retina) کو زیادہ اہمیت دی۔ ابن سینا نے اپنی طب میں تجربہ کو بہت اہمیت دی، وہ خود کہتے ہیں: جب میں نے مریضوں کا علاج شروع کیا تو مجھ پر ایسے انکشافات ہوئے جن کو بیان نہیں کیا جاسکتا، ان تجربات اور سابقہ علم کی بنیاد پر انہوں نے اس علم میں مفید اضافے اور انکشافات کئے۔

شیخ الرئیس ابوعلی ابن سینا کے اکتشافات میں سے ایک اہم اکتشاف (اینکلوسٹوما) نامی طفیلیہ کی دریافت ہے، جس کو انہوں نے القانون فی الطب میں (الدود المستدیرہ) کہا ہے، اور پہلی مرتبہ تفصیل کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا، اور ان امراض کی نشاندہی کی جو اس کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد خلیل عبدالخالق نے مجلّہ الرسالہ میں تحریر کیا ہے کہ: میرے لئے شرف کی بات تھی کہ میں نے 1921 میں القانون فی الطب میں (الدود المستدیرہ) پر تحقیق کی، اور یہ بات سامنے آئی کہ الدود المستدیرہ وہی طفیلیہ ہے جس کو ہم اینکلوسٹوما (Ancylostoma) کہتے ہیں، اور جس کو دوبنی (Angelo Dubini) نے اٹلی میں 1838 میں دوبارہ دریافت کیا، یعنی ابن سینا کی دریافت کے تقریباً نو صدیوں بعد۔

ابوعلی ابن سینا نے چند مزید طفیلیوں کا پتہ لگایا، مثلاً فائلیر یاسس یا (Filariasis) کا طفیلیہ، جس کو عربی میں داء الفیل کہتے ہیں، اس کی وجہ سے پیروں پر اس قدر سوجن نمودار ہوتی ہے جو چلنے پھرنے سے معذور کر دیتی ہے۔

ابن سینا نے بعض متعدی امراض جیسے چیچک اور خسرہ کے پھیلنے کے طریقوں کو دریافت کیا، اور بتایا کہ یہ پانی اور ہوا میں موجود کچھ

انتہائی چھوٹے جانداروں کے ذریعہ سے منتقل ہوتا ہے جن کو ہم ننگی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔اس بات سے اٹھارویں صدی میں خوردبین کی ایجاد کے بعد ہی پردہ اٹھ سکا۔ابن سینا نے پہلی بار یہ بتایا کہ جنین کے مذکر یا مونث ہونے میں مرد کا دخل ہے نہ کہ عورت کا۔جس کی حال ہی میں جدید سائنس نے تصدیق کی ہے،اور قرآن میں بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

ابن سینا نے گردن توڑ بخار (Meningitis) کی سب سے پہلے وضاحت کی،انہوں نے بیرونی اسباب کی وجہ سے ہونے والے فالج اور اندرونی اسباب کی وجہ سے ہونے والے فالج کے درمیان تفریق کی،اور اسی طرح آنتوں کے درد اور گردوں کے درد میں فرق کو واضح کیا۔اسی طرح ابن سینا نے سب سے پہلے دواؤں کو غلاف میں بند کر کے مریض کو دینے کی سفارش کی۔ابن سینا نے مثانہ کی پتھری کا اور اس سے ہونے والی بیماریوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے،اور اس میں اور گردہ کی پتھری کی بیماریوں میں فروق کو واضح کیا۔ڈاکٹر خیر اللہ نے اپنی کتاب الطب العربی میں لکھا ہے کہ:"ویصعب علینا فی ہذا العصر ان نضیف شیئا جدیدا الی وصف ابن سینا لعراض حص المثانۃ السریری "۔اس دور میں بھی ہمارے لئے بہت مشکل ہے کہ مثانہ کی پتھری کے بارے میں ابن سینا کی دی ہوئی معلومات میں کوئی اضافہ کر سکیں۔

ابن سینا کو طب جراحی یا سرجری سائنس میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی،انہوں نے خون روکنے کے کئی طریقوں کو بیان کیا ہے،اور زخموں سے تیروں کو نکالنے کے طریقوں سے بحث کی ہے،اور معالجین کو خبردار کیا ہے کہ تیروں کو نکالتے وقت شرایین یا پٹھوں میں تیر لگنے سے احتیاط کریں۔

ابن سینا نے بعض نئے علاج بھی دریافت کئے،مثلاً نخاعی ڈور کے ذریعہ انیمیا کا علاج۔ابن سینا اپنی ان خصوصیات کے ساتھ آنکھ اور دانت کے امراض ومعالجہ کے ماہر تھے،اور انہوں نے بتایا کہ دانت کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے جو علاج کیا جاتا ہے اس کا مقصود مزید سڑاند کو روکنا ہے،جو دانت پر سے فاسد مادہ کی صفائی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔پھر ابن سینا نے دانت کے خلا کو بھرنے کے مختلف مادوں کا ذکر کیا ہے۔

علم طب میں ابن سینا کا مشہور کارنامہ ان کی شہرہ آفاق کتاب القانون فی الطب ہے،جس نے چھ صدیوں تک اہل یورپ کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھی،اور آج بھی اس کی افادیت برقرار ہے،اس کتاب کو ابن سینا نے پانچ حصوں یا ابواب میں تقسیم کیا ہے،پہلے حصے میں علم طب کے کلیات اور قواعد سے بحث کی ہے،دوسرے حصہ میں مفرد دواؤں کا ذکر ہے،تیسرے حصہ میں سر تا قدم انسانی اعضا میں سے ہر ہر عضو سے متعلق جزئی امراض کا تذکرہ کیا ہے،چوتھے حصہ میں ان امراض کا بیان ہے جو پیدا ہوتے ہیں تو ایک عضو کے ساتھ خاص نہیں رہتے،اور پانچواں حصہ اقرباذین یعنی دواؤں کی ترکیب وامتزاج،اور ان کے منافع سے متعلق ہے۔

کتاب کے اخیر میں ایک (1326) اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ ہے،جس میں القانون کے تمام موضوعات کا خلاصہ نظم کیا ہے،اس کی کئی شرحیں موجود ہیں،جن میں سے ایک ابو الولید ابن رشد اندلسی (ت: 595ھ) کی ہے،اس نظم کا متعدد یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔لاطینی زبان میں متعدد تراجم ہوئے ہیں،جن میں ایک (Cantics Avicennae) کے نام سیگر یرڈی کریمن کا ہے،جس کا فرانسیسی ترجمہ 1593 میں روم میں چھپا۔

القانون فی الطب کی کئی شروحات لکھی گئیں،خجندی نے اس کے پہلے حصہ کی شرح التنقیح المخزون لکتاب القانون کے

نام سے کی، پھر اس کو التلویح لاسرار التنقیح کے نام سے مختصر کیا، ابن النفیس علی بن ابی الحزم (ت:687ھ) نے شرح تشریح القانون، اور شرح معالجات القانون کے نام سے اس کے دو حصوں کی شرح کی، جو ابن النفیس کا شاندار کارنامہ ہے، اور موجز القانون کے نام سے اس کا اختصار کیا، قطب الدین ابراہیم بن علی المصری (ت: 681) کی شرح کلیات القانون کے نسخے بھی دستیاب ہیں، موفق سامری (ت:681ھ) نے شرح کلیات القانون لکھی، اسی طرح فخر الدین رازی، قطب الدین شیرازی، ابن القف الکرکی، اور سدید الکازرونی نے اس کی شرح کی۔ القانون کا (87) مرتبہ متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا، (15) مرتبہ لاطینی زبان میں اور ایک مرتبہ عبرانی زبان میں اس کی طباعت ہوئی، عربی زبان میں سب سے اول اس کی طباعت 1593 میں روم میں ہوئی۔ اور آج بھی اس کتاب کی طلب اور افادیت برقرار ہے۔

ابن سینا کو جو یگانہ روزگار حافظہ اور زبردست قوت فہم وادراک عطا ہوئی تھی اس کی بدولت انہوں ایسا بیش بہا علمی سرمایہ چھوڑا جس کی نظیر بمشکل تمام ہی مل سکے گی، ابن سینا عربی کے ساتھ فارسی میں بھی ماہر تھے، اور انہوں نے مختلف علوم میں درک حاصل کیا تھا، اس وجہ سے ان کی تصانیف کی بھی متعدد اقسام علوم میں ہیں، مثلاً: ادب، فلسفہ، منطق، ریاضی، نفسیات، موسیقی، علم الارض، فلکیات، طبعیات وغیرہ۔ شیخ الرئیس کی نے اکثر کتابیں کسی امیر، وزیر، استاذ یا شاگرد کی خواہش پر تصنیف کیں، اور بعض کتابوں کو جن کے مطالبہ پر تصنیف کیا تھا، انہوں نے اس سے استفادہ کو اپنی ذات تک محدود کرلیا، جس کی وجہ سے ان کی نقل نہ ہوسکی، اور وہ قیمتی علم ضائع ہوگیا۔ ابن سینا کو متعدد علوم پر دسترس حاصل تھی، اور ان پر ان کی تصنیفات ہیں، جن میں طبی علوم، ریاضیات، ادبی علوم، موسیقی، اور فلسفہ اہم ہیں۔ ابن سینا کی تصنیفات کی تعداد صحیح طور سے معلوم نہیں، یاقوت نے معجم الادباء میں کتابوں اور دس رسائل کا تذکرہ کیا ہے، عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں ان کی سو سے زائد تحریروں کا نام اور ان کی مختصر تفصیل یعنی تصنیف کا سبب اور مقام نیز کس عمر میں وہ کتاب تصنیف کی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

ابن سینا کی وفات ہمدان میں 428ھ/1037ء میں ہوئی۔

5.3.5 ابن الجزار قیروانی

ابو جعفر احمد بن ابراہیم چوتھی صدی ہجری میں شمالی افریقہ کے سب سے مشہور طبیب تھے، جن کو ابن الجزار قیروانی کے نام سے جانا جاتا ہے، قیروان عرب ملک تونس کا ایک شہر ہے۔ ابن الجزار کا گھرانہ علم طب میں پہلے سے شہرت رکھتا تھا، چچا محمد بن احمد قیروان کے مشہور طبیب تھے جنہوں نے طب میں کئی کتابیں تصنیف کی تھیں، والد بھی طبیب تھے، اپنے بھائی کے ساتھ طب کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ ابن الجزار نے والد اور چچا سے علم طب حاصل کیا، اسحاق بن عمران بغدادی کی جو قیروان کے مشہور طبیب اور کئی کتابوں کے مصنف تھے صحبت میں بھی رہے، اسحاق بن سلیمان اسرائیلی کی طب میں شاگردی اختیار کی، انہوں نے ان اساتذہ کی نگرانی میں تربیت پانے کے بعد تجرباتی طب کی طرف متوجہ ہوئے، اور طبیب حاذق کی حیثیت سے شہرت پائی، ابن جلجل نے لکھا ہے کہ ابن الجزار قیروانی نے کبھی چوک نہیں کی، اور نہ انہوں نے شہوت کی طرف توجہ کی۔ شمال افریقہ اور اندلس میں علم طب کی ترقی اور اس کو فروغ دینے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔

ابن الجزار قیروانی نے کئی کتابیں تصنیف کیں، ابن ابی اصیبعہ نے ان کی پچیس سے زائد تصانیف کا ذکر کیا ہے، بعضوں نے ان میں مزید اضافہ کیا ہے، جو مختلف علوم میں ہیں، علم طب میں انہوں نے متعدد کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں بعض کتابیں خاص بیماریوں، دواؤں اور

مخصوص اعضاء بدن پر تصنیف کی ہیں، اور بعض کتابیں جامع ہیں، جن میں کئی امراض اور کئی دواؤں پر گفتگو کی ہے۔

ان کی کتابوں میں کتاب اعتماد الادویہ المفردہ ہے، جو یوروپ میں بہت مشہور ہوئی، اور اس کا دو مرتبہ لاطینی زبان میں اور ایک مرتبہ عبرانی اور یونانی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ ایک کتاب ''طب الفقراء والمساکین'' اور ''کتاب کتاب المعدہ وامراضہا ومداواتہا'' ہے، ثانی الذکر کی تحقیق سلمان قطایہ نے کی ہے، اور چھپ چکی ہے۔ ابن الجزار نے بچوں کی صحت پر کتاب "سیاسة الصبیان وتدابیرھم"، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماہر امراض اطفال تھے، اس کتاب میں بائیس باب ہیں، اور پیدائش سے وفات تک بچوں کی بیماری اور صحت کے امور اور دوائیں ذکر کی ہیں۔ اسی طرح بوڑھوں کی صحت پر "طب المشائخ وحفظ صحتھم" تحریر کی ہے۔

ان کی شہرت کا اصل سبب ان کی مشہور کتاب ''زاد المسافر وقوت الحاضر'' ہے، جس میں انہوں نے تونس اور قیروان کے مدرسہ طب کے کبار اطباء مثلاً اسحاق بن عمران، اسحاق بن سلیمان، خاندان جزار، زیاد بن خلفون، اور فضل بن علی وغیرہ کے علوم کو محفوظ کر دیا ہے، اہل مغرب نے ان کو اس کتاب کے ذریعہ سے جانا، اس کتاب کا عبرانی زبان میں دو مرتبہ 1124ء اور 1259ء میں نیز لاطینی یونانی، اطالوی اور عبرانی میں ترجمہ ہوا، اہل مغرب پر اس کتاب نے بہت اثر ڈالا، بقول مستشرق اولمان: اس کتاب کو مشرق ومغرب میں عظیم شہرت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں ابن الجزار نے سر، گردن، اعضائے تنفس، معدہ اور آنتوں کے امراض، جگر اور گردہ، اعضائے تناسل اور جلد کے امراض سے بحث کی ہے۔

ابن الجزار کی وفات 400ھ/1010ء میں قیروان میں ہوئی۔

5.3.6 ابو القاسم الزہراوی

قرون وسطی کے مشہور طبیب اور جراح ابو القاسم خلف بن عباس زہراوی کی ولادت 325ھ/936ء میں مدینۃ الزہراء، اندلس میں ہوئی۔ مغرب میں آپ کو Abulcasis کے نام سے جانا جاتا ہے، مدینۃ الزہراء میں جو قرطبہ کا ایک حصہ تھا، انہوں نے تعلیم حاصل کی، جو اس وقت اندلس کا سب سے عظیم شہر اور علم وتہذیب کا گہوارہ تھا، وہ اندلس کے مشہور اموی خلیفہ عبد الرحمٰن ثالث کے طبیب تھے، (ول ڈیورانٹ) عجیب بات ہے تراجم وتاریخ کی کتابوں میں کہ اس عظیم طبیب اور جراح کے بہت مختصر حالات ملتے ہیں۔ حتی کہ ابن ابی اصیبعہ نے بھی اپنی کتاب عیون الانباء میں ان کے حالات پر تین سطر سے زائد روشنی نہیں ڈالی۔ زہراوی کی وفات 404ھ/1013ء یا 427ھ/1036ء میں ہوئی۔

الزہراوی کی شہرت ان کی مشہور کتاب کی وجہ سے ہے، جو انہوں نے طب وجراحت کے فن میں تصنیف کی تھی، جس کا نام ''التصریف لمن عجز عن التالیف'' ہے، زہراوی نے اس کتاب کو تیس مقالات میں تقسیم کیا ہے، ہر مقالہ علم طب کی ایک شاخ کے متعلق ہے، پہلا مقالہ طب کی کلیات سے متعلق ہے، جو سب سے طویل ہے، تیسواں مقالہ کی یعنی آگ سے داغ کر علاج کرنے، جراحت اور ہڈیوں کو جوڑنے سے متعلق ہے، اس باب کا لاطینی زبان میں سب سے پہلے ترجمہ جیرارد الکریمونی نے بارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں کیا، اس ترجمہ کی وجہ سے زہراوی کی مغرب میں شہرت ہوئی، اور وہ قرون وسطی کے سب سے عظیم جراح قرار پائے، چودھویں صدی عیسوی میں جب گے ڈی چولیاک (Guy de Chauliac) نے لاطینی زبان میں جراحت پر اپنی کتاب تالیف کی تو اس میں دو سو سے زیادہ بار زہراوی کا حوالہ دیا، اور یہ کتاب کئی صدیوں تک فن جراحت میں اہم مرجع کے طور پر معروف رہی۔ التصریف کا تیسواں مقالہ عربی زبان میں سب سے پہلے 1908ء میں لکھنو

کے نامی پریس سے شائع ہوا، تاکہ لکھنؤ کے تکمیل الطب کالج میں داخل نصاب ہو۔ 1972ء میں لندن میں یہ تیسواں مقالہ عربی متن اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا، اور 1983ء میں روسی زبان میں ترجمہ شائع ہوا۔ اگرچہ کہ ابھی تک التصریف کا کامل متن یا ترجمہ کہیں سے بھی شائع نہیں ہوا!۔

التصریف کا تیسواں مقالہ دوسرا طویل مقالہ ہے، زہراوی نے اس پر ایک اہم مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ان کے زمانہ کے بہت سے اطباء جراحت کی معرفت اور مشق صحیح طور پر نہ ہونے کی وجہ سے بے شمار غلطیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ زہراوی نے اس مقالہ میں رازی، ابن الجزار، ابن جلجل وغیرہ عرب اطباء کے ساتھ جالینوس، بقراط وغیرہ اطبائے یونان سے بھی استدلال کیا ہے، جس کے ذریعہ یونانی علم جراحت کی حفاظت بھی ممکن ہوئی۔ زہراوی نے کہا ہے کہ فن جراحت پر عبور حاصل کرنے سے [illegible] ن مہارت ضروری ہے، اس مقالہ کے پہلے باب میں زہراوی نے ان امراض اور ان کے اسباب کا ذکر کیا ہے، جن میں داغنا یا جلانا مفید ہوتا ہے، انہوں نے ان کے آلات اور اوزار کی تصاویر بھی دی ہیں، اور سر سے پیر تک کا علاج ذکر کیا ہے۔

زہراوی کے اہم کارنامے:

ایک ماہر جراح کی حیثیت سے زہراوی کا اہم امتیاز وہ آلات جراحت ہیں جن کو انہوں نے مختلف آپریشنوں میں استعمال کیا ہے، انہوں نے پتھری کو توڑنے کے وسائل کا مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ ذکر کیا ہے، حلب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ الطب کے پروفیسر ڈاکٹر عبد الناصر کعدان اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں تحریر کرتے ہیں: ''بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ زہراوی جن آلات کا استعمال کرتے تھے، ان میں سے اکثر خود ان کے اپنے بنائے ہوئے تھے، اور جن آلات کا استعمال پہلے سے تھا ان میں زہراوی نے کافی اصلاح کی، اور عملی طور پر ان کی کارکردگی کو ملاحظہ کیا، جن آلات کی انہوں نے تصویریں دیں ہیں ان کی افادیت اور طریقۂ استعمال کی اپنی کتاب میں تشریح کی ہے۔ زہراوی نے اپنی کتاب میں مختلف اعضاء کی جراحی کی جس باریکی سے تفصیل بیان کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ مہارت طویل تجربہ سے حاصل ہوئی، اور وہ دیگر اطباء مثلاً رازی، ابن سینا وغیرہ سے بہت ممتاز ہیں۔

زہراوی نے Ambroise Pare سے کئی صدیوں پہلے آپریشن کے دوران خون روکنے کے لئے رگوں کو دھاگے سے باندھنے کی صلاح دی، انہوں نے آنکھ، ناک، کان، حلق کی جراحی کا بھی بالتفصیل ذکر کیا ہے، ان میں سے اکثر طریقوں پر آج بھی عمل ہوتا ہے۔ کان میں اگر کوئی چیز چلی جائے تو اس کے نکالنے کے طریقوں کا بھی ذکر کیا ہے، دانت کی جراحی میں انہوں نے دانتوں کو نکالنے، داڑھ کی جڑ کو آپریشن سے باہر لانے، اور منھ کی ہڈیاں ٹوٹ جانے پر ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو نکالنے کا طریقہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے عمومی طور پیش آنے والے جراحت کے طور طریقوں پر بھی کلام کیا ہے''۔

بہر حال التصریف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زہراوی نے اپنے زمانہ میں پائے جانے والے اکثر آپریشنوں، ان کے طور طریقوں، استعمال ہونے والے آلات کا ذکر کیا ہے، نیز ان کی تصاویر بھی بنائی ہیں۔ انہی کارناموں کی وجہ سے زہراوی کو جدید جراحت کے باوا آدم (Father of the Modern Surgery) اور قرون وسطی کے سب سے عظیم جراح کا خطاب بجا طور عطا کیا گیا۔

5.3.7 ابومروان ابن زُہر

ابومروان عبدالملک بن ابوالعلاء ابن زہر کا تعلق اس گھرانے سے تھا جہاں علوم دینیہ، عقلیہ اور علم طب کا سلسلہ پانچ چھ پشتوں تک جاری رہا، یہ خاندان ابن زہر کے نام سے معروف ہے جس نے قرون وسطی میں اندلس میں فلسفہ، طب اور علوم کا علم بلند کیا، اس طرح انسانیت کے لئے قابل افتخار کارنامہ انجام دئے، ابومروان کے دادا عبدالملک بن زہر نے جو اندلس کے مشہور شہر اشبیلیہ کے بڑے عالم تھے، قیروان اور مصر میں علم طب حاصل کیا، اور اندلس میں ان کو طب میں بڑا مقام حاصل ہوا۔ ابومروان کے والد ابوالعلاء ابن زہر نے اپنے والد سے علم طب حاصل کیا، تذکرہ نگاروں نے ان کا بلند الفاظ میں ذکر کیا ہے، وہ بڑے ماہر طبیب اور نباض تھے، قارورہ دیکھ کر یا نبض دیکھ کر مریض کی کیفیت بیان کیا کرتے تھے، طب میں کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں کتاب الخواص، کتاب الأدویہ المفردہ، کتاب حل شکوک الرازی علی کتب جالینوس وغیرہ ہیں، ایک کتاب النکت الطبیہ کے نام سے اپنے فرزند ابومروان کے لئے لکھی تھی۔

تیسری نسل میں ابومرون عبدالملک بن ابی العلاء ہیں، جن کو علم طب میں اونچا مقام حاصل ہوا، اور اپنے والد سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ابومروان ابن زہر کی پیدائش اس عالمانہ گھرانہ میں 464ھ/1072ء میں ہوئی، قرآن کریم حفظ کیا، اپنے والد سے علم طب حاصل کیا، اور تجربات ومشاہدات کے ذریعہ اس میں پختگی پیدا کی، اور ابن ابی اصیبعہ کے مطابق اس مرتبہ تک پہونچے کہ ان کے زمانہ میں طب سے اشتغال رکھنے والوں میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ موحدین کے پہلے خلیفہ عبدالمومن کے دربار سے وابستہ رہے۔ ابن زہر طب سریری (Clinical Medicine) میں ماہر تھے، ابن زہر اگرچہ کہ مختلف علوم وفنون میں کمال رکھتے تھے، البتہ انہوں نے طب کو اختصاص اور پیشہ کے طور پر اپنایا، زندگی بھر اس سے وابستہ رہے، اور کئی چیزوں کا اضافہ کیا، ابومرون ابن زہر نے تجربہ اور علمی تحقیق کو اپنی بنیاد بنا کر کام کیا، اور کئی امراض جو پہلے معلوم نہ تھے، ان کو دریافت کیا، انہوں نے پھیپھڑوں کی بیماریوں کا مطالعہ کیا۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مصنوعی تغذیہ کے لئے نلی کا استعمال کیا، ابن زہر کا شمار ان اطباء میں ہے جنہوں نے خاص ماحول میں پائے جانے والے امراض پر قلم اٹھایا ہے، انہوں نے ان امراض پر کلام کیا ہے جو مراکش میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے دوا اور غذا میں شہد کی اہمیت کی وضاحت کی۔

ابن زہر کو خود ان کے معاصرین نے اعتراف کیا ہے، ابن رشد نے ان کو اپنی کتاب "کلیات" میں جالینوس کے بعد کا سب سے عظیم طبیب قرار دیا ہے۔ ابومروان ابن زہر سے انہوں نے ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی، جو ابن زہر نے "التیسیر فی المداواۃ والتدبیر" کے نام سے لکھی، لاطینی زبان اس کتاب کا ترجمہ 1490ء میں ہوا، اور عبرانی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا، اس کے واسطہ سے ابن زہر نے یوروپ کو بہت متاثر کیا، اور ان کی شہرت وہاں عام ہوئی۔ لاطینی میں ان کو Avenzoar کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی کتاب "الاقتصاد فی اصلاح الأنفس والاجساد" میں انہوں نے بیماریوں اور دواؤں کا خلاصہ، حفظان صحت کا علم، اور نفسیاتی علاج کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں کتاب الاغذیہ والادویہ بھی ہے، جس میں انہوں نے مختلف غذاؤں، دواؤں اور صحت پر ان کے اثرات سے بحث کی ہے، اس کتاب کا بھی لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ابن زہر نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں "مقالۃ فی علل الکلی"، "رسالۃ فی علتی البرص والبہق" وغیرہ ہیں، سترہویں صدی تک ان کی کتابیں یوروپ میں متداول رہیں۔ 557ھ/ 1162ء میں ان کا انتقال ہوا۔

5.3.8 ابن النفیس

علاء الدین علی بن ابی الحزم، ابن النفیس 607ھ / 1231ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، اور وہیں پرورش پائی، ابتدا میں قرآن کریم حفظ کیا، ادب، فقہ، حدیث، منطق اور سیرت وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، اور ان تمام علوم میں مہارت حاصل کی، بائیس سال کی عمر میں طب کی طرف توجہ کی، اپنے زمانہ کے نامور طبیب مہذب الدین عبدالرحمٰن دخوار سے طب کی تعلیم حاصل کی، جو دمشق میں نورالدین زنگی کے قائم کردہ مشہور شفا خانہ بیمارستان نوری میں رئیس الاطباء تھے، طب میں ان کے اساتذہ میں عمران اسرائیلی اور طبیب رضی الدین بھی تھے، ان اساتذہ سے علم حاصل کرنے کے ساتھ ابن النفیس نے اپنے سے پہلے کے عظیم اطباء مثلاً ابقراط، جالینوس، ابوبکر محمد بن زکریا رازی اور ابن سینا کی کتابوں کا مطالعہ کیا، منقول ہے کہ ابن سینا کی کتاب القانون انہیں زبانی یاد تھی۔ ابن النفیس نے دمشق سے ملک مصر کے شہر قاہرہ کا رخ کیا، اور وہاں بیمارستان ناصری میں جو سلطان صلاح الدین ایوبی نے قائم کیا تھا، طبیب کی حیثیت سے کام کرنے لگے، اور بعد میں اس اسپتال کے رئیس الاطباء بنے۔ اور دسیوں سال خدمت انجام دی، اور کئی ہونہار شاگردوں کو تیار کیا۔

ابن النفیس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہوتا غذا سے علاج کرتے، اگر اس سے کام نہ چلتا تو مفرد دواؤں کو تجویز کرتے، اس کے بعد مرکب دوا کو تجویز کرتے۔

ابن النفیس کا حافظہ غضب کا تھا، اور فن پر اس قدر عبور تھا کہ روانی کے ساتھ کئی کئی صفحے لکھتے، جب لکھنے بیٹھتے تھے تو کئی قلم تراش کروا کر رکھ لیتے، تاکہ قلم تراشنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ اپنے تجربات، مشاہدات کی روشنی میں کتاب تحریر کرتے، دوسری کتابوں سے بہت کم نقل کرتے، جب قلم بے کار ہو جاتا تو دوسرا قلم لیتے۔ ایک مرتبہ حمام میں غسل کر رہے تھے، صابن ملتے ہوئے اچانک ان کو نبض کے متعلق کچھ انکشاف ہوا، فوراً باہر آئے قلم اور کاغذ لیکر لکھنا شروع کیا، اور بعد میں جا کر غسل مکمل کیا۔

ابن النفیس نے متعدد کتابیں مختلف علوم میں تصنیف کیں، علم طب میں ان کی کئی کتابوں نے شہرت حاصل کی، جن میں ایک عظیم کتاب ''الشامل'' ہے، ابن النفیس اس کو ایک انسائیکلو پیڈیا کی شکل میں مرتب کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ان کی وفات ہوگئی۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۳۰۰ جلدوں میں ہوگی، لیکن ابن النفیس اس میں سے صرف ۸۰ جلدوں کی تبییض کر سکے۔ یہ جلدیں مسلمانوں کی پانچ سو سالہ طب اور دواسازی کے علوم اور تاریخ کا علمی سرمایہ ہیں۔ ایک اور کتاب کا نام ''شرح تشریح القانون'' ہے، یہ ابن سینا کی کتاب القانون کے ایک حصہ کی شرح ہے۔ ایک کتاب ''کتاب المہذب فی الکحل'' ہے۔ جو آنکھوں کے علاج سے متعلق ہے۔ ان کو ابن سینا اور بقراط کی کتابوں سے بہت تعلق تھا، اور جالینوس پر تنقید کرتے تھے۔ ابن سینا کی القانون کا اختصار بھی تحریر کیا ہے، جس کا نام موجز القانون ہے۔ بقراط کی کتابوں کی شرح بھی کی ہے۔ بغية الفطن فی علم البدن اور بغية الطالبين وحجة المتطببين بھی ان کی کتابیں ہیں۔

ابن النفیس کا اہم کارنامہ اور وجہ شہرت دوران خون کا انکشاف ہے، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے خون کے دوران کے سلسلہ میں جالینوس کے نظریہ کی تردید کی، اور اپنی کتاب ''شرح تشریح القانون'' میں دوران خون کی تفصیلی وضاحت کی۔ لیکن اس عظیم کارنامہ پر صدیوں تک پردہ پڑا رہا۔ بلکہ اس کے انکشاف کو ہسپانوی طبیب مائکل سروٹس (Michael Servetus) (وفات: 1553) اور انگریزی طبیب ولیم

ہاروے (وفات: 1068ھ/1657ء) کی طرف منسوب کردیا گیا، ہاروے نے ابن النفیس کے صدیوں بعد 1616ء میں دوران خون پر بحث کی تھی۔ ابن النفیس کے اس اکتشاف کا انکشاف اس وقت ہوا جب ایک مصری طبیب محیی الدین تطاوی نے ۱۹۲۴ میں جرمنی میں اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ پیش کیا، ان کو برلن کے کتب خانہ میں ابن النفیس کی کتاب ''شرح تشریح القانون'' کا نسخہ ملا، انہوں نے اس کی تحقیق کی، اور اپنی تحقیق جب یونیورسٹی کے اساتذہ کے سامنے پیش کی تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، انہوں نے ڈاکٹریٹ کا یہ مقالہ جرمن مستشرق مائرہوف کو ارسال کیا، جو اس وقت قاہرہ میں مقیم تھے، اور عربی زبان پر قدرت رکھتے تھے، استاذ میکس مائرہوف نے محیی الدین تطاوی کی تائید وتصدیق کی، اور ایک مقالہ اس کے متعلق تحریر کیا، جس کے ذریعہ ابن النفیس کے اس کارنامہ کی طرف دنیا کی توجہ مبذول ہوئی۔

ابن النفیس نے دوران خون کی وضاحت میں جو باتیں پیش کیں، ان کا خلاصہ جیسا کہ جرمن فاضلہ زیغرید ہونکہ نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے، یہ ہے:

☆ قلب کو ان رگوں کے ذریعہ سے غذا فراہم ہوتی ہے، جو قلب کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، نہ کہ اس خون سے جو قلب کے دائیں طرف پائی جانے والی خالی جگہ میں ہوتا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے تمام اطباء اس کے قائل تھے۔ اس طرح ابن نفیس نے سب سے پہلے اکلیلی شریانوں میں خون کے دوران کا اکتشاف کیا۔

☆ خون پھیپھڑوں کو غذا فراہم کرنے نہیں جاتا، بلکہ اس لئے جاتا ہے تاکہ پھیپھڑوں سے ہوا (آکسیجن) حاصل کرے۔ (ولیم ہاروے نے بعد میں اس کی تائید وتصدیق کی۔)

☆ پھیپھڑوں کی رگوں (Vain) اور شریانوں (Artaris) میں اتصال ہوتا ہے، جس کے ذریعہ پھیپھڑے کے اندر خون کا دوران مکمل ہوتا ہے۔ (کولمبو نے بعد میں سب سے پہلے انسان کے طور پر اس کے اکتشاف کا دعویٰ کیا تھا۔)

☆ پھیپھڑوں کی شریانوں میں ہوا یا رواسب نہیں ہوتے، جیسا کہ جالینوس کا ماننا ہے، بلکہ صرف خون ہوتا ہے۔

☆ پھیپھڑوں کی رگوں کی دیواریں اس کی شریانوں کی دیواروں سے زیادہ موٹی ہوتی ہیں، وہ دو پرتوں سے بنی ہوتی ہیں۔ (ان اکتشافات کو بعض مؤرخین نے سارسیٹس کی طرف منسوب کردیا۔)

☆ قلب کی دیوار جو اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، اس میں کوئی ظاہری یا پوشیدہ سوراخ نہیں پایا جاتا، بلکہ خون قلب کے ایک طرف سے پھیپھڑوں کی رگوں میں جاتا ہے، وہاں سے ہوا (آکسیجن) جذب کرتا ہے، تاکہ خون کے چھوٹے سے چھوٹے عناصر رواسب سے صاف ہو جائیں، پھر یہ خون صاف ہو کر پھیپھڑوں کی شریانوں میں داخل ہوتا ہے، اور ہوا جذب کرنے کے بعد قلب کے بائیں حصہ میں پہونچتا ہے، اس طرح خون کا دوران مکمل ہوتا ہے۔

مشرق ومغرب کے علماء واطباء کا اس پر اتفاق ہے کہ ابن النفیس کو اس فن میں کمال حاصل تھا۔ سبکی نے لکھا ہے کہ علم طب میں روئے زمین پر ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ابن سینا کے بعد ان کے جیسا کوئی اور پیدا نہیں ہوا۔ اسنوی کہتے ہیں کہ وہ مشرق ومغرب میں اپنے فن کے امام اور عجوبہ روزگار تھے۔ عمر کے اخیر زمانہ میں شدید بیمار ہوئے، اطباء نے علاج کے لئے شراب تجویز کی، انہوں نے کہا کہ ''خدا سے اس حال میں ملنا

پسند نہیں کہ میرے پیٹ میں شراب ہو''۔اسی مرض میں 687ھ/1288ء میں مصر میں وفات پائی۔ابن نفیس نے مجرد زندگی گذاری، وفات سے قبل اپنا عالی شان گھر، تمام اموال اور کتابیں بیمارستان منصوری کو وقف کر دی تھیں۔

5.3.9 عبداللطیف بن یوسف بغدادی، ابن اللباد

بغداد میں 629ھ/1162ء میں پیدا ہوئے، ان کا گھرانہ علم وفضل میں معروف تھا، والد نے بچپن ہی سے مختلف علوم کی طرف متوجہ کیا، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول میں مہارت حاصل کی، علوم عقلیہ کی طرف توجہ کی اور اس میں بھی درک حاصل کیا، عربی زبان وادب میں بھی مشہور ہوئے۔موفق الدین بغدادی نے طب کو اپنا پیشہ بنایا، اور مکمل طور سے اس کی طرف متوجہ ہوئے، قدماء کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا، اور تجرباتی طور پر علم طب کو حاصل کیا، اور اس میں شہرت حاصل کی، وہ کہتے ہیں کہ تجربہ سماعت سے قوی دلیل ہے۔وہ اکثر کہا کرتے: یہ مشہور قول ہے، لیکن ہمارے نزدیک باطل ہے۔یہ کہا جاتا ہے، لیکن علم تشریح اس کے خلاف ہے۔

عبداللطیف بغدادی نے دمشق کے مدرسہ عزیزیہ اور مصر کے جامع ازہر میں علم طب کی تدریس کا فریضہ بھی انجام دیا۔انہوں نے علم التشریح کو طب کے پیشہ اور مطالعہ کے لئے لازمی ضرورت قرار دیا، علاج ومعالجہ میں اور بیماری کے بارے میں صحیح طور پر جاننے کے لئے علم التشریح میں مہارت حاصل کرنے کی شدید تاکید کی ہے۔وہ پہلے عربی طبیب ہیں جنہوں نے ذیابیطس (Diabetes) کا اکتشاف کیا، اس کی علامتوں اور طریقہ علاج پر گفتگو کی، انہوں نے کہا کہ اس مرض میں بار بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے پیاس کی شدت ہوتی ہے، پانی جسم میں داخل ہونے کے بعد گردہ میں اتر آتا ہے، اور جسم اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔انہوں نے اس کے علاج کے طریقوں میں پرہیز، غذا اور نفسیاتی سکون راحت کو تجویز کیا ہے۔بغدادی نے دواسازی کے سلسلہ میں بھی تحقیقات کی ہیں، کمیت کے اعتبار سے مرکب دواؤں کے اوزان پر اور کیفیت کے اعتبار سے مرکب دواؤں کے اوزان پر ایک ایک کتاب تحریر کی ہے، دواسازی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نباتات کا علم بھی حاصل کیا، اور ایک کتاب ''کتاب النبات'' کے نام سے لکھی۔

بغدادی پہلے شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے یہ تحقیق کی کہ منھ کا نچلا جبڑا صرف ایک ہڈی سے بنا ہوا ہوتا ہے، اس میں کوئی جوڑ نہیں ہوتا، جب کہ اس سے پہلے جالینوس کے مطابق منھ کے نچلے جبڑے کو دو ہڈیوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا، انہوں نے اپنے شاگردوں کے ساتھ ہزاروں انسانوں کے ڈھانچوں کا مشاہدہ کیا، وہ ان کو لیکر کئی مقبروں میں گئے، اور کھوپڑیوں کا مشاہدہ کیا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے بوصیر کے قدیم قبرستان میں ڈھانچوں کا مشاہدہ کیا، جہاں ہڈیاں بوسیدگی کی وجہ سے الگ الگ ہو جاتی ہیں، لیکن وہاں بھی نچلے جبڑے میں صرف ایک ہی ہڈی تھی۔وہ تحریر کرتے ہیں کہ جالینوس نے ہمیں بتایا تھا کہ نچلا جبڑا دو ہڈیوں سے مرکب ہوتا ہے لیکن ہم نے دو ہزار ہڈیوں کا معاینہ کیا جن میں ہم کو ایک بھی جبڑا دو ہڈیوں سے مرکب نہیں ملا، یہ صرف ایک ہی ہڈی ہوتی ہے۔

عبداللطیف بغدادی کثیر التصانیف تھے، ابن ابی اصیبعہ نے ان کی ڈیڑھ سو سے زیادہ تصانیف گنوائی ہیں، جو مختلف علوم وفنون پر ہیں، قدماء کی کتابوں کا اختصار بھی کیا ہے، طب میں ان کی مشہور کتابوں میں ''کتاب الکفایہ فی التشریح''، ''کتاب کبیر فی الادویہ المفردۃ'' اور ''[illegible]'' وغیرہ ہیں۔عبداللطیف بغدادی کی وفات 629ھ/1231ء میں بغداد میں ہوئی۔

معلومات کی جانچ

1. ابوبکر رازی کی کتاب الحاوی پر ایک نوٹ تحریر کیجئے۔
2. مغربی دنیا پر ابوالقاسم زہراوی کے اثرات سے بحث کیجئے۔
3. ابن النفیس کے طبی کارناموں پر روشنی ڈالئے۔
3. علم طب میں عبداللطیف بغدادی کی حصہ داری کو نمایاں کیجئے۔

5.4 علم کیمیاء (Chemistry)

5.4.1 مسلمانوں میں علم کیمیاء کا آغاز

علم کیمیاء کی ترقی و ترویج میں قرون وسطی کے مسلمانوں کی اہم حصہ داری رہی ہے، انہوں نے کیمیاء کے سلسلہ میں صرف نظریات پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ تجربہ اور مشاہدہ کو بنیاد بنا کر کام کیا، اس فن کے لئے علمی بنیادیں فراہم کیں، اور دیگر طبیعی علوم کی طرح اس میں بھی اہم کارنامے انجام دئے، مسلمانوں نے قدیم دور میں پائے جانے والے علم خیمیاء اور علم سیمیاء کے مشاغل کو جس میں کم قیمت دھاتوں کو قیمتی دھاتوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، کیمیاء جیسے مفید علم میں تبدیل کیا، یوروپ نے علم کیمیاء میں مسلمانوں کے نظریات اور عملی تجربات سے خوب فائدہ اٹھایا، اس فن کی عربی کتابوں کو لاطینی اور دیگر یوروپی زبانوں میں منتقل کیا، بلکہ بہت سی کیمیاوی اصطلاحات کے عربی الفاظ کو من وعن نقل کیا، مثلاً: بورق (Borax)، الاکسیر (Elixier)، مرکزہ (Marksit)، نطرون (Natron)، صابون (Savon)، صودا (Soda)، توتیا (Tutia)، کافور (Camphor)، القلی (Alkali)، الانبیق (Alembic)، الکحل (Alcohol)، کبریت (Kabrit)، زعفران (Saffron) اثمد (Aktimany) وغیرہ الفاظ آج بھی مستعمل ہیں۔ ویل ڈیورانٹ لکھتے ہیں: ایک علم کی حیثیت سے کمسٹری کے موجد مسلمان ہیں، کیوں کہ مسلمانوں نے اس میدان میں دقیق مشاہدہ، سائنسی تجربات اور نتائج کے ملاحظہ کو داخل کیا، جس میں کہ یونانیوں نے مفروضات پر اکتفاء کیا تھا، مسلمانوں نے انبیق (Alembic) ایجاد کیا، اور اس کا نام رکھا، بے شمار مادوں کو کیمیائی تحلیل کے عمل سے گذارا، القلی اور تیزاب میں فرق کیا، سینکڑوں دواؤں کا مطالعہ کیا، اور سیکڑوں دواؤں کے مرکبات تیار کئے۔

ابتدائے اسلام میں سب سے پہلے خالد بن یزید بن معاویہ نے طب اور کیمیاء کی طرف توجہ مبذول کی، اور بنوامیہ کے ایک طبیب مریانس اور بعض دوسرے رومی و سریانی اطباء سے اس کی تحصیل کی، علم کیمیاء میں کئی رسائل خالد بن یزید بن معاویہ کی طرف منسوب ہیں، ان رسالہ کا نام ''رسالۃ فی الکلمات الثلاث'' ہے۔ انہوں نے یونانی قبطی، سریانی زبانوں سے کتابوں کو عربی میں منتقل کرانے کا کام شروع کرایا۔ فلسفہ، علم نجوم، کیمیاء اور طب کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرایا۔

5.4.2 جابر بن حیان

ابوموسی جابر بن حیان کو عربوں میں علم کیمیاء کا باوا آدم کہا جاتا ہے، دوسری صدی کی ابتداء میں پیدائش ہوئی، کوفہ میں جو علم وثقافت کا

گہوارہ تھا پرورش پائی، امام جعفر صادق سے عقلی ونقلی علوم حاصل کیے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کیمیاء کا علم بھی ان سے حاصل کیا تھا، یونانی، سریانی، ہندی، فارسی زبانوں کے علوم کو حاصل کیا، جابر بن حیان کی تصانیف کی تعداد دوسو سے زیادہ بتائی جاتی ہے، جن میں کئی کتابیں علم کیمیاء میں ہیں، ابن خلدون نے لکھا ہے کہ انہوں نے کیمیاء میں ستر رسائل تحریر کیے، جن کو "رسائل سبعینیہ" کہا جاتا ہے۔ان کی رسائل "اسرار الکیمیاء"، "اصول الکیمیاء" وغیرہ طبع ہو چکے ہیں، مغرب میں ان کا بڑا مقام ہے، جہاں جابر کو Gaber کے نام سے جانا جاتا ہے، یوروپ کی نشأۃ ثانیہ کی ابتدا میں ان کی کئی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا، M. Berthelot لکھتے ہیں کہ کیمیاء میں جابر کا وہ مقام ہے جو منطق میں ارسطو کا ہے۔انہوں نے سب سے پہلے گندھک کا تیزاب یا سلفیورک ایسڈ (Sulfuric Acid) کا تیار کیا، جابر نے اس کو زیت الزاج کا نام دیا، انہوں نے سب سے پہلے کاسٹک سوڈا (Caustic Soda) کو دریافت کیا، جابر نے سب سے پہلے سونے کا پانی تیار کیا۔بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کے علاوہ کئی مرکبات مثلاً پوٹاشیم کاربونیٹ (Potassium Carbonate) اور سوڈیم کاربونیٹ (Sodium Carbonate) تیار کیے۔انہوں نے پارہ (Mercury) کے مرکبات کی خاصیتوں کا مطالعہ کیا، اور ان کا استخراج کیا۔لی بان نے لکھا ہے کہ جابر کی کتابوں سے ایک انسائیکلو پیڈیا تیار ہوسکتا ہے، جس سے ہمارے سامنے عربوں میں پائے جانے والے اس دور کے علم کیمیاء کا خلاصہ آسکتا ہے۔

جابر کی کتابوں میں ایسے کیمیاوی مرکبات کو بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلے معروف نہیں تھے، انہوں نے سب سے پہلے تقطیر (Distillation)، تبلور (Crystallaization)، تذویب (Assimilation)، اور تحویل (Conversion) کے عمل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جابر بن حیان کی وفات 200ھ/815ء میں ہوئی۔

5.4.3 محمد بن زکریا رازی

ابوبکر محمد بن زکریا رازی رے (ایران) میں 240ھ/854ء میں پیدا ہوئے، علم کی طلب میں سفر کیا، طب اور فلسفہ کی کتابوں سے استفادہ کیا، یونانی، عربی، ہندی اور ایرانی علم طب کا مطالعہ کیا، اور طب کے ساتھ طبعیات اور کیمیاء میں کمال پیدا کیا، اور ان کو قرون وسطی کا سب سے عظیم طبیب کہا جاتا ہے، رازی نے تصانیف کا عظیم ذخیرہ چھوڑا، جن کی تعداد دوسو سے زیادہ تک پہونچتی ہے، جن میں الحاوی سب سے زیادہ مشہور ہے، ان کی کتابوں نے یوروپ میں عظیم مقبولیت حاصل کی، اور ان کو سترہوں صدی تک وہاں مرجع کی حیثیت حاصل رہی۔

ابوبکر رازی کو طب کے ساتھ علم کیمیاء میں بھی کمال حاصل تھا، انہوں نے علم کیمیاء میں کئی کتابیں تصنیف کیں، اور بہت سے کیمیائی تجربات کئے، کیمیاء پر رازی نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں "کتاب الاثبات"، "کتاب الحجر الاصفر"، "کتاب فی محنۃ الذہب والفضۃ والمیزان الطبیعی" وغیرہ بھی ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب "سر الاسرار" میں کیمیائی تجربات کے طریقوں پر روشنی ڈالی ہے، اس کتاب میں وہ ان مادوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں جن کو تجربہ کے عمل سے گذرنا ہے، پھر ان آلات کی تشریح کرتے ہیں، جو اس تجربہ میں استعمال ہوں گے، پھر تجربہ کے عمل کا طریقہ بیان کرتے ہیں۔رازی نے اپنے زمانہ میں استعمال کئے جانے والے معدنی اور شیشہ سے بنے ہوئے آلات کی تفصیل بھی ذکر کی ہے، ابوبکر رازی کی خصوصیت ہے کہ وہ بہت باریکی سے دقیق تفاصیل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

کیمیاء سے واقفیت کا اثر ان کی طب پر بھی دکھائی دیتا ہے، ان کے نزدیک امراض سے شفایابی ان کیمیائی تعاملات کی وجہ سے ہوتی ہے، جو دوا کے ذریعہ جسم میں پیدا ہوتے ہیں۔ ابو بکر جابر نے کیمیائی مادوں کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے: معدنی، نباتاتی، حیوانی، اور مشتق مادے۔ اور معدنیات کو چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ کیوں کہ ان کے خواص میں اختلاف بہت ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رازی نے کیمیائی تجربوں اور اس کے تعاملات کی معرفت میں کافی وقت صرف کیا ہے۔

رازی نے بعض تیزاب بھی تیار کیے، مثلاً گندھک کا تیزاب (Sulfuric acid)، جس کو انہوں نے زیت الزاج کا نام دیا، انہوں نے الکوحل بھی تیار کیا، اور اس کو اپنی دواؤں میں استعمال کیا، بعض سیال مادوں کی کثافت نوعی کا اندازہ کیا، اور اس کو وزن طبیعی کا نام دیا۔ اطالوی مستشرق دومیلی نے لکھا ہے کہ رازی صرف ایک عظیم طبیب نہیں تھے، بلکہ وہ ایک بلند مقام کیمیاء داں اور فزکس کے ماہر بھی تھے۔

ابو بکر رازی نے 313ھ/925ء میں رے میں وفات پائی۔

5.4.4 مسلمہ مجریطی

ابو القاسم مسلمہ بن احمد مجریطی اندلس کے موجودہ دار الحکومت مجریط (Madrid) میں 338ھ/950ء میں پیدا ہوئے، فلکیات، ریاضی اور کیمیا میں شہرت پائی، مجریطی نے زندگی کا بڑا حصہ قرطبہ میں گذارا۔

مجریطی نے کیمیائی تحقیقات وتعاملات، اور اس کے نتیجہ میں سامنے آنے والی نئی شکلوں کو جاننے کے لئے تجربہ اور مشاہدہ کو بنیاد بنایا، مجریطی نے بہت پہلے "مادہ کی بقا" کا نظریہ پیش کیا، جس کی طرف ان سے پہلے کسی کیمیا داں کی نظر نہیں گئی تھی، بلکہ ان کے بعد بھی اس کی طرف سات صدیوں تک توجہ نہیں ہوئی، یہاں تک کہ فرانسیسی سائنس داں انطونی لارنٹ (Antoine-Laurent de Lavoisier)، اور روسی سائنس داں میخائیل لامونو سے (Mikhail Lomonosov) نے اس کو دریافت کیا، اور ترقی دی، بقائے مادہ کا قاعدہ (Principle of mass conservation) جدید کیمیسٹری کا ایک مسلمہ اصول سمجھا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مادہ کو نہ تو ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ فنا کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اس کی تشریح یہ بھی کی جاتی ہے کہ کیمیائی تبدیلی سے پہلے تمام اشیاء کی کل کمیت کیمیائی تبدیلی کے بعد کی کل کمیت کے برابر ہوتی ہے۔ مجریطی نے اسی اصول کو تجربہ سے ثابت کیا ہے۔

مجریطی نے شائد سب سے پہلے اس علم کیمیا میں مہارت کے لئے علم ریاضی کے سیکھنے اور اس کے اصول کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا، وہ خود علم ریاضی اور ہندسہ میں مہارت رکھتے تھے، انہوں نے علم کیمیا میں دو کتابیں "رتبۃ الحکیم" اور "غایۃ الحکیم" تصنیف کیں، جو بعد میں اس فن کا مرجع بنیں، قشتالہ کے بادشاہ الفانسو دہم کے حکم سے غایۃ الحکیم کا 1252ء میں (Picatrix) کے نام سے لاطینی میں ترجمہ ہوا، اس کتاب میں مجریطی نے علم کیمیا کی تاریخ بھی تحریر کی ہے، اور گذشتہ ادوار میں کیمیا کے میدان میں دیگر اقوام مثلاً یونانیوں اور مصریوں کی حصولیابیاں ذکر کی ہیں۔

مجریطی کا بڑا کارنامہ پارہ کے آکسائڈ (Mercury oxide) کی تیاری ہے، انہوں نے سب سے پہلے پارہ کا آکسائڈ تیار کیا، اور اس تجربہ کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ مجریطی نے خودکار تقطیر (Automatic Distillation) کے لئے ایک بھٹی بھی تیار کی تھی، اور

مادہ کا نوعی وزن معلوم کرنے کے لئے ایک نہایت حساس ترازو بنایا تھا، جس کے پانچ پلڑے تھے، جو پانی پر تیرتے رہتے تھے۔ مجریطی نے مادوں کے احتراق اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے تعاملات اور احتراق کے بعد مادہ کے وزن میں ہونے والی تبدیلیوں کا بغور مشاہدہ کیا۔

مجریطی کی وفات 398ھ/1007ء میں مجریط (Madrid) میں ہوئی۔

5.4.5 عزالدین جلدکی

عزالدین علی بن عبداللہ ایدمر، جلدکی، خراسان کے شہر مشہد رضا کے قریب ایک گاؤں جلدک میں پیدا ہوئے، عمر کا بڑا حصہ عراق، ترکی، یمن، شمال افریقہ اور مصر کی سیاحت میں حصول علم اور درس و تدریس میں گذارا، اور علم کیمیاء میں اپنے دور میں عظیم شہرت حاصل کی، وہ علم کیمیا، تاریخ کیمیاء کی وسیع واقفیت رکھتے تھے، اور کیمیاء پر لکھی گئی کتابوں کی تشریح وتفسیر میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ جلدکی کا شماران علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے صرف نظری علم پر قناعت نہ کرتے ہوئے بذات خود کیمیائی تجربے کئے، ان کی تحقیقات اور مطالعات نے ان کو اس نتیجہ تک پہونچایا کہ کیمیائی مواد آپس میں اس وقت تعامل کرتے ہیں جب کہ وہ ایک متعین تناسب اور وزن میں ہوں، جلدکی کا اکتشاف کردہ یہ تجربہ دراصل وہی قانون تناسب (Law of composition) ہے جس کو بعد میں فرانسیسی کیمیاداں جوزف پراسٹ نے دریافت کیا۔ جلدکی سب سے پہلے کیمیاداں ہیں جنہوں نے بتایا کہ احتراق کے وقت ہر مادہ سے الگ الگ رنگ پیدا ہوتا ہے۔ جلدکی نے نائٹرک کے تیزاب (Nitric acid) کے ذریعہ سونے سے چاندی کو الگ کیا، جس سے چاندی پگھل جاتی ہے، اور خالص سونا باقی رہ جاتا ہے۔ انہوں نے کیمیائی تعاملات کے دوران خارج ہونے والی گیسوں کے اثر سے بچنے کے لئے تجربہ گاہوں میں ماسک (Mask) پہننے کی تجویز پیش کی۔ جلدکی نے صابن میں موجود کاسٹک سوڈے (Caustic soda) کے اثر سے کپڑوں کو محفوظ رکھنے کے لئے صابن میں کیمیائی تبدیلیاں کیں۔

جلدکی نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں اکثر علم کیمیاء پر ہیں، ان کی کتابوں میں المصباح فی علم المفتاح، البرہان فی اسرار المیزان، التقریب فی اسرار الترکیب فی الکیمیا، نہایۃ المطلب فی شرح المکتسب وزراعۃ الذہب، کنز الاختصاص فی معرفۃ الخواص وغیرہ ہیں۔ جلدکی کی وفات 742ھ/1341ء میں دمشق میں ہوئی۔

معلومات کی جانچ

1. علم کیمیاء میں مسلمانوں کی حصہ داری پر ایک نوٹ لکھئے۔
2. علم کیمیاء میں جابر بن حیان کے کارناموں کو اجاگر کیجئے۔
3. ابوبکر رازی نے کیمیاء کی ترقی میں کیا حصہ لیا، واضح کیجئے۔

5.5 علم حیوانات (Zoology)

5.5.1 مسلمانوں میں علم حیوانات کی ابتداء

مسلمانوں اور عربوں میں علم حیوانات کی ابتداء علم لغت کے طور پر ہوئی، عربوں کا حیوانات کی طرف توجہ دینا اوران کا خیال رکھنا فطری تھا، خصوصا جبکہ حیوانات ان کے سفر اور حضر کی زندگی کے جزو لاینفک تھے، گھوڑا، اونٹ، بکری، کتے وغیرہ ان کی اقتصادی اور سماجی زندگی کا اہم حصہ تھے۔ اسلام کی آمد کے ساتھ ان کے اندر غور وفکر، تحقیق وتجربہ اور جستجو کا مادہ بڑھتا گیا، قرآن نے ان کو کائنات میں موجود مخلوقات کی طرف متوجہ کیا، اس میں غور وفکر کی دعوت دی، ایک جگہ اللہ تعالی نے فرمایا: ''کیا تم اونٹ کو نہیں دیکھتے اس کو کس طرح پیدا کیا گیا''؟! (سورہ غاشیہ:17) ، قرآن کریم میں چیونٹی اور اس کے بل، مکڑی اور اس کے جالے، شہد کی مکھی اور اس کے چھتے، مکھی، مچھر، ٹڈی، کھٹمل، مینڈک، بندر، شیر، اونٹ، گائے، بیل، بکری، بھیڑ، بھیڑیا، گدھا، گھوڑا، خچر، ہاتھی، سانپ، پرندہ، ہدہد، کوا، بٹیر، مچھلی وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ کہیں پر اس کو انعام کے طور پر ذکر کیا ہے، اور کہیں پر اس میں غور وفکر پر ابھارا ہے، حدیث شریف میں بھی حیونات اوران کو استعمال میں لانے کے تعلق سے ہدایات دی گئی ہیں۔ اس طرح قرآن کریم اور حدیث شریف کی طرف توجہ نے نیز ان کے اشعار میں موجود صحرائی زندگی میں جانوروں کے تذکرہ نے ان کو اس سلسلہ میں مزید پیش رفت کرنے پر آمادہ کیا۔ فتوحات کی وسعت کے ساتھ جب علوم ومعارف میں اضافہ ہوا، تو اس علم الحیوان کی طرف بھی توجہ ہوئی اور مستقل تصنیفات اس موضوع پر لکھی گئیں، مثلا کتاب الابل، کتاب الخیل، کتاب الجراد، کتاب الشاء، کتاب النحل، وغیرہ، اس کے بعد جب ترجمہ کا آغاز ہوا تو دیگر علوم کی طرح اس علم میں بھی یونانی ورثہ مسلمانوں کے ہاتھ لگا، اور دیموقریطس کی کتاب الحیوان کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا، اس سے زیادہ مشہور کتاب ارسطو کی کتاب الحیوان تھی جس کا ترجمہ یحیی بن بطریق نے کیا، اور ارسطاطالیس کی ''کتاب جوامع کتاب ارسطاطالیس فی معرفۃ طبائع الحیوان'' جس کا ترجمہ مشہور مترجم اسحاق بن حنین نے کیا۔

اس کے بعد کے دور میں اس موضوع نے زیادہ وسعت اختیار کی، اور تصنیف کا سلسلہ کسی ایک حیوان سے تجاوز کرکے حیوانات کے تعلق سے کتابیں لکھی گئیں، یہاں ہم چند ایسے علماء کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے اس علم پر خصوصی توجہ کی، اور اس کو ترقی دی۔

5.5.2 جاحظ

عمرو بن بحر، ابو عثمان کا لقب جاحظ تھا، بصرہ میں 163ھ/780ء میں پیدا ہوئے، عربی ادب، علم کلام اور مختلف فنون میں مہارت حاصل کی، بغداد پہونچے جہاں ان کے جوہر چمکے، اور خلیفہ مامون کے دیوان رسائل کی ذمہ داری سنبھالی۔ جاحظ کی وسیع معرفت اور علمیت کے تمام مؤرخین اور علماء معترف ہیں، اپنے زمانہ کے تمام علوم میں درک رکھتے تھے، فصاحت وبلاغت کے امام اور زبان وقلم کے بادشاہ تھے۔ دوسو سے زائد کتابیں مختلف علوم وفنون میں تصنیف کیں، ان کی اہم ترین کتابوں میں ''کتاب الحیوان'' ہے جو انہوں نے عمر کے اخیر حصہ میں تصنیف کی، اور سلطنت عباسیہ کے محمد بن عبد الملک زیات کو تحفۃ میں پیش کی۔

یہ کتاب صرف حیوانات ہی نہیں بلکہ مختلف علوم ومعارف کا مجموعہ ہے، کتاب کی تصنیف میں جاحظ نے قرآن، حدیث، اخبار، تورات وانجیل، حکماء کے اقوال، اشعار عرب، اور یونانی، ایرانی اور ہندی علوم وفنون سے استفادہ کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علمی تجربات، مشاہدات وملاحظات بھی ذکر کئے ہیں۔ سات جلدوں میں مطبوعہ کتاب الحیوان عربی زبان میں علم الحیوان پر اولین تصنیف ہے، کیوں کہ اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں علمی رنگ سے زیادہ لغوی رنگ غالب ہے، اور وہ عموما کسی ایک حیوان پر لکھی گئی ہیں، جبکہ جاحظ نے لغت وشعر سے استفادہ کرنے کے ساتھ حیوانات کی فطرت، حالات اور عادات سے بھی بحث کی ہے۔

جاحظ نے کتاب الحیوان میں کائنات کی تمام اجسام کی دو بنیادی قسمیں کی ہیں، جمادات اور نامی اجسام، یا نامی اور غیر نامی اجسام، پھر نامی کی دو قسمیں کی ہیں، حیوانات اور نباتات، حیوانات کی چار قسمیں ہیں، چلنے والے، اڑنے والے، تیرنے والے اور رینگنے والے، پھر چلنے والوں کی چار اقسام ہیں، انسان، مویشی، درندے اور حشرات۔ پرندوں کی تین قسمیں ہیں، درندے، پالتو، اور وحشی۔ پھر مزید تقسیمات، خصوصیات اور تفصیلات ذکر کی ہیں۔ پھر پانی کے حیوانات کا ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ ہر تیرنے والا حیوان مچھلی نہیں کہلاتا۔ اور کہا ہے کہ ہر دو پروں سے اڑنے والا پرندہ نہیں ہوتا، کیوں کہ پتنگے وغیرہ بھی اڑتے ہیں۔ آگے جاحظ نے انسان اور حیوان کا مقابلہ کرنے کے بعد خصی کرنے کے طریقے اور حیوانات پر اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حیوانات پر ماحول کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب جب خراسان میں بسے تو ان کی بہت سی خصوصیات جاتی رہیں، اس طرح حیوانات بھی متاثر ہوتے ہیں، ترکاری اور سبزیوں کے کیڑے سبز ہوتے ہیں، کالے سر کے بالوں میں جوں سیاہ، اور بوڑھے کے سفید بالوں میں جوں سفید ہوتی ہے۔

جاحظ نے اپنی کتاب میں مختلف جانوروں اور ان کے زندگی کے مراحل سے گفتگو کی ہے، اور اکثر جگہ ان جانوروں کے پالنے والوں سے ہونے والی گفتگو کو نقل کیا ہے، مثلا کہتے ہیں کہ مرغ والے نے کہا، یا فاختہ والے نے کہا، کتے والے نے کہا۔ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض حیوانات مثلا بچھوؤں، سانپوں اور بجوؤں کو شیشے کے مرتبان میں رکھ کر ان کی لڑائی کا مشاہدہ کیا ہے، تا کہ دونوں میں زیادہ خطرناک کو پہچان سکیں، وہ حیوانات کو دم سے باندھ کر دیکھتے تھے کہ کون زیادہ قوی ہے، بلکہ انہوں نے مخصوص مچھلیوں کے انڈوں کا مزہ چکھ کر، اور بعض حیوانات کا پیٹ چاک کر کے ان کے اندر پلنے والے بچوں کی تعداد کا مشاہدہ کیا ہے۔ کئی مرتبہ انہوں نے دوسروں کے اقوال کی صحت معلوم کرنے کے لئے بھی تجربے کئے ہیں۔

کتاب الحیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جاحظ پہلے ماہر حیوانیات تھے، جنہوں نے تجربہ اور مشاہدہ پر علم کی بنیاد رکھی۔ کتابوں کا ڈھیر سر پر گر جانے کی وجہ سے 255ھ/869ء میں بصرہ میں جاحظ کی وفات ہوئی۔

5.5.3 زکریا قزوینی

زکریا بن محمد قزوینی، جغرافیہ داں اور ماہر حیوانات، ایران کے شہر قزوین میں 605ھ/1208ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی زندگی یہیں گذاری، پھر دمشق کا سفر کیا، جہاں مختلف علوم حاصل کئے، پھر بغداد کا رخ کیا، اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے زمانہ میں شہر واسط کے قاضی مقرر ہوئے۔ قضا کی ذمہ داری کے ساتھ علمی میدانوں میں تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا، فلکیات اور علم الاحیاء میں شہرت پائی، کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں سب سے مشہور کتاب عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات ہے، اس کتاب میں قزوینی نے بنیادی طور پر کائنات کی عالم علوی اور عالم سفلی میں تقسیم کی ہے، اولا آسمان اور اس کی مخلوقات، اجرام سماویہ، کواکب وابراج اور ان کی حرکت وسکون سے بحث کی ہے، پھر زمین اور اس کی مخلوقات کا ذکر کیا ہے، زمین کی اصل، اس کی فطری خصوصیات، اس کے گرد پھیلا ہوا کرۂ ہوائی، پانی اور اس کے مستقر اور اس میں پائی جانے والی مخلوقات کا تعارف کرایا ہے، پھر خشکی میں پائے جانے والے جمادات، نباتات، حیوانات کے بارے میں گفتگو کی ہے، قزوینی نے حیوانات کے اسماء کو حروف تہجی کی ترتیب پر ذکر کیا ہے، انہوں نے گذشتہ علمائے نباتات وحیوانات کے برعکس اپنی کتاب میں اشعار کے ذکر سے کافی گریز کیا ہے، جس سے ان کی کتاب بجائے کسی ادبی مرجع کے خالص علمی پہلو کی حامل نظر آتی ہے۔ قزوینی نے حیوانات کو کائنات میں تیسرا

درجہ دیا ہے، پہلا اور دوسرا درجہ بالترتیب معدنیات اور نباتات کو دیا ہے، خود حیوانات کو اپنی اپنی کارگردگی کے لحاظ سے کئی قسموں میں منقسم کیا ہے، جس میں انسان کو چوٹی پر جگہ دی ہے کیوں کہ وہ اشرف الحیوانات اور خلاصۃ المخلوقات ہے، انہوں نے حیونات کو سات قسموں میں تقسیم کیا ہے، پہلا انسان، دوسرا جن، سوم چوپائے (دواب) مثلاً گھوڑا، خچر، گدھا، جنگلی گدھا وغیرہ، اور ان میں سے ہر ایک کے خواص کا ذکر کیا ہے۔ چہارم مویشی یعنی وہ جانور بہت زیادہ مطیع اور نہایت کارآمد وفائدہ مند ہیں، ان میں چوپایوں کی سی شرارت نہیں اور نہ درندوں کی طرح بدکتے ہیں، مثلاً اونٹ، گائے، بھینس، زرافہ وغیرہ۔ پنجم درندے مثلاً خنزیر، تیندوا، ہاتھی، چیتا، لومڑی اور گیدڑ وغیرہ۔ ششم پرندے، طوطا، بلبل، چیل، فاختہ، چمگادڑ وغیرہ۔ ساتواں حشرات اور کیڑے، ان کی کثیر اقسام ہیں، جس کی وجہ سے ان کو منضبط کرنا مشکل ہے، مثلاً دیمک، کھٹمل، ٹڈی وغیرہ۔

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قزوینی نے سمندر اور خشکی میں پائے جانے والے حیوانات کے بارے میں گہری اور دقیق معلومات دی ہیں، اور انہوں نے ان کی زندگی کا خود سے مشاہدہ کیا ہے۔ قزوینی نے حیوانات پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا بھی ذکر کیا ہے، اور ماحول کے حیوانات پر کیا اثرات ہوتے ہیں ان کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ہاتھیوں کی عمر دیگر ملکوں کے مقابلہ ہندوستان میں زیادہ ہوتی ہے، ان کے دانت جتنے وہاں لانبے ہوتے ہیں کہیں اور نہیں ہوتے۔ زرافہ کی پیدائش حبشہ (مشرقی افریقہ) میں ہوتی ہے، بھینس گرم ملکوں میں پانی کے قریب پائی جاتی ہے۔ شکرہ، باز اور عقاب اونچی چوٹیوں پر ہی انڈے دیتے ہیں، جب کہ شتر مرغ اور قطا پرندہ صحراؤں میں ہی انڈے دیتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے، اور اگر اس کے خلاف ہو تو وہ شاذ و نادر ہے۔

قزوینی کی کتاب عجائب المخلوقات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے حیوانات کی رنگین تصاویر دی ہیں، جس سے کتاب کی افادیت اور قاری کی معلومات میں بے حد اضافہ ہوتا ہے۔

قزوینی کی وفات 682ھ/1283ء میں ہوئی۔

5.5.4 کمال الدین دمیری

ابو البقاء کمال الدین محمد بن موسی دمیری مصر کے دمیرنامی قصبہ میں 742ھ/1341ء میں پیدا ہوئے، ابتدا میں کپڑے سینے کا کام کرتے تھے، پھر حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے، جامع ازہر کے کبار علماء سے علم حاصل کیا، اور ادب، فلسفہ، فقہ، حدیث میں کمال حاصل کیا، اور فقہ شافعی کے عظیم فقیہ بنے۔ مخلوقات کی سے دلچسپی کے نتیجہ میں حیوانات کے مطالعہ ومشاہدہ کی طرف متوجہ ہوئے، اس باب میں محمد بن علی خزاوی کی شاگردی اختیار کی، جو ایک عالم حیوانات تھے، گذشتہ علماء کی قدیم وجدید کتابوں کا مطالعہ کیا، اور عالم حیوانات کی حیثیت سے شہرت پائی۔ دمیری کا اہم کارنامہ کتاب حیاۃ الحیوان کی تصنیف ہے، جو ان کی سب سے مشہور کتاب ہے، یہ کتاب عربی زبان میں حیوانیات کا سب سے پہلا مکمل انسائکلو پیڈیا ہے، مصنف نے کتاب کی تصنیف میں سات سو سے زائد مصادر سے استفادہ کیا ہے، اور اس میں 1069 حیوانات کا تذکرہ کیا ہے، جن کو حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا ہے، دمیری کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اس جانور کا صحیح نام اہتمام کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، اور اس کی لغوی حقیقت پر کلام کرنے کے بعد اس کی فطرت وعادت کے متعلق اپنے اور دیگر علماء کے مشاہدات کو بیان کرتے ہیں، اسی طرح ہر جانور کی تفصیل میں اس کی پیدائش سے لیکر نشو نما کے مراحل اور اس دوران اس میں ہونے والی تبدیلیوں کو ذکر کرتے ہیں، اور اس جانور کے

متعلق شریعت کے احکامات کی وضاحت بھی کرتے جاتے ہیں، اوراس کے گوشت وغیرہ سے ہونے والے فوائد اور نقصانات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

کتاب کی تالیف میں دمیری نے مشاہدہ اور تجربہ پر بھروسہ کیا ہے، اگرچہ کتاب میں بعض غیر علمی باتیں بھی آگئی ہیں، لیکن دمیری نے حیوانات کی فطرت اور ان کے رہن سہن، عادات واطوار کا جس باریکی سے ملاحظہ کیا ہے، اس وجہ سے ان کی کتاب اس موضوع کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کا کئی زبانوں بشمول انگریزی، جرمن اور فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور علمائے یوروپ میں سے کئی نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

کمال الدین دمیری کی وفات 808ھ/1405ء میں مصر میں ہوئی۔

معلومات کی جانچ

1. ابوبکر رازی کی کتاب الحاوی پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
2. مغربی دنیا پر ابوالقاسم زہروی کے اثرات سے بحث کیجیے۔
3. ابن النفیس کے طبی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
4. علم طب میں عبداللطیف بغدادی کی حصہ داری کو نمایاں کیجیے۔

5.6 علم نباتات (Botany)

5.6.1 نباتات اور اسلام

نباتات سے انسانی زندگی کا بہت قدیم اور گہرا رشتہ ہے، نباتات کے بغیر زندگی کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، قرآن کریم میں خدا کی نعمتوں میں سے نباتات کو بھی شمار کیا ہے، اور نباتات میں خدا کی نیرنگیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اور ان میں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ عرب کے ریگستانی ماحول میں ان کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ وہ زندگی کا سہارا اور راہ گیروں کا آسرا ہوا کرتے تھے۔ عربوں میں نباتات کی خصوصیات جاننے اور ان کو غذا کے علاوہ علاج معالجہ میں استعمال کرنے کا رواج تھا، قرآن مجید میں نباتات کی اقسام میں سے کئی پھلوں مثلاً انگور، انار، زیتون، بیر، کیلا اور میووں مثلاً فاکھہ، انجیر، کھجور کی مختلف اقسام، زیتون، اور ترکاریوں مثلاً کدو، لہسن، سبزی، ادرک، سونٹھ، پیاز، اور درخت، بیل، پودے اوران کے اجزاء مثلاً پھول، پھل، پتیاں، خوشے، بالی، تنا، نیز زقوم، کانٹے دار بیری، انگور کی بیل، اور اناج مثلاً گیہوں، دال، اوران سے تیار کی جانے والی اشیاء مثلاً انگور کی شراب، زیتون کا تیل، اور کھیتیوں کا ذکر آیا ہے، کہیں تو نعمت کے طور پر، کہیں اس میں غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے، اوران کے مختلف فوائد وخصائص کی طرف مخاطب کی توجہ مبذول کرائی ہے،، ارشاد باری عزاسمہ ہے: ''وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر کونپل سے ہری ٹہنیاں نکالی ہیں، جس سے ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے دانے نکلتے ہیں، اور کھجور کے درختوں کے گچھوں میں سے زمین کی طرف لٹکتے ہوئے خوشے، نیز انگور، زیتون اور انار کے باغات، جن میں سے بعض ایک دوسرے کے

جیسے ہیں، اور بعض جدا جدا، جب اس کا پھل آجائے تو اس کو دیکھو، اس اس کے پکنے پر غور کرو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں''۔(سورہ انعام:99)۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی نباتات کی اہمیت اور پیڑ پودوں کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے، ایک حدیث سے ہم کو اس کا اندازہ ہوتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر قیامت قائم ہونے لگے اور تمہارے ہاتھ میں کوئی پودا ہو، تو تم اس کو زمین میں لگا سکتے ہو تو لگا کر ہی اٹھو''۔(الادب المفرد:479 عن انسؓ)۔

5.6.2 مسلمان اور علم نباتات

ان تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے علم نباتات کی طرف ابتداہی میں توجہ دی، ابتدا میں لغت مرتب کرنے والوں نے نباتات کے اسماء کو مدون کرنے کا کام کیا، دوسری صدی کے اواخر میں نضر بن شمیل (متوفی:204ھ/820ء) نے اپنی لغت (کتاب الصفات فی اللغۃ) کا پانچواں حصہ کھیتیوں، انگور کے باغات، انگور، ترکاریوں اور درختوں کے اسماء کے لئے خاص کیا، اس کے بعد ابوعبیدہ بصری (متوفی:208ھ/823ء) نے کتاب الزرع کے نام سے، اصمعی (متوفی:214ھ/829ء)، ابوزید انصاری (متوفی:215ھ/830ء) نے کتاب النبات والشجر کے نام سے مستقل کتابیں تحریر کیں۔

یہ کتابیں صرف نظری طور پر اسماء اور معلومات جمع کرنے کا کام نہ تھا، بلکہ یہ عملی علم تھا، بتایا جاتا ہے کہ نضر بن شمیل نے عرب کے بادیہ (دیہاتوں اور جنگلوں) میں مختلف قسم کی نباتات کو جمع کرنے، پودوں کا ان کے ماحول میں مطالعہ کرنے، اور ان کی اصطلاحات کو منضبط کرنے کے لئے چالیس سال گذارے تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عام طور پر نباتات کی تحقیق دواسازی کے لئے ہوتی تھی، اور اکثر دوائیں چوں کہ نباتات سے تیار ہوتی تھیں، اس وجہ سے دواساز ہی علمائے نباتات ہوتے تھے، اس علم میں مہارت رکھنے والوں کو ''نباتی'' کہا جاتا تھا، ایک اور لفظ ''عشاب'' کا بھی مستعمل تھا جو 'عشب'، یعنی گھانس، پودے اور نباتات جمع کرنے والے کے لئے بولا جاتا تھا۔ اور دواساز کو صیدلی کہا جاتا تھا۔ اکثر علمائے نبات صیدلی اور طبیب ہوتے تھے۔

قرون وسطی میں مسلمانوں میں سے متعدد علمائے نباتات پیدا ہوئے، جنہوں نے اس فن پر باقاعدہ کتابیں تصنیف کیں، اور علم نباتات کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے مدون کیا، ان میں سے مشہور سائنس دانوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

5.6.3 ابوحنیفہ دینوری

احمد بن داود دینوری ایران میں ہمدان کے قریب کے شہر دینور میں پیدا ہوئے، زندگی کا اکثر حصہ اسی شہر میں گذارا، عہد شباب میں جزیرۃ العرب کے ساحلوں، مدینہ منورہ، بغداد اور فلسطین وغیرہ کی سیاحت کی، اصفہان میں بھی رہے۔

ابوحیان توحیدی کہتے ہیں: ابوحنیفہ دینوری کا شمائے یکتائے روزگار علماء میں ہے، فلاسفہ کی حکمت اور عرب کی فصاحت انہوں نے جمع کی، ہر علم

وفن میں انہیں ید طولی حاصل تھا۔ ابن العماد نے لکھا ہے: ابوحنیفہ دینوری مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے، خدا نے ان کو فراخی کے ساتھ سائنسی عقلیت سے نوازا تھا، اس وجہ سے انہوں نے ہر فن میں نئی چیز پیش کی۔

ابوحنیفہ دینوری کی کئی کتابیں ہیں، جن کی وجہ سے ان کو علمی دنیا میں بلند مقام حاصل ہوا، جن میں الاخبار الطّوال، کتاب البلدان، کتاب البحث فی حساب الہند، کتاب الانواء، کتاب حساب الدور، کتاب الجبر والمقابلہ، کتاب الفصاحہ وغیرہ ہیں۔ ابوحنیفہ دینوری کی شہرت کی وجہ ان کی تصنیف کتاب النبات ہے، جو انہوں نے چھ ضخیم جلدوں میں لکھی۔ اس کتاب کا اکثر حصہ مفقود ہے، تیسرا اور پانچواں حصہ مشہور مستشرق برنہارڈ لوین کی تحقیق سے 1974ء میں شائع ہوا ہے، اس کی ابتدا میں دینوری نے کھیتوں اور نخلستانوں کو تباہ کرنے والی آفات کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد وہ چراگاہوں جانوروں کے چارہ اور ان کی اقسام وخصوصیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک باب میں ان نباتات کو ذکر کیا ہے جن کا استعمال عربوں میں رنگنے کے لئے ہوتا ہے، اس کے اگلے باب میں عرب میں پائے جانے والے خوشبودار اور بدبودار پودوں کے متعلق معلومات جمع کی ہیں، اور ان کی تفصیلات درج کی ہیں۔ کتاب النبات میں انہوں نے اپنے ذاتی ملاحظات ومشاہدات کو بھی اس میں جگہ دی ہے، اور وہ اکثر وبیشتر عرب کے بدوؤں اور اعرابیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ نقل کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کی وجہ سے ان کو ''نباتی'' کا لقب دیا گیا، نیز ان کو ''عشاب'' کے لقب سے بھی جانا جاتا ہے، کیوں کہ وہ اعشاب (گھانس اور پودوں) کے خصائص اور ان کی نشو ونما کی معرفت رکھتے تھے، انہوں نے علم النبات کی بنیاد تجربہ اور استنتاج پر رکھی، مشرق ومغرب کے علماء نے ان کو علم نبات میں ان کی مہارت وقابلیت کی وجہ سے جانا۔

دینوری نے اپنی کتاب میں نباتات کے اوصاف، اس کے اجزاء یعنی جڑ، تنا، پھول، پھل، پتیوں وغیرہ کے بارے میں عربی ادب میں پائے جانے والے تمام اقوال، اشعار اور نظم نثر کی معلومات کو جمع کیا ہے، اور نباتات کے اوصاف، ان کے استعمالات، نشو ونما کے مقامات کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف علمائے لغت بلکہ اطباء اور دواسازوں کا مرجع بن گئی، اور آنے والے ادوار میں کسی دواساز کو اس وقت تک سند اجازت نہیں دی جاتی تھی، جب تک کہ وہ ابوحنیفہ دینوری کی کتاب النبات کے امتحان میں کامیاب نہ ہو جائے۔ دینوری نے اس کتاب میں سینکڑوں نباتات کا حال بیان کیا ہے، اور حروف تہجی کی ترتیب پر اپنی کتاب کو مرتب کیا ہے، کتاب کی ابتدا میں بلاد عرب کی مٹی، ان کی اقسام، مٹی کی ترکیب، آب وہوا، پانی کی تقسیمات اور نباتات کی نشو ونما کے لئے ضروری شروط کو ذکر کیا ہے، ابوحنیفہ دینوری کے ذکر کردہ نباتات کے اسماء کی تعداد 1120 تک پہونچتی ہے۔ اس کتاب کو ہر زمانہ میں بڑی مقبولیت اور مرجعیت حاصل رہی، اور اسکالرس نے اس کو سراہا، ابوالبرکات انباری اور یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ اس باب میں اس جیسی کوئی کتاب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جزیرۃ العرب کے جغرافیائی نباتیات (Flora) کا اولین مصنف تسلیم کیا جاتا ہے۔

ابوحنیفہ دینوری کی وفات 282ھ/894ء میں دینور میں ہوئی۔

5.6.4 ابوالعباس ابن الرومیہ

احمد بن محمد اشبیلی، ابوالعباس، معروف بہ ابن الرومیہ، مشہور عالم نباتات اور عشاب، اندلس کے شہر اشبیلیہ میں 561ھ/ 1165ء میں پیدا ہوئے، علم حدیث اور علم نباتات دونوں علوم میں عظیم شہرت پائی، ان علوم کو حاصل کرنے کے لئے طویل سفر کئے، اولا اپنے والد اور دادا سے علم نباتات حاصل کیا، پھر نباتات کے مشاہدہ اور جمع کرنے کے شوق میں اندلس کے مشرق ومغرب کا سفر کیا، پھر حج کی نیت سے رخت سفر

باندھا اور مراکش، الجزائر، تونس، مصر ہوتے ہوئے حجاز پہونچے، حج کے بعد عراق اور ملک شام ہوتے ہوئے بحر روم کے راستہ صقلیہ گئے، اور پھر اندلس پہونچے، اور اس سفر میں جن مقامات سے گذرے وہاں کی نباتات کے مشاہدہ و مطالعہ پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ''الرحلۃ النباتیہ'' رکھا، اس میں نباتات کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے ذکر کئے۔ ابو العباس نے نباتات کے مطالعہ میں بحث و تحقیق کا طریقہ اپنایا، انہوں نے پودوں کے اجزاء کے اوصاف اور اس کے خواص بیان کرنے پر پوری توجہ مرکوز کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ماہر نباتات ہیں، جب وہ کسی پودے کا وصف بیان کرتے ہیں تو اس کی جڑوں، تنا، ڈالیوں، شاخوں، کلیاں، پھول، پتیاں، کانٹے، بیج وغیرہ سب کی تفصیل بیان کرتے ہیں، ساتھ ہی اس کی شکل، لمبائی، چوڑائی، رنگ، بو، مزہ، پودے کی نشو ونما کے مقام اور موسم کی بھی وضاحت کرتے جاتے ہیں۔ فرانسیسی محقق لوئیس لیکرک نے لکھا ہے کہ علمائے عرب کے درمیان ماہر نباتات کہلانے کے سب سے زیادہ مستحق ابو العباس ابن الرومیہ ہیں، ان سے پہلے کے علمائے نبات عموماً صرف نقل و روایت پر انحصار کرتے تھے، لیکن انہوں نے سب سے پہلے نباتات کے مطالعہ کے لئے بلا واسطہ میدانی مطالعہ کیا، جس بناء پر وہ دیگر علماء کی طرح نباتات کو مجرد طبی دواؤں کی حیثیت سے نہیں دیکھتے، بلکہ ان کی طبی نافعیت سے زیادہ سماجی منفعت مثلاً کھانے، رنگنے، تزئین کاری وغیرہ میں اس کے فوائد گناتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے گذشتہ تالیفات کے عمیق مطالعہ اور اپنی وسیع میدانی تجربات سے بہت سی ایسی نباتات کی مفصل وضاحت کی ہے، جو پہلے غیر واضح یا مشتبہ تھیں۔ اسی طرح ابن الرومیہ نے اپنی تحقیق سے بہت سی ایسی نباتات کا اضافہ کیا، جو اس سے پہلے معروف نہ تھیں، ابن الابار نے لکھا ہے کہ نباتات کی معرفت اور پودوں کے درمیان تفریق و تمیز میں ابن الرومیہ اپنے تمام معاصرین پر فائق تھے۔

ابن الرومیہ نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں ''الرحلۃ النباتیہ''، ''تفسیر اسماء الادویۃ المفردۃ''، ''مقالۃ فی ترکیب الادویۃ'' اور ''الرحلۃ المستدرکۃ'' وغیرہ شامل ہیں۔ ابن الرومیہ کی وفات 637ھ/1240ء میں اشبیلیہ میں ہوئی۔

5.6.5 ابن البیطار

ابو محمد عبد اللہ بن احمد مالقی، اپنے وقت کے تمام علمائے نباتات کے امام، اندلس کے مشہور شہر مالقہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ان کے والد حیونات کے طبیب (Veterinary Doctor) تھے، جس کو عربی میں بیطری کہا جاتا ہے، اس وجہ سے وہ ابن البیطار کے نام سے معروف ہوئے۔ بچپن میں ابن البیطار اپنے قریب کے جنگل میں جا کر نباتات کا مشاہدہ کرتے تھے، فطرت سے محبت ان کی طبیعت میں رچی ہوئی تھی، حیوانات اور نباتات کا تنوع ان کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ ابن البیطار نے مشہور اندلسی عالم نباتات ابن الرومیہ سے تعلیم حاصل کی، جو اشبیلیہ میں نباتات اور اعشاب جمع کرتے تھے، اور اس فن میں اپنے استاذ سے بھی فوقیت لے گئے، اپنی سائنسی تحقیق اور تجرباتی علم میں وہ تمام معاصر علمائے نباتات سے آگے بڑھ گئے۔ آغاز شباب میں رخت سفر باندھا، دنیا میں پائے جانے والے نباتات کے وسیع اور تحقیقی علم کے حصول کے لئے اندلس سے نکل کر یوروپ میں روم اور یونان تک کا سفر کیا، پھر مراکش، الجزائر، تونس کے علاقوں کی خاک چھانی، اپنے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے انطاکیہ ہوتے ہوئے ایشیائے کوچک پہونچے، پھر ملک شام کا قصد کیا، اور بیت المقدس، بیروت، حجاز گئے، مصر میں بھی ایک مدت تک رہے۔ ان تمام علاقوں میں وہ وہاں کے علمائے نباتات سے ملتے، ان علاقوں میں پائے جانے والے پودوں، دواؤں اور نباتات کا بذات خود مشاہدہ کرتے، اور اس کو قید تحریر میں لاتے، وہاں کے موسم، پانی اور مٹی کی خاصیتوں کا بھی مطالعہ کرتے۔ ابن ابی اصیبعہ کہتے ہیں کہ

جب ابن البیطار دمشق پہونچے تو میں ان کے اخلاق اور علم سے بہت متاثر ہوا، میں نے ان کے ساتھ شہر دمشق کے مضافات میں متعدد نباتات کا مشاہدہ کیا، ان کے وسیع مطالعہ اور علم وفہم سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ ابن البیطار کو قدماء کی کتابوں پر عبور حاصل تھا، وہ جب کسی پودے یا پھول یا دوا کے بارے میں گفتگو کرتے تو یونانی، رومی، ایرانی، ہندی علماء کے حوالہ سے پہلے ان کی معلومات فراہم کرتے، پھر عرب علمائے نباتات ابن سینا، ادریسی، ابو العباس وغیرہ کے اقوال نقل کرتے، پھر اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں کلام کرتے۔ ابن البیطار کو یونانی اور لاطینی زبان پر بھی قدرت تھی، اور وہ یونانی کتابوں کو اسی زبان میں پڑھتے تھے۔ جب وہ مصر پہونچے تو وہاں ملک کامل نے ان کو رئیس العشابین کا منصب عطا کیا۔

ابن البیطار نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں سب سے مشہور "الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ" ہے، یہ کتاب دواؤں اور غذاؤں میں استعمال ہونے والی نباتات کا انسائکلو پیڈیا ہے، جو اس عظیم سائنس داں کی عمر بھر کی محنت، جستجو اور تجربات ومطالعات کا نچوڑ ہے، کتاب کی تالیف میں انہوں نے 150 کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ابن البیطار نے کتاب کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ متقدمین ومتاخرین کے اقوال وآراء میں سے جو بات میرے مشاہدہ اور نظر کے مطابق صحیح ہوگی اس کو میں خزانہ کی طرح کتاب میں محفوظ کردوں گا، اور جو حس ومشاہدہ میں خاصیت وکیفیت اور منفعت وماہیت کے اعتبار سے درست نہ ہوگی، اس کو میں ترک کردوں گا۔ مصنف نے کتاب کو حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، اور دواؤں کے ناموں کو بہت دھیان سے دقیق انداز میں مرتب کیا ہے، تاکہ نقل کرنے والوں سے غلطی نہ ہو، نیز نباتات کی خصوصیات، منافع، تجربات، ان کو محفوظ کرنے کے طریقے، اور ان کی نشوونما کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ ابن البیطار کے کارناموں میں سے یہ بھی ہے کہ انہوں نے پودوں سے سرطان کے علاج کا طریقہ دریافت کیا۔

ویل ڈیورانٹ نے لکھا ہے کہ ابن البیطار نے طب اور نباتات کی جامع کتاب تصنیف کی، اس کتاب میں انہوں نے 1400 دواؤں کا تعارف کرایا ہے، جن میں 300 دوائیں ان سے پہلے معروف نہیں تھیں، انہوں نے ان کی کیمیاوی تحلیل اور علاج کی خصوصیات دریافت کیں، اور امراض کے علاج میں اس کو استعمال کرنے کے طریقوں کے متعلق اپنے دقیق ملاحظات کا اضافہ کیا۔ جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ ابن البیطار نے اپنی کتاب میں تمام دواؤں کے نام کئی زبانوں میں لکھے ہیں، اور علمائے یوروپ میں ان کی کتاب نشأۃ ثانیہ کے دور تک متداول رہی ہے۔ اس کتاب کا لاطینی، ترکی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ لوئیس لیکرک (L. Leclerc) نے کیا ہے۔

ابن البیطار کی ایک اور اہم کتاب "المغنی فی الادویہ المفردہ" ہے، جس کو بیس فصلوں میں منقسم کیا ہے، اس کتاب میں ان دواؤں کا تذکرہ ہے، جن سے کوئی طبیب بے نیاز نہیں رہ سکتا، اس میں اعضائے جسمانی کے علاج میں کام آنے والی دواؤں کو اطباء اور طلباء کے لئے مختصر اور مفید طریقہ سے ترتیب اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان تالیفات اور علم نباتات میں مہارت کی بنیاد پر ابن البیطار کو امام النباتیین اور شیخ العشابین وغیرہ کے القاب سے نوازا گیا۔

نباتات کی تحقیق میں ابن البیطار نے زندگی گذاری، آخری وقت تک وہ اسی مشغلہ میں رہے، ایک پودے سے دوا تیار کررہے تھے کہ اس پودے کے مسموم مادہ کے اخراج سے ان کی موت واقع ہوگئی۔ ان کی وفات دمشق میں 646ھ/1248ء میں ہوئی۔

5.6.6 رشید الدین الصوری

ابو منصور رشید الدین بن ابی الفضل صوری، لبنان کے ایک ساحلی شہر ''صور'' میں 573ھ/1177ء میں پیدا ہوئے، موفق الدین عبد العزیز اور موفق الدین عبداللطیف بغدادی سے علم طب حاصل کیا، بیت المقدس کے بیمارستان میں دو سال خدمت انجام دی، علم نباتات، طب، دوا سازی اور خواص ادویہ میں کمال حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے تمام معاصرین میں اس فن میں فوقیت لے گئے، ایوبی خاندان کے تین بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے، رئیس الاطباء کے منصب پر بھی فائز ہوئے، اور دمشق میں مستقل قیام کیا، جہاں علم نبات اور علم طب میں ان کے بہت سے شاگرد ہوئے، ان کو شاگردوں تک معلومات پہونچانے میں ملکہ حاصل تھا، وہ علم نباتات کی تدریس میں رنگوں کے استعمال کی اہمیت کو جانتے تھے، ان کے پاس شاگردوں کا مجمع رہتا، جنھوں نے ان سے استفادہ کیا۔

علم نباتات میں رشید الدین صوری کا بہت بلند مقام ہے، انہوں نے اس علم کے حصول میں تحقیقی، تطبیقی اور مشاہداتی منہج کو اپنایا، جو مسلمان سائنس دانوں کا امتیاز رہا ہے، ان کو نباتات دریافت کرنے کا بہت شوق تھا، وہ نادر اور کمیاب نباتات کی تلاش میں مختلف علاقوں، جنگلات اور پہاڑوں میں پھرتے رہتے، اور ہر علاقہ کی مخصوص نباتات کا معائنہ کرتے۔ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایک مصور کو بھی رکھا کرتے، اس کو لیکر ان علاقوں میں جاتے جہاں مطلوبہ نباتات موجود ہوتیں، وہ مصور کو ان کا رنگ، پتیوں کی تعداد، ڈالیاں اور جڑوں وغیرہ کا بغور ملاحظہ کراتے، مصور اپنے ساتھ مناسب روشنائیاں اور رنگ رکھا کرتا، اور ان کی بتائی ہوئی نباتات، پودوں اور پھولوں کی تصاویر تیار کرتا، پودوں اور نباتات کی تصویریں تیار کرنے میں رشید الدین صوری کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مصور کو پودے کی ابتدائی حالت کا مشاہدہ کراتے، جب کہ پودے کی کونپلیں پھوٹتیں، اس حالت کی تصویریں تیار کراتے، پھر جب پودوں پر کلیاں آتیں، پھر جب پودا اپنے شباب کو پہونچتا، پھر جب پودا سوکھنے لگتا، وہ ان تمام مرحلوں کی الگ الگ تصویریں تیار کراتے۔ اس طرح قاری کو ایک ہی پودے یا نبات کے مختلف ادوار کے بارے میں بیک وقت معلومات مہیا ہو جاتیں۔

انہوں نے نہ صرف پہلے سے متعارف نباتات کی تفصیلات مہیا کیں؛ بلکہ بہت سی ایسی نباتات کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، جو اس وقت تک معروف نہ تھیں۔ ان کی دو کتابیں اس سلسلہ میں معروف ہیں، ایک ''کتاب الادویۃ المفردۃ'' ہے، جن میں مفرد دواؤں کا احاطہ کیا ہے، یہ کتاب عربی زبان میں نباتات سے متعلق پہلی باتصویر کتاب ہے، اس کتاب میں انہوں نے 585 دواؤں کا تذکرہ کیا ہے، جن میں سے 466 نباتات کی قبیل سے ہیں۔ ایک اور کتاب ''کتاب الرد علی کتاب التاج'' ہے، جو باتصویر ہے۔

رشید الدین صوری کی وفات دمشق میں 639ھ/1241ء میں ہوئی۔

معلومات کی جانچ

1. ابو حنیفہ دینوری کی کتاب النبات پر ایک نوٹ تحریر کیجئے۔
2. ماہر نباتات کی حیثیت سے ابن البیطار کا تعارف کرائیے۔
3. علم نباتات میں رشید الدین صوری کی حصہ داری کو نمایاں کیجئے۔

5.7 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے جانا کہ:

☆ اسلام کی روح نے اپنے پیروؤں میں تحقیق ودریافت کا مزاج پیدا کیا، مسلم ملکوں میں اطباء، کیمیاء داں، ماہرین حیوانیات ونباتیات پیدا ہوئے، جنہوں نے بیش بہا تحقیقات سے اور اختراعات سے ان علوم کو اس بلندی تک پہونچا دیا، جس کی بنیاد پر ان علوم کی موجودہ عمارت قائم ہے۔

☆ مسلمان حکمرانوں اور علماء وعوام نے دوسری قوموں سے علم حاصل کرنے میں بخل یا تنگ نظری سے کام نہیں لیا، بلکہ وسعت، فراخ دلی اور قدردانی کے ساتھ ان سے سائنسی علوم کو حاصل کیا، ان کی اصلاح کی، اور ان کو ترقی دی۔

☆ محمد بن زکریا رازی قرون وسطی کے بہت عظیم طبیب تھے، جنہوں نے الحاوی فی الطب، المنصوری اور صفۃ المارستان جیسی نفع بخش کتابیں تحریر کیں، انہوں نے الرجی کے مرض کو دریافت کیا، نیز چیچک کے مرض کی سب سے پہلے صحیح تشخیص کی، اور اس کا ٹیکہ ایجاد کیا۔ ان کی کتابوں سے یوروپ نے بہت استفادہ کیا۔

☆ ابوعلی ابن سینا نے علم طب کی ترقی میں اہم خدمات انجام دیں، انہوں نے اینکلوسٹوما، فائلیریا سس وغیرہ نامی طفیلیے دریافت کئے، متعدی امراض کے پھیلنے کے طریقے بتائے، گردن توڑ بخار کی وضاحت کی، خون روکنے کے کئی طریقوں کی وضاحت کی، دانت کے خلاء کو بھرنے والے مادوں کا ذکر کیا۔ ان کی سب سے مشہور کتاب القانون فی الطب ہے، جو یوروپ میں کئی صدیوں تک طب کا مرجع بنی رہی۔

☆ ابن الجزار قیروانی مشہور طبیب اور ماہر امراض اطفال تھے، ان کی کتابوں میں الادویہ المفردہ، زاد المسافر وقوت الحاضر اور سیاسۃ الصبیان وتدابیرھم ہیں۔ ان کی کتابوں کو مغرب میں عظیم شہرت حاصل ہوئی۔

☆ ابوالقاسم زہراوی قرون وسطی کے سب سے عظیم جراح تھے، ان کی کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف کئی صدیوں تک فن جراحت میں اہم مرجع رہی، انہوں نے جراحت کے لئے کئی آلات ایجاد کئے، ان کی تصویریں بھی اپنی کتاب میں بنائی ہیں، انہوں نے عمل جراحی کے دوران جراح کو اہم ہدایات دی ہیں، ان کو جدید سرجری کا باوا آدم بھی سمجھا جاتا ہے۔

☆ ابومروان ابن زہر کو علم طب میں اونچا مقام حاصل ہوا، کئی امراض کو دریافت کیا، مصنوعی تغذیہ کے لئے نلی کا استعمال کیا۔ ان کی کتاب التیسیر فی المداواۃ والتدبیر اور الاقتصاد فی اصلاح النفس والاجساد نے دنیا کو بہت متاثر کیا۔

☆ ابن النفیس اپنے دور کے عظیم طبیب تھے، ان کی اہم کتاب الشامل کے علاوہ شرح تشریح القانون بھی ہے، ان کا سب سے اہم کارنامہ دوران خون کا اکتشاف ہے۔

☆ عبد اللطیف بغدادی نے ذیابطیس (شوگر کے مرض) کا اکتشاف کیا، اور تحقیق وتجربہ سے کئی باتوں کی اصلاح کی۔ ان کی اہم کتاب الکفایہ فی التشریح ہے۔

☆ علم کیمیاء میں مسلمان کیمیاء دانوں کی اہم حصہ داری رہی ہے، جس کی وجہ سے علم کیمیاء کی کئی اصطلاحات عربی زبان سے من وعن دیگر یوروپی زبانوں میں منتقل ہوئیں۔

☆ جابر بن حیان کو عربوں میں علم کیمیاء کا باوا آدم کہا جاتا ہے، انہوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں، انہوں نے گندھک کا تیزاب، کاسٹک سوڈا، پوٹاشیم کاربونیٹ اور سوڈیم کاربونیٹ تیار کئے۔

☆ محمد بن زکریا رازی طبیب کے ساتھ ماہر کیمیاء داں بھی تھے، انہوں نے اس موضوع پر سرالاسرار نامی کتاب تحریر کی، الکوحل تیار کیا، سیال مادوں کی کثافت نوعی کا اندازہ کیا۔

☆ مسلمہ مجریطی نے سب سے پہلے بقائے مادہ کا قانون متعارف کرایا، اور بتایا کہ کیمیائی تبدیلی سے پہلے تمام اشیاء کی کل کمیت، کیمیائی تبدیلی کے بعد کی کل کمیت کے برابر ہوتی ہے۔ انہوں نے پارہ کا آکسائڈ تیار کیا، مادہ کا وزن نوعی معلوم کرنے کے لئے حساس ترازو بنایا۔

☆ عز الدین جلدکی نے کیمیائی تجربے کئے، قانون تناسب دریافت کیا، مضر گیسوں سے بچنے کے لئے ماسک پہنے کی تجویز کی، نائٹرک ایسڈ سے سونے چاندی کو الگ کیا۔

☆ علم حیوانیات میں جاحظ کا رتبہ بہت بلند ہے، اپنی کتاب الحیوان میں حیوانات کی فطرت، حالات اور عادات سے بحث کی ہے، جانوروں کی تقسیم بیان کی، ان کی زندگی کے مراحل سے گفتگو کی، وہ پہلے ماہر حیوانیات تھے جنہوں نے تجربہ اور مشاہدہ پر اس علم کی بنیاد رکھی۔

☆ زکریا قزوینی نے اپنی کتاب عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات میں حیوانات کی تقسیم بیان کی، سمندر اور خشکی میں پائے جانے والے حیوانات کے بارے میں گہری اور دقیق معلومات دیں، حیوانات پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا بھی ذکر کیا ہے۔

☆ کمال الدین دمیری کا اہم کارنامہ حیاۃ الحیوان کی تصنیف ہے، جس میں ایک ہزار سے زائد حیوانات کا تذکرہ ہے، وہ جانور کی پیدائش سے لیکر نشوونما کے مراحل تک کی تفصیل ذکر کرتے ہیں، ان کی کتاب میں اس موضوع کی قدیم کتابوں کا خلاصہ آگیا ہے۔

☆ علم نباتیات میں ابوحنیفہ دینوری نے کتاب النبات تصنیف کی، جس میں انہوں نے جزیرۃ العرب میں پائی جانے والی نباتات کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، ان کی ذکر کردہ نباتات کی تعداد گیارہ سو سے زائد ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر دواسازی کے نصاب میں داخل رہی ہے۔

☆ ابوالعباس ابن الرومیہ نے نباتات کے مشاہدہ کے شوق میں کئی ملکوں کا سفر کیا، اور اپنی مشہور کتاب الرحلۃ النباتیہ تصنیف کی، جس میں نباتات کے طبی فوائد کے علاوہ سماج کو کام آنے والے عمومی فوائد بھی بیان کئے ہیں، نباتات کی معرفت اور پودوں کے درمیان تمیز کرنے میں وہ اپنے تمام معاصرین پر فائق تھے۔

☆ ابن البیطار نے نباتات کی تحقیق میں یوروپ اور عالم اسلام کے جنگلات کا سفر کیا، ہر علاقہ کی نباتات کا اور مٹی و پانی کی خصوصیات کا مطالعہ کیا، الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ نامی کتاب لکھی۔ 1400 دواؤں کا تعارف پیش کیا، جن میں 300 دوائیں پہلے سے

معروف نہیں تھیں۔ ان کا لقب رئیس العشابین تھا۔

☆ رشید الدین صوری نے نادر نباتات کی تلاش میں جنگلوں، پہاڑوں کی خاک چھانی، ہر علاقہ کی مخصوص نباتات کا مطالعہ کیا، ان کی کتاب ''کتاب الادویہ المفردہ'' علم نباتات میں پہلی باتصویر کتاب ہے، جس میں پودوں کے تمام مراحل کو رنگین تصاویر میں ظاہر کیا گیا ہے۔

5.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجئے۔

1۔ علم طب میں مسلمانوں کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے چند مسلمان اطباء کے نام تحریر کیجئے۔

2۔ ابن سینا کے طبی کارناموں پر مختصر اروشنی ڈالئے۔

3۔ جابر بن حیان نے علم کیمیا کو فروغ دینے میں کیا کردار ادا کیا؟

4۔ مسلمانوں میں علم بناتات کی ابتداء اور ارتقاء پر ایک نوٹ لکھئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجئے۔

1۔ علم کیمیاء میں مسلمانوں کی گراں قدر خدمات کا جائزہ لیجئے، اور دو مسلمان کیمیادانوں کا تعارف پیش کیجئے۔

2۔ علم طب میں رازی اور ابن النفیس کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالئے۔

3۔ زکریا قزوینی اور کمال الدین دمیری کے حوالہ میں علم حیوانات میں مسلمانوں کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

4۔ مسلمانوں میں علم نباتیات کی ابتداء اور ارتقاء پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجئے۔

5.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

قرون وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے — ڈاکٹر غلام قادر لون — مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی، 2014

دنیائے اسلام میں سائنس اور طب کا عروج — ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی — اریب پبلیکیشنز، 2014

سو عظیم سائنس داں — رفیق انجم، ابراہیم عمادہ — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013

سائنسی ترقی میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمات — حافظ زاہد علی — اریب پبلیکیشنز، دہلی 2013

اسلام سائنس اور مسلمان — ترتیب: ابوعلی عبدالوکیل — اریب پبلیکیشنز، دہلی 2012

مسلمان اور سائنس — پرویز امیر علی ہود بھائی — اریب پبلیکیشنز، دہلی 2012

طبقات الاطباء والحکماء	ابن جلجل ،سلیمان بن حسان اندلسی	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
عیون الانباء فی طبقات الاطباء	ابن ابی اصیبعہ ،احمد بن قاسم	دار مکتبہ الحیاۃ، بیروت
تاریخ العلوم عند العرب	ڈاکٹر عمر فروخ	طبع: دار العلم للملایین ، بیروت
الحضارۃ الاسلامیہ العربیہ	ڈاکٹر شوقی ابو خلیل	دار الفکر، بیروت، دمشق
الکیمیاء عند العرب	روحی الخالدی	مؤسسۃ ہنداوی للتعلیم والثقافہ، قاہرہ، مصر
اسہام علماء العرب والمسلمین فی علم النبات	ڈاکٹر علی عبداللہ دفاع	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
تاریخ النبات عند العرب	احمد عیسی	مؤسسۃ ہنداوی للتعلیم والثقافہ، قاہرہ، مصر
اسہامات العرب فی علم النبات	الندوۃ العالمیہ الثالثہ لتاریخ العلوم عند العرب،	مطبوعہ مؤسسۃ الکویت للتقدم العلمی
موسوعۃ عباقرۃ الاسلام	ڈاکٹر محمد امین فرشوخ	دار الفکر العربی، بیروت
قصۃ الحضارۃ	ولیم جیمس ڈیورانٹ	ترجمہ ڈاکٹر زکی نجیب محمود وغیرہ ناشر: دار الجیل، بیروت
شمس العرب تسطع علی الغرب	زیغر ید ہونکہ	ترجمہ فاروق بیضون، کمال دسوقی ناشر دار الجیل، بیروت

اکائی 6 : طبیعیات، فلکیات اور ریاضیات

اکائی کے اجزاء

6.3 علم طبیعیات (Physics)

6.3.1 مسلمان اور علم طبیعیات

اسلامی تہذیب کی نشوونما کے ساتھ تمام علوم میں ترقی ہوئی، اور ترجمہ کی تحریک کے ساتھ ہی مسلمانوں میں مختلف علوم کے باکمال افراد پیدا ہوئے، مسلمانوں نے ہندوستان اور یونان کے علم طبیعیات کو حاصل کیا، ارسطاطالیس کی کتاب الطبیعہ، ارشمدلیس کی تحریریں، اسی طرح دیگر یونانی علمائے طبیعیات کی کتابیں اس علم کے فہم وترقی میں ان کا اہم مصدر تھیں، یونانیوں نے فطرت کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کے لئے عموماً فلسفہ کو بنیاد بنایا، اور عقلی موشگافیوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کی، ان کی کوششوں میں ہم کو تجربہ کا کوئی قابل لحاظ کردار نظر نہیں آتا۔

طبیعیات کو مسلمانوں نے اپنی ذکاوت وذہانت کا استعمال کرتے ہوئے تجربہ اور استقراء کے ذریعہ سے طبعیات کو ایک مستقل علم کی حیثیت عطا کی، اس کو ملاوٹوں سے پاک کیا، ان کی درجہ بندی اور تقسیم کی، مختلف علوم آپس میں خلط ملط تھے ان کو الگ کیا، تجربہ کے ذریعہ سے ان کے اصول وضوابط کو منظم کیا، اور پھر ان کو ترقی دی۔ انہوں نے خلاء، آواز، حرکت، وزن نوعی، جامد اور سائل مادوں، روشنی اور قوت کے قوانین دریافت کئے، ان میدانوں میں تجربات کئے، اور اصول کو مرتب کرتے ہوئے ان کو تجربہ سے مؤکد کیا۔ اور علوم کی ترقی کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے ان کی رفتار کو بڑھایا۔ یہ جاننا چاہئے کہ طبیعیات وہ علم ہے جس میں مادہ، اس کی حرکت اور توانائی کے علم اور ان کے باہمی تعلق سے بحث کی جاتی ہے۔ قدرت کی چار اہم بنیادیں زمان، مکان، مادہ اور توانائی ہیں، اور طبیعیات فطرت یا قدرت کی ان بنیادوں کے اصول وقوانین کے مطالعہ کا نام ہے۔ علم فلکیات، ریاضیات، اور کیمیاء بھی اسی علم کے دائرہ میں آتے ہیں، البتہ ان علوم میں مسلم سائنس دانوں کی خدمات کو مستقل طور پر بیان کیا گیا ہے، ان کے علاوہ طبیعیات کے دیگر شعبوں میں جو مسلمان سائنس داں گذرے ہیں ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

6.3.2 فارابی

ابونصر محمد بن محمد بن طرخان، فارابی، نہر جیحون کے قریب فاراب نامی علاقہ میں 257ھ/873ء میں پیدا ہوئے، ترکی الاصل تھے، ان کے والد فوج میں ملازم تھے، طلب علم کے لئے سفر کیا، حران میں جو یونانی علوم کا مرکز تھا یونانی علوم کو حاصل کیا، پھر بغداد پہونچے یہاں بھی مشاہیر سے فلسفہ ومنطق کا درس لیا، موسیقی، کیمیا، ریاضیات، طب، فلکیات اور مختلف علوم میں کمال پیدا کیا، فلسفہ وحکمت میں ایسی مہارت بہم پہونچائی کہ معلم ثانی کا لقب ملا، بغداد سے سیف الدولہ حمدانی کے دربار کا قصد کیا، اور حلب اور دمشق میں عمر کا اکثر حصہ گذارا، وہ دمشق کے غوطہ نامی باغات میں بیٹھ کر غور وفکر کرتے، اور اپنی کتابیں تحریر کرتے، مصر میں بھی قیام کیا، اور وہاں اپنی مشہور کتاب السیاسۃ المدنیہ، اور آراء المدینہ الفاضلہ کو مکمل کیا۔ فلسفہ میں فارابی کا مقام بہت بلند تھا، وہ فیلسوف الاسلام اور معلم ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے، ارسطو کے فلسفہ کی تشریح میں انہوں نے کتابیں اور شروحات تصنیف کیں۔

علم طبیعیات میں بھی فارابی کا مقام بلند ہے، انہوں نے سب سے پہلے خلاء کے وجود پر گفتگو کی، اور اس بحث کو فزکس میں داخل کیا، ان سے پہلے یہ مفہوم علماء کے ذہنوں میں واضح نہ تھا، عجیب بات یہ ہے کہ فارابی نے اپنی کتابوں میں سب سے پہلے کشش ثقل کا نظریہ پیش

کیا، اور نیوٹن سے ایک ہزار سال پہلے زمین کی کشش ثقل کو بیان کیا، طبیعیات میں ان کی کتاب المقالات الرفیعۃ فی علم الطبیعۃ کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ کتاب الزمان، کتاب المکان اور کتاب الخلاء کے نام سے انہوں نے مقالات تحریر کئے۔

ان کی اہم کتابوں میں کتاب الموسیقی الکبیر ہے، جس میں انہوں نے آواز پر طبیعیاتی نقطہ نظر سے بھی بحث کی ہے۔ موسیقی میں ان کی ایک اور کتاب المدخل الی صناعۃ الموسیقی بھی ہے، انہوں نے موسیقی میں قانون نامی آلہ ایجاد کیا، اور ایک تار سے بجنے والے اور دو تار سے بجنے والے رباب کا وصف بیان کیا، انہوں نے کئی سروں اور آوازوں کے نام بھی رکھے، جو آج تک مستعمل چلے آرہے ہیں۔ وہ ریاضیات کے بھی ماہر تھے، ان کی کتابیں المدخل الی الہندسہ الوہمیہ، اور الاسرار الطبیعیہ فی دقائق الاشکال الہندسیہ جیومٹری میں ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں، فارابی نے موسیقی اور ریاضیات میں تعلق کی تشریح کی، اور اس طرح علم لوگیریثم کی شروعات کی۔

فارابی نے کئی کتابیں تصنیف کیں، تحصیل السعادہ، احصاء العلوم، علم النفس، فصوص الحکمہ، اسماء العقل، وغیرہ ہیں۔ فارابی طبیب بھی تھے، علم طب میں انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں فصل فی الطب، علم المیزان والاوزان، المبادی التی بہا قوام الاجسام والامراض وغیرہ ہیں۔

فارابی نے ساری عمر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کی، اور دمشق میں 339ھ/950ء میں ان کا انتقال ہوا۔

6.3.3 ابن الہیثم

ابوعلی حسن بن الہیثم، بصرہ میں 354ھ/965ء میں پیدا ہوئے، طب، ریاضیات، فلکیات اور بصریات میں کمال پیدا کیا، اور کئی کتابیں تصنیف کیں، ملک مصر میں دریائے نیل کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس پر بندھ باندھ کر تمام سال اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، کیوں کہ وہ ایک بلند مقام سے اتر کر بہتی ہے، ان کے اس منصوبہ کی خبر فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ کو پہونچی، اس نے ابن الہیثم کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، اور انعام واکرام کا معاملہ کیا، پھر ان سے کہا کہ آپ نے دریائے نیل پر بندھ تعمیر کرنے کی بات کی تھی، اس کی تکمیل کی فکر کیجئے، ابن الہیثم نے ایک ٹیم کے ساتھ نیل کے سواحل کا جائزہ لیا، اور ایک مقام پر نیل کے پانی اور اس کے کناروں کا جائزہ لیا، لیکن ان کو محسوس ہوا کہ ان کے زمانہ کے آلات اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ اتنا بڑا کام شروع کیا جاسکے، انہوں نے حاکم بامر اللہ سے معذرت کی اور عذر بیان کیا، لیکن خلیفہ نے ان کے عذر کو قبول نہیں کیا، تمام اموال وخلعت واپس لیکر ایک دفتر میں ان کو ملازم رکھدیا، ابن الہیثم کو محسوس ہوا کہ حاکم کی ناراضی ان کے لئے خطرہ کا سبب نہ بن جائے، اس لئے انہوں نے جنون کا بہانہ کیا، خلیفہ کی موت کے بعد وہ دوبارہ اپنے علمی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے، جامع مسجد ازہر کے ایک گنبد میں تصنیف وتالیف، درس وافادہ میں مشغول ہوگئے۔ ابن الہیثم نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ اگرچہ کہ اس دور کے امکانات اور آلات کے مساعدنہ ہونے سے پورا نہ ہوسکا، لیکن اس سے اس کی دور بینی اور مہارت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے، مصری عالم ڈاکٹر احمد شوقی لکھتے ہیں کہ ابن الہیثم نے بندھ تعمیر کرنے کے لئے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ اسوان شہر کا وہ مقام ہے جہاں آج نیل کا ڈیم سد عالی موجود ہے۔

ابن الہیثم نے مختلف علوم میں سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سب سے مشہور کتاب المناظر ہے، جس میں سات مقالے ہیں، اس کتاب کا لاطینی میں 1572ء میں (Opticae Thesaurus) بصریات کا خزانہ کے نام سے ترجمہ ہوا، اور یوروپ میں روشنی اور

بصریات کے میدان میں اس نے گہرے اثرت چھوڑے ہیں، راجر بیکن نے اپنی تحریروں میں نام لیکر ابن الہیثم کے مقالات سے استدلال کیا ہے، اور جوہانس کیپلر کی تحقیقات بھی واضح طور پر اس سے متاثر نظر آتی ہیں۔

اس کتاب کی وجہ سے ان کو بطلیموس ثانی کا لقب ملا، ابن الہیثم نے علم بصریات میں 20 سے زائد تحریریں چھوڑی ہیں، جن میں کتابیں، مقالات اور رسائل شامل ہیں، بصریات میں ان کا وہی مقام ہے جو حرکیات (Mecanic) میں نیوٹن کا ہے،

ان کی ایک اور اکتاب کیفیۃ الاظلال (سایہ کی کیفیت)، المرایا المحرقہ، اور مساحۃ المجسم المکافی کا جرمن زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ابن الہیثم نے اپنی کتاب المناظر میں سب سے پہلے اس نظریہ کو وضاحت اور دلیل کے ساتھ پیش کیا کہ روشنی کسی سطح شئے سے ٹکرا کر آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ اس طرح انہوں نے سب سے پہلے بطلیموس کے اس نظریہ کو مسترد کیا کہ روشنی آنکھ سے نکلتی ہے۔ کیوں کہ اگر روشنی آنکھ سے نکلتی تو آنکھ کھولتے ہی ایک لحہ میں لاکھوں میل دور ستاروں پر نہیں پڑسکتی، اسی طرح یہ دلیل دی کہ بہت تیز روشنی کو دیکھنے سے آنکھ متاثر ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اس کے بدلہ یہ کہا کہ رویت کا عمل کائنات کے ہر نقطہ سے روشنی کی شعاعیں نکل کر آنکھوں کی طرف آنے سے مکمل ہوتا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے ثابت کیا کہ روشنی ہمیشہ خط مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ اسی طرح ابن الہیثم نے الغرفۃ المظلمہ (Dark chamber) کا سب سے پہلے باریکی سے وصف بیان کیا، جس میں بتایا کہ روشنی کسی تاریک جگہ میں ایک باریک سوراخ سے داخل ہو تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، مغرب میں اسی نظریہ کو ترقی دیکر کیمرہ بنایا گیا۔

ابن الہیثم مشہور طبیب بھی تھے، طب اور دوا سازی میں انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کو آنکھوں کی سرجری میں کمال حاصل تھا، انہوں نے آنکھ کے عضو کی تشریح بیان کی، اور اس کے مختلف گوشوں کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ انہوں نے بینائی پر نفسیاتی اثرات کا سب سے پہلے جائزہ لیا۔ بصریات میں ابن الہیثم کی خدمات نا قابل فراموش ہیں، انہوں نے کروی، محدب اور معقر عدسوں کا استعمال کرتے ہوئے وبصری نظام کی وضاحت کی، انہوں نے عدسہ کی تکبیر کے موضوع پر بھی اپنی تحقیقات پیش کیں۔ ابن الہیثم نے ایک کتاب قوس قزح پر بھی لکھی ہے، جس میں قوس قزح کے تعلق سے پائی جانے والی کہانیوں کی نفی کرکے اس کی وجوہات پر گفتگو کی ہے۔

ریاضیات میں بھی ابن الہیثم کا پایہ بہت بلند تھا، انہوں نے کتاب المناظر میں کروی آئینوں میں روشنی کے انعکاس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے چہار درجی مساوات کو بیان کیا ہے، اس مسئلہ کو "مسئلہ ابن الہیثم (Alhazen's problem) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جارج سارٹن لکھتے ہیں کہ ابن الہیثم عربوں کے سب سے عظیم عالم طبیعیات ہیں، بلکہ قرون وسطی کے علمائے طبیعیات میں سب سے عظیم ہیں، اور بصریات میں دنیا کے گنے چنے علماء میں ان کا شمار ہے۔ علمائے مغرب کے نزدیک ان کی شہرت Alhazen کے نام سے ہے، انہوں نے ان کو لاطینی زبان میں بطلیموس ثانی (Ptolemaeus Secundus) کا لقب دیا ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں چاند کے ایک دہانہ کا نام ان کے نام پر رکھا گیا، اور فروری 1997ء میں ایک نو دریافت شدہ سیارچہ (Minor Planet) کو بھی ان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ 430ھ/1040ء میں ابن الہیثم کی وفات ہوئی۔

معلومات کی جانچ

1. علم طبیعیات اور موسیقی میں فارابی کی حصہ داری کو بیان کیجیے۔

2. علم بصریات میں ابن الہیثم کی خدمات سے بحث کیجیے۔

6.4 علم فلکیات

6.4.1 علم فلکیات اور مسلمان

مسلمانوں میں علم فلکیات کی طرف توجہ اور اس کے تعلق سے اہتمام دینی اور علمی اسباب کی بنا پر ہوا، عہد خلفائے راشدین اور عہد اموی میں فتوحات کا دائرہ بڑھتا گیا، ہر شہر اور مقام پر نماز کے اوقات معلوم کرنے، قبلہ کا رخ متعین کرنے، رمضان، حج کے مہینوں کی تعیین کرنے کے لئے چاند اور سورج کے طلوع وغروب کے اوقات کا مشاہدہ کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، اسی طرح کسی بھی جگہ کا عرض البلد اور طول البلد جاننا بھی ضروری تھا۔ مسلمانوں میں علم الفلک دینی اور اجتماعی اسباب کے نتیجہ میں ترقی پاتا گیا، اسلام سے پہلے ہی سے عربوں کی خانہ بدوش صحرائی زندگی نیز طویل سرمائی اور گرمائی تجارت کی وجہ سے ان میں ستاروں سے راہنمائی کا کام لیا جاتا رہا، اور ان کا تعلق آسمانی تغیرات سے بڑھتا رہا، قرآن کریم میں ستاروں سے راستہ کی تلاش میں مدد ملنے کا نعمت کے طور پر تذکرہ ہے (سورہ نحل: 16)۔ فتوحات کی وسعت اور یونانی علوم کے تراجم کے نتیجہ میں مسلمانوں میں دیگر اقوام سے یہ علم منتقل ہوا، اور انہوں نے اپنی قدیم دلچسپی اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس کی طرف توجہ کی، اور مسلمانوں میں اس علم کے ماہر ترین افراد پیدا ہوئے، انہوں نے اولا اس علم پہلے سے موجود معلومات کی تحقیق کی، ان کی اغلاط کی تصحیح کی، تجربہ ومشاہدہ پر اپنے علم کی بنیاد رکھی، جو ہر علم میں مسلمانوں کی شان تھی، انہوں نے اپنی تخلیقات سے اس علم کے آلات میں بیش بہا اضافے کئے، نئے آلات بنائے، کتابیں تحریر کیں، زائچے بنائے، نقشے تیار کئے، رصد گاہیں قائم کیں، حکومتوں نے اس علم اور ماہرین فلکیات کی سرپرستی کی، اس طرح قرون وسطی میں اس علم کی ترقی وترویج کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھا۔

مسلمانوں کا عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے علم الفلک کو علم نجوم اور جوتش وغیب دانی سے الگ کیا، اور اس کو ایک فن کی حیثیت سے ترقی دی۔ اکائی کے اس حصہ میں، ہم فلکیات میں عظیم کارنامے انجام دینے والے مسلم سائنس دانوں کا تذکرہ پڑھیں گے۔

6.4.2 بنو موسی شاکر

موسی بن شاکر مامون کے دربار میں کے ایک منجم تھے، ان کی حالات زندگی غیر معروف ہیں، سوائے اس کے کہ ان کی ابتدائی زندگی ڈاکہ زنی میں گذری، پھر انہوں نے علم کی طرف توجہ کی اور علم نجوم میں کمال پیدا کیا، مامون نے مرو میں قیام کے زمانہ میں ان کو تقرب عطا کیا، (200ھ/815ء) میں جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنے پیچھے تین بیٹے محمد (متوفی 295ھ/873ء)، احمد اور حسن چھوڑے، اور خلیفہ مامون کو ان کی پرورش کی وصیت کی، مامون نے موسی بن شاکر کی وصیت کا خیال رکھا، اور تینوں بچوں کو بغداد کے حاکم اسحاق بن ابراہیم مصعبی کی نگرانی میں دیدیا، مامون کو ان کی تعلیم کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ وہ اسفار کے دوران حاکم بغداد کو تحریر کئے جانے والے ہر خط میں ان بچوں کے بارے میں دریافت کرتا، اسحاق بن ابراہیم نے ان کو تعلیم کے لئے بیت الحکمت میں داخل کردیا، اور بیت الحکمت کے صدر یحیی بن ابی منصور

فارسی کو جو علم نجوم اور فلکیات کے عالم تھے، ان کا تعلیمی انتظام سپرد کیا، اس طرح ان بچوں کی پرورش کتابوں، آلات علم اور علماء کے درمیان ہوئی، اور وہ اپنے زمانہ کے عظیم علماء میں ہوئے، اور تینوں نے مختلف علوم میں کمال حاصل کیا۔

جب تینوں نے اپنی تعلیم ختم کی تو مامون نے ان کو ایک جماعت کے ساتھ زمین کی پیمائش کرنے کے لئے مہم پر روانہ کیا، یہ قافلہ موصل کے قریب سنجار کے صحراء میں پہونچا، انہوں نے سورج کی شعاعوں کے زاویہ سے زمین کا محیط معلوم کرنے کا ارادہ کیا، اس کام کے لئے انہوں نے صحرائے سنجار کا ایک مسطح مقام منتخب کیا، اور وہاں قطب شمالی کا ارتفاع نوٹ کیا، پھر ایک کھونٹا زمین میں نصب کیا، اور اس میں ایک رسی باندھ کر شمال کی طرف اتنی دور تک گئے کہ قطب شمالی پہلے نقطہ کے مقابلہ مکمل ایک درجہ بلند ہوجائے، یہاں انہوں نے دوسرا کھونٹا نصب کیا، پھر دونوں کھونٹوں کے درمیان کی مسافت کو ناپا تو وہ معلوم ہوا کہ ایک درجہ کے بالمقابل 662/3 میل بنتے ہیں، اس طریقے کو انہوں نے مسطح مقام کے جنوب میں دہرایا تو نتیجہ ایک ہی نکلا، سنجار کے صحراء کے علاوہ انہوں نے کوفہ کے قریب ایک مسطح مقام پر اس کو دہرایا، یہاں بھی نتیجہ وہی نکلا۔ چونکہ فلک کے 360 درجہ ہیں، اس لئے اس کے نتیجہ میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کا محیط 24 ہزار میل ہے، اور دائرۃ البروج کا جھکاؤ 23 درجہ 35 ثانیہ ہے۔

بنوموسی نے بغداد کے قریب سامرا شہر میں ایک رصدگاہ قائم کی، اور اپنی متنوع صلاحتوں سے وہاں آلات رصد جمع کئے، جن میں سے کئی خود ان کے ایجاد کردہ تھے، اور ستاروں، نظام شمسی اور اجرام فلکیہ کا مشاہدہ کیا، اور باریکی سے ان کو مدون کیا، انہوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا، جو ایک دائرہ کے شکل کا تھا، اس میں حیوانات کی شکلیں اور ستاروں کی شکلیں ابھری ہوئی تھیں، اور پانی کی قوت سے وہ چلتا تھا، آسمان میں جب کوئی ستارہ غروب ہوتا تو اسی وقت اس آلہ میں بھی اس کی شکل غائب ہوجاتی تھی، اور جب کوئی ستارہ طلوع ہوتا تو اسی لحظہ اس دائرہ میں اس کی شکل نمودار ہوجاتی تھی۔

بنوموسی شاکر کے کارناموں کو الگ الگ کرکے دیکھنا بہت مشکل ہے، ان میں سے سب سے بڑے بھائی نے فلکیات اور ریاضیات میں کمال حاصل کیا، دوسرے بھائی احمد نے علم الحیل (Mechanics) میں مہارت حاصل کی، اور تیسرے حسن نے ہندسہ اور اعداد واشکال کے علوم میں مہارت حاصل کی، بیت الحکمت میں ان کو دار الترجمہ کی خدمت تفویض ہوئی تھی، وہ اپنے ذاتی اخراجات سے بھی دور دور سے مخطوطات اور نادر کتابیں حاصل کرتے اور ان کا ترجمہ کرواتے، انہوں نے ثابت بن قرہ اور حنین بن اسحاق جیسے مترجمین کی سرپرستی کی، علم الفلک میں انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں کتاب الجداول الفلکیہ، علۃ الاسطرلاب، کتاب حرکۃ الفلک الاولی، کتاب تقویم المنازل السیارہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان کے ذریعہ بنائے ہوئے فلکی جداول ایک طویل مدت تک قابل عمل رہے۔ یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کے دور عروج کے آغاز میں بنوموسی شاکر کے علمی وسائنسی کارناموں نے عالم اسلام کی سائنسی ترقی میں اہم کردار ادا کیا، بیرونی کا قول ہے: میرا ماننا ہے کہ آج بھی بنوموسی کی تحقیقات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

6.4.3 البتانی

ابوعبداللہ محمد بن جابر بن سنان البتانی، اپنے زمانہ کے مشہور عالم فلکیات، جن کو "بطلیموس عرب" کا خطاب دیا گیا، ان کو الصابی بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ ان کے آباء واجداد صابی مذہب کے ماننے والے تھے، تیسری صدی کے وسط میں حران (موجودہ جنوبی ترکی) کے گاؤں بتان

میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، فلکیات کے یونانی علماء کی کتابوں سے استفادہ کیا، اور 264ھ/878ء میں شہر رقہ میں فلکیاتی تحقیقات کا آغاز کیا جو تقریباً چالیس سال سے زیادہ تک جاری رہیں، اس دوران انہوں نے ایک مدت شہر انطاکیہ میں بھی گذاری۔ اپنے اس وسیع مطالعہ و مشاہدہ کے نتیجہ میں بتانی کو جو اس فن میں ایسا ملکہ پیدا ہوا کہ وہ علمائے اسلام کے سب لیس عظیم فلکیاتی عالم قرار پائے۔ شہرستانی نے لکھا ہے کہ بتانی کا شمار عظیم فلکیین، علمائے ریاضیات، نظری اور عملی علم فلک جاننے والوں میں ہوتا ہے، انہوں نے فلکیات پر ایک کتاب تحریر کی ہے، جس کے نقشہ جات کو شمس وقمر اور ان کی حرکات کے مشاہدہ اور ان کا باریکی سے وصف بیان کر کے مالا مال کیا ہے، اور اس باب میں وہ مجسطی میں بطلیموس کی دقیقہ رسی سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ انہوں نے کواکب خمسہ کی حرکت کو اپنے مشاہدہ کے ذریعہ زیادہ باریکی سے بیان کیا ہے، مسلمان علماء میں ستاروں کے حسابات اور ان کی حرکت کے علم میں کمال حاصل کرنے میں بے نظیر ہیں۔

بتانی نے بطلیموس کی تصنیفات کا گہرا مطالعہ کیا، اور ان پر عبور حاصل کیا، اور ان کی کئی آراء سے اختلاف کیا، اور اختلاف کا سبب بیان کیا، اس سلسلہ میں انہوں نے تجربہ، عقل اور منطق کے فیصلہ کو اہمیت دی، کئی اسباب کی بنا پر بتانی کی شخصیت اس علم کی ترقی میں اہمیت کی حامل قرار پاتی ہے، ان کے کارناموں نے بعد کے سائنسدانوں مثلاً تانکو براہی، کیپلر، گیلیلو گیلیلی، نیکولا کوپرنیکس گہرے اثرات ہیں۔ بتانی نے سورج کے مقامات کی جو تحدید کی ہے وہ کئی صدیوں بعد کوپرنیکس کی تحدید سے کہیں زیادہ درست ہے۔ بتانی نے اپنے فلکیاتی مشاہدات کو کام میں لاتے ہوئے انتہائی مہارت سے بطلیموس کی اغلاط کو درست کیا ہے، جن میں سے بیشتر ستاروں کے راستوں سے متعلق ہیں۔ بتانی نے اپنے طویل فلکی مشاہدات کے ذریعہ اجرام ساویہ کے تعلق سے کئی اہم نتائج اخذ کئے جن میں سے اکثر زمین کے دوران اور سورج کی سالانہ گردش کے متعلق ہے، بتانی نے ثابت کیا کہ زمین اور سورج کا فاصلہ سال بھر برابر نہیں رہتا، سورج گرہن اور چاند گرہن کے سلسلہ میں بھی بتانی نے اہم فلکیاتی مشاہدے کئے ہیں جن پر 1749 میں (Richard Dunthorne) نے چاند کی گردش کی رفتار متعین کرنے میں اعتماد کیا۔ اسی طرح بتانی نے رؤیت ہلال کے حالات متعین کرنے میں ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا۔

بتانی وہ پہلے سائنس داں تھے جنہوں نے ''سمت'' اور ''نظیر'' ((Azimuth and Nadir) کے متعلق گفتگو کی اور آسمان میں ان کے نقطوں کو طئے کیا، افلاک کا مشاہدہ کرنے والا جس مقام پر کھڑا ہوتا ہے تو اس کے سر کی سمت کو سمت الرأس کہتے ہیں، جس سے ایک خط کرہ سماویہ کے طول میں چلا جاتا ہے، اس کے بالمقابل اس کے قدم کی طرف سے جو خط مستقیم نکل کر جاتا ہے اس کے اسفل ترین نقطہ کو نظیر کہتے ہیں۔ بتانی نے آسمان میں 489 ستاروں کی تقسیم بیان کی۔ انہوں نے زمین سورج کے گرد گردش کرنے کی سطح پر اپنے محور پر 23 درجہ اور 35 دقیقہ جھکی ہوئی ہے، موجودہ تحقیق کے لحاظ سے اس میں صرف ایک دقیقہ کا فرق ہے۔ انہوں نے موسموں اور شمسی سال کی مدت کی تعیین کی، جو ان کے حساب سے 365 دن، 5 گھنٹے، 46 منٹ اور 24 سیکنڈ تھی، یہ مدت حقیقی مدت سے صرف دو منٹ اور 22 سیکنڈ کم ہے۔ بتانی کا شمار ان اولین لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تجربہ کیا کہ زمین گول ہے، اور ہر ستارہ ایک بیضاوی مدار میں گردش کرتا ہے۔

بتانی کی شہرت کی اصل وجہ جس نے ان کے نام کو دوام بخشا ان کی کتاب ''زیج الصابی'' ہے، جس میں انہوں نے اپنے فلکیاتی مشاہدات ذکر کئے ہیں، جو سترہویں صدی تک کے سب سے صحیح ترین مشاہدات ہیں۔ اس کتاب میں سورج اور چاند اور کواکب خمسہ کی حرکات، فلکی قوانین، فلکیاتی نقشہ جات اور ان کو پڑھنے کا طریقہ مذکور ہے۔

البتانی کو یوروپ میں (Albategnius) یا (Albategni) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بتانی کی کتاب نے یوروپ میں اپنا عظیم اثر چھوڑا ہے، اس کتاب کا 1116ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ قشتالہ کے بادشاہ الفانسو دہم کے حکم سے اس کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ ہوا، 1899ء میں کارلو لالند نے اس کی تحقیق کی اور عربی متن لاطینی ترجمہ کے ساتھ طبع کیا۔ بتانی کی عظیم خدمات کی وجہ سے چاند کے غاروں میں سے ایک غار کا نام ان کے نام پر رکھا گیا۔

محمد بن جابر بتانی کی وفات 317ھ/929ء میں سامرا کے قریب ہوئی۔

6.4.4 عبدالرحمٰن صوفی

ابوالحسین، عبدالرحمٰن بن عمر رازی، صوفی کے لقب سے شہرت پائی، 291ھ/903ء میں رے میں پیدا ہوئے، اپنے زمانہ کے علوم حاصل کیے، فلکیات میں مہارت حاصل کی، اور خاندان بنو بویہ کے بادشاہ عضد الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوئے، بادشاہ نے ان کے علم وفضل کی قدردانی کی، اور کواکب کے حرکات ومقامات کا علم حاصل کرنے کے لیے ان کو اپنا استاذ تسلیم کیا۔ صوفی کو مسلمانوں کا عظیم عالم فلکیات سمجھا جاتا ہے، انہوں نے بطلیموس کی کتاب مجسطی کو اپنی معلومات کی بنیاد بنایا، لیکن صرف نقل پر اکتفا کرنے کے بجائے تمام ستاروں کا مشاہدہ کیا، اور ان کے مقامات وحرکات کی تعیین کی، وہ اپنے تجربات کا مقابلہ بطلیموس کی کتاب سے کرتے، اور صحیح وغلط کی تعیین کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تجربات کی بنیاد پر کہا کہ زمین گول ہے۔ صوفی نے مختلف ستاروں کے طول وعرض کی تحدید کی، ستاروں کی گنتی کی، ایسے بہت سے نئے ستارے دریافت کیے جو پہلے معلوم نہیں تھے، پھر آسمان کا ایک نقشہ بنایا، جس میں ستاروں کے مقامات کی نشاندہی کی، حجم اور روشنی کی مقدار کے لحاظ سے ان کی شکلیں بنائیں، گذشتہ علماء کی غلطیوں کی تصحیح کے لئے ستاروں کی ایک فہرست مرتب کی، لویس رچرڈسن نے لکھا ہے: روشنی ناپنے کے آلہ (Photometer) کی ایجاد سے پہلے صوفی نے ایک ہزار سے زیادہ ستاروں کی چمک کی تعیین کی، ستاروں کی چمک کی مقدار کا اندازہ کرنے کا جو طریقہ انہوں نے بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے "E" کی طاقت کے معادلات کا استعمال کیا ہے، C. S. Pierce نے صوفی کے ذریعہ لگائے گئے اندازوں کا Harverd کے فوٹومیٹر کے ذریعہ لی گئی مقداروں سے کیا، تو دیکھا کہ دونوں میں عمومی طور پر Fechner کے "E" قانون (E = const. x In S) کے ساتھ توافق پایا جاتا ہے۔

مستشرق دومیلی کہتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف بطلیموس کے بیان کردہ ستاروں پر اضافہ کیا، بلکہ ان کے ملاحظات کی تصحیح کی، اور اس طرح بعد کے علمائے فلک کے لئے ان کواکب کو پہچاننے کی راہ ہموار کی جن کی تعیین یونانی ماہر فلکیات نے دقیق طور پر نہیں کی تھی۔

عبدالرحمٰن صوفی نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں کتاب التذکرہ، کتاب مطارح الشعاعات، ارجوزۃ فی الکواکب الثابتہ رسالۃ فی العمل بالاسطرلاب وغیرہ ہیں، ان میں سب سے مشہور صور الکواکب الثابتہ ہے، عمر فروخ لکھتے ہیں: یہ کتاب فلکیات کے موضوع پر لکھی گئی سب سے عمدہ کتاب ہے، اس کتاب میں صوفی نے آسمان کی تصویریں دی ہیں، انسانوں اور جانوروں کی شکلوں کے لحاظ سے کہکشاؤں کے نقشے بنائے ہیں اور رنگوں سے ان کو ظاہر کیا ہے، ان شکلوں کی وضاحت کی ہے، ان کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے، اور متقدمین پر استدراک کیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب صور الکواکب الثمانیہ والاربعین ہے، یہ کتاب بھی کہکشاؤں کی رنگین شکلوں سے مزین ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے 48 کہکشاؤں کے مقامات، آسمان میں ان کی ترتیب اور ان کے مواقع ذکر کئے ہیں، اس کتاب نے بعد کی صدیوں پر گہرا اثر ڈالا، جدید دور کے

بڑے علمائے فلک مثلاً (Pocock) اور (Ideler) نے صوفی کی اس کتاب پر مکمل اعتماد کیا ہے۔ صوفی پہلے فلکی ہیں جنہوں نے مشاہدہ کیا کہ ستاروں کا رنگ تبدیل ہوتا ہے، ان کے فلکی مراتب میں تغیر پیدا ہوتا ہے، انہوں نے ان ستاروں کی صحیح رفتار کا اندازہ لگایا، انہوں نے سب سے پہلے انڈرومیڈا کہکشاں کی دھند کا مشاہدہ کیا، اور اس کو ''لطخۃ سحابیۃ'' کا نام دیا۔ اہل یوروپ اس کہکشاں کا 1612ء میں ہی مشاہدہ کر سکے۔ صوفی نے کہا کہ عموماً ماہرین فلک سمجھتے ہیں کہ نجوم ثابتہ کی تعداد 1025 ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو ستارے ظاہر ہوتے ہیں ان کی تعداد اس سے زیادہ ہے، اور جو ستارے ظاہر نہیں ہوتے ان کی تعداد تو اور زیادہ ہے، صوفی نے 1022 ستاروں کی نشاندہی کی، جن میں 360 شمالی شکلوں میں، 346 دائرۃ البروج میں، اور 316 جنوبی شکلوں میں ہیں۔

یوروپ میں ان کو (Azophi) کے نام سے جانا جاتا ہے، عبدالرحمٰن صوفی کے عظیم کارناموں کے اعتراف میں چاند کے ایک دہانہ کا نام ان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ نیز ایک چھوٹے سے سیارہ کا نام بھی ان کے نام پر (Azophi 12621) رکھا گیا ہے۔ صوفی کی وفات 376ھ/986ء میں شیراز میں ہوئی۔

6.4.5 ابن یونس

ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن مصری، جو ابن یونس کے نام سے مشہور ہیں، علم وفضل میں معروف خاندان میں (342ھ/950ء) میں پیدا ہوئے، ان کے والد ابوسعید عبدالرحمٰن مشہور محدث اور مؤرخ تھے، دادا احمد بن یونس بھی جلیل القدر عالم تھے۔ ابن یونس صدفی اپنے زمانہ کے سب سے عظیم ماہر فلکیات تھے، مصر کے فاطمی حکام نے ان کی صلاحیتوں کی قدر کی اور ان کے لئے شہر فسطاط کے قریب جبل مقطم پر ایک رصدگاہ تعمیر کرائی، جہاں انہوں نے اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا، حاکم مصر عزیز باللہ نے ان کو فلکی جدول تیار کرنے کا حکم دیا، جس کی تعمیل میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب الزیج الحاکمی تصنیف کی، جو عزیز باللہ کے فرزند اور مصر کے دارالحکمت کے بانی حاکم بامراللہ کے دور میں مکمل ہوئی۔

جبل مقطم کی رصدگاہ سے ابن یونس نے 358ھ/977ء اور 368ھ/987ء میں سورج گرہن اور چاند گرہن کا مشاہدہ کیا، اور اس کو تحریر کیا۔ یہ سب سے اولین کسوف وخسوف تھے جن کا انتہائی دقت نظر سے مطالعہ کیا گیا، اور بہت باریکی کے ساتھ علمی طریقہ سے تحریر میں لایا گیا۔ ابن یونس نے اپنا اسطرلاب کلاں استعمال کرتے ہوئے مسلسل کئی سال میں سورج کے مقامات میں سے دس ہزار مداخل کا مشاہدہ کیا۔

ابن یونس کا ایک اور کارنامہ پنڈولیم کی ایجاد ہے، انہوں نے فلکیاتی مشاہدات میں استعمال کرنے کے لئے پنڈولیم ایجاد کیا، تاکہ زیادہ باریکی سے نتائج اخذ کئے جاسکیں، اس طرح وہ مشہور سائنس داں گیلیلیو سے چھ سو سال پہلے اس کے موجد قرار پائے۔

ابن یونس نے کئی کتابیں تحریر کیں، جن میں غایۃ الانتفاع فی معرفۃ الدوائر والسمت من قبل الارتفاع، جداول السمت، التعدیل المحکم وغیرہ ہیں، ان میں سب سے مشہور کتاب الزیج الحاکمی ہے، اس کتاب کی تالیف سے ابن یونس کا مقصد گذشتہ علماء کے فلکی مشاہدات کی تصحیح اور ان کی تکمیل تھی، اس کتاب میں انہوں نے قدیم وجدید علمائے فلک کے تمام کسوف وخسوف کو اور ستاروں کے قران کو جمع کیا، پھر ان کا موازنہ کیا، اور اس سے انہوں نے ثابت کیا کہ چاند کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اکتشاف ابن یونس کا اہم اکتشاف ہے۔ اس کتاب میں 81 فصلیں ہیں، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ کتاب زیج ابن یونس کے نام سے بھی معروف ہے، یہ بہت بڑی کتاب ہے جو میں نے چار جلدوں میں دیکھی

ہے،ابن یونس نے اس میں تفصیل سے کلام کیا ہے،اور تجربات بھی کیئے ہیں، میں علم زیج کی بے شمار تصنیفات میں اس سے طویل کوئی کتاب نہیں دیکھی،ان کی اس کتاب پر اہل مصر ستاروں کی تقویم میں اعتماد کرتے ہیں،انہوں نے اپنی عمر رصد و مشاہدہ افلاک میں صرف کی،اور اس میں بے نظیر کام کیا،کئی علوم کے جامع تھے۔گوستاف لوبون لکھتے ہیں: ابن یونس نے قاہرہ میں اپنی مشہور کتاب الزیج الحاکمی تصنیف کی،اس کتاب نے دنیا میں موجود گذشتہ تمام زیجوں کو ماند کردیا، یہاں تک کہ چین کے علمائے فلک نے اس کی طرف توجہ کی،اور 1280ء میں ایک چینی عالم کوشیو کینگ نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔موسیو کوسان (Caussin) فرانس کالج میں عربی زبان کے استاذ نے اس کی بعض فصلوں کا 1804ء میں فرنسیسی میں ترجمہ کیا۔

ابن یونس کی خدمات کے اعتراف میں چاند کے ایک دہانہ کا نام ان کے نام پر رکھا گیا۔399ھ/1009ء میں ابن یونس کی وفات ہوئی۔

6.4.6 نصیر الدین طوسی

ابوجعفر محمد بن محمد،خواجہ نصیر الدین طوسی،ایران کے شہر طوس کے قریب ایک گاؤں میں 597ھ/1201ء میں پیدا ہوئے،اپنے والد محمد بن الحسن سے جو فضل اللہ راوندی کے شاگرد تھے،تعلیم حاصل کی،پندرہ سال کی عمر میں نیشاپور گئے،علم حکمت،فقہ اور علم فلک وریاضیات کی تعلیم کمال الدین موصلی اور معین الدین مصری سے حاصل کی۔ریاضیات اور فلکیات میں اونچا نام پیدا کیا۔اور جب تاتاریوں نے نیشاپور کو تباہ و برباد کیا تو وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔اور واپس طوس آگئے،ان کی شہرت سن کر اسماعیلی وزیر ناصر الدین قہستانی نے ان کو الموت قلعہ میں قیام کے لئے دعوت دی،طوسی نے یہ دعوت قبول کی،اور 28 سال تک وزیر کے مہمان رہے،یہ زمانہ طوسی کے تصنیف وتالیف کا زمانہ ہے،جب ہلاکو نے قلعہ الموت کو تباہ کیا تو نصیر الدین طوسی کو اپنا مقرب بنایا،اور ان کے علم وفلسفہ سے استفادہ کیا،انہوں نے بغداد کا سقوط اپنی آنکھوں سے دیکھا،ہلاکو خاں کی موت تک اس کے وزیر رہے،پھر اس کے لڑکے اباقاخان کے نو سال تک وزیر رہے۔

نصیر الدین طوسی نے ہلاکو خاں کو مراغہ شہر کی رصدگاہ تعمیر کرنے پر آمادہ کیا،بغداد کی تباہی کے بعد ہلاکو نے مراغہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا،اس رصدگاہ کی تعمیر گیارہ سال جاری رہی،طوسی نے اس میں اس زمانہ کے تمام آلات رصد مہیا کرائے،بغداد،موصل،حلب اور دمشق سے مشہور علماء کو وہاں منتقل کیا،اور ان کے روزینے مقرر کیئے،رصدگاہ کے پہلو میں ایک عظیم کتب خانہ قائم کیا،جس میں بغداد کی تباہی سے بچی ہوئی کتابیں جمع ہوئیں۔

نصیر الدین طوسی خود بھی ایک عظیم عالم فلکیات تھے،انہوں نے الزیج الایلخانی کے نام سے کتاب لکھی،جس کو ہلاکو خان کے نام ایلخان بن تولی خان کے نام سے موسوم کیا،اس میں مقدمہ کے بعد چار مقالے ہیں، پہلا مقالہ تواریخ میں،دوسرا مقالہ کواکب کی حرکات کے بارے میں،تیسرا مقالہ مطالع کے اوقات میں،اور چوتھا مقالہ اعمال نجوم میں ہے۔

نصیر الدین طوسی نے اجرام سماویہ کی حرکت کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی کتاب ''التذکرۃ'' میں ایک شکل بنائی ہے،جو ایک چھوٹے اور ایک بڑے دو دائروں سے مل کر بنتی ہے،چھوٹے دائرہ کا قطر بڑے دائرہ کے نصف قطر کے برابر ہے،اور چھوٹا دائرہ بڑے دائرہ کی حرکت کے مقابل سمت حرکت کرتا ہے۔بالکل یہی شکل کوپرنیکس نے بھی اپنی کتاب میں بیان کی ہے،اور کئی مؤرخین کا ماننا ہے کہ کوپرنیکس نے طوسی کی یہ

شکل کسی عربی کتاب میں ملاحظہ کی ہوگی، خصوصاً جبکہ دائروں کے نقاط کو بتانے والے لاطینی حروف کا پرنیکس نے (A, H, D, B) بیان کئے ہیں، جن کو طوسی نے (ا، ھ، د، ب) سے ظاہر کیا ہے۔

خواجہ نصیر الدین طوسی کی وفات 672ھ/1274ء میں بغداد میں ہوئی۔

6.4.7 ابن شاطر

ابوالحسن علاء الدین علی بن ابراہیم، جو ابن شاطر کے نام سے معروف ہیں، (704ھ/1304ء) میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا، چچا نے پرورش کی اور ہاتھی دانت کے جڑنے کا کام سکھایا، جس کی وجہ سے ان کو مطعم بھی کہا جاتا ہے، ان کے چچا جو ابوالحسن شاطر کے نام سے معروف تھے، فلکیات اور ریاضیات کے عالم تھے، انہی سے ان علوم کو حاصل کیا، نیز متقدمین مثلاً شیرازی، خیام، ابن الہیثم وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، خصوصاً طوسی کی قائم کردہ مراغہ کی رصدگاہ سے استفادہ کیا، علم فلک اور ریاضیات کے حصول ہی کے لئے بلاد شام، اسکندریہ اور قاہرہ کے علمی اسفار کئے، یہاں تک کہ فلکیات میں مہارت حاصل کی، کئی فلکیاتی آلات ایجاد کئے، گذشتہ علمائے فلک کی کوششوں کو آگے بڑھایا، اور اپنے اکتشافات سے اس میں اضافہ کیا، زندگی کا بڑا حصہ دمشق میں گذارا، جہاں وہ مسجد اموی کے رئیس المؤذنین اور توقیت کے ذمے دار بھی تھے۔

مسلمانوں میں فلکیات کے بارے میں ابتدا سے بطلیموس کی کتاب مجسطی رائج تھی، اجرام فلکی اور نظام شمسی کے متعلق بطلیموس کا نظریہ یہ تھا کہ زمین مرکز کائنات ہے، اور سورج اور دیگر سیارے اس کے گرد گردش کررہے ہیں، سورج اور دیگر سیارے 24 گھنٹے میں زمین کے گرد ایک چکر مکمل کرتے ہیں۔ مسلمان علماء نے اپنے تجربہ سے اس نظریہ پر تنقید کی تھی، اور اس پر شک کا اظہار کیا تھا، لیکن انہوں نے کوئی متبادل نظریہ پیش نہیں کیا تھا، یہاں تک کہ ابن شاطر آئے اور اپنے تجربات کئے، مشاہدات کو تحریر کیا، اس نظریہ کی غلطیوں کو واضح کیا، اور اپنی کتاب "نہایۃ السول فی تصحیح الاصول" میں ستاروں کی حرکت سے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا، انہوں نے کہا کہ زمین جو سات سیاروں میں ایک ہے وہ اپنے محور پر ہر دن ورات میں ایک چکر مکمل کرتی ہے، جس سے رات ودن وجود میں آتے ہیں، اسی طرح تمام کواکب ایک گردش اپنے مدار پر کرتے ہیں، اور ایک گردش اپنے محور پر۔ ابن شاطر نے یہ بھی بتایا کہ چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے، انہوں نے دلیل پیش کی کہ "اگر فرض کیا جائے کہ اجرام ساویہ مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں، اور سورج بھی جو ان میں سے ایک ہے حرکت کرتا ہے، لیکن صرف اسی کے طلوع وغروب میں فرق کیوں ہوتا ہے، پھر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آسمان میں بہت سے سیارے ایسے ہیں جو کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی پوشیدہ ہوجاتے ہیں جن کو کواکب متحیرہ کہا جاتا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور کواکب متحیرہ ایک نظام کے ساتھ سورج کے گرد حرکت کرتے ہیں، اور چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے"۔

ابن شاطر نے عطارد اور چاند کے مداروں کی تحدید کی، ان دونوں کی حرکت کے نمونے تیار کئے، اس کے دوسو سال بعد کا پرنیکس (1473-1543) نے نظام شمسی کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا، جو کا پرنیکس سے منسوب ہوا، یہ حقیقت ہے کہ کا پرنیکس نے اپنے فلکیاتی نظریات عربوں کی تالیفات کی روشنی میں تیار کئے، 1973 میں پولینڈ میں ایسے متعدد عربی مخطوطات کی دریافت ہوئی جو فلکیات کے متعلق تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکولاس کا پرنیکس پر مسلم سائنس دانوں کے علوم کا گہرا اثر ہے، اسی لئے ڈاکٹر ڈیوڈ کنگ نے بیان کیا کہ کوپرنیکس کی طرف

منسوب اکثر فلکیاتی نظریات وافکار اس نے ابن شاطر سے اخذ کئے ہیں۔اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کوپرنیکس نے عطارد کے مدار کا جو نمونہ تیار کیا وہ درست نہ تھا، اور جو بعینہ ابن شاطر کے بھی عطارد کے مدار کا نمونہ تھا۔

جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ ابن شاطر انتہائی ذہین سائنس داں تھے، انہوں نے اجرام سماویہ کی حرکت کا باریکی سے مشاہدہ کیا، اور 1365 میں ثابت کیا کہ دائرۃ البروج کے جھکاؤ کا زاویہ 23 درجہ اور 31 دقیقہ ہے، واضح رہے کہ بیسویں صدی میں ترقی یافتہ آلات کے ذریعہ سے مغربی سائنس داں اس نتیجہ پر ہی پہونچے ہیں کہ دائرۃ البروج کے جھکاؤ کا زاویہ 23 درجہ، 31 دقیقہ اور 19.8 ثانیہ ہے۔

ابن شاطر ایک عظیم سائنس داں اور موجد تھے، انہوں نے قدیم زمانہ سے مستعمل دھوپ گھڑیوں کو درست کیا، اور اوقات نماز کی تعیین کے لئے خود ایک دھوپ گھڑی ایجاد کی، جس کا نام وسیط رکھا، اور مسجد اموی کے ایک منارہ پر اس کو نصب کیا۔ان کی بنائی ہوئی دھوپ گھڑیاں ایک مدت تک بلاد شام کے مختلف حصوں اور سلطنت عثمانیہ کے کئی شہروں میں استعمال ہوتی رہیں۔عثمانی خلیفہ مراد اول نے ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، جو ابن شاطر نے قبول کی اور کتاب ''الزیج الجدید'' لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کی، جس میں علم الفلک سے متعلق اپنے نظریات اور جدید معلومات کو درج کیا۔ابن شاطر نے اسطرلاب بھی تیار کیا، اور اس میں کئی اصلاحات کیں۔

ابن شاطر نے تقریباً تیس سے زائد کتابیں اور رسائل تصنیف کئے، جن میں اصول علم الاسطرلاب، جدول میل الشمس لکل عرض، لفظ الجواہر فی معرفۃ الخطوط والدوائر، تعلیق الارصاد، النفع العام فی العمل بالربع التام لمواقیت الاسلام، رسالۃ فی الربع العلائی، نہایۃ السول فی تصحیح الاصول، الزیج الجدید اور الاشعۃ اللامعہ فی العمل فالآلۃ الجامعہ وغیرہ شامل ہیں۔

علاء الدین ابن شاطر کی وفات 777ھ/1375ء میں دمشق میں ہوئی۔

6.4.8 اولغ بیگ

محمد طورغائے بن شاہ رخ، الغ بیگ، عظیم الشان تیموری سلطنت کا تیسرا فرماں روا، جس کے حصہ میں حکومت وسلطنت کے ساتھ اقلیم علم وادب کی فرمانروائی بھی آئی تھی، خراسان کے شہر سلطانیہ میں جہاں اس کے والد شاہ رخ والی تھے 796ھ/1394ء میں پیدا ہوئے، قرآن اور قراأت سبعہ کا علم حاصل کیا، شعروادب کے ساتھ انجینئرنگ اور تعمیر میں بھی ذوق سلیم کے حامل تھے، ریاضیات اور فلکیات میں کمال حاصل کیا، 810ھ/1408ء میں خراسان کے ایک علاقہ کے حاکم بنے، جب شاہ رخ نے سمرقند پر قبضہ کیا تو اولغ بیگ کو اس کا گورنر مقرر کیا، سمرقند میں اولغ بیگ نے کئی عمارتیں تعمیر کروائیں، جو فن تعمیر کا اعلی نمونہ ہیں، جن میں مسجد، اولغ بیگ، مسجد شاہ زند، خانقاہ، قصر چہل ستون اور مدرسہ شامل ہیں، ان کا سب سے اہم کارنامہ سمرقند میں رصدگاہ کی تعمیر ہے، جو 832ھ/1429ء میں مکمل ہوئی، اولغ بیگ نے اپنی رصدگاہ کی تعمیر کے لئے شہر سمرقند کے شمال مشرق کا ایک مقام منتخب کیا، اس مقام کی تعیین میں مشہور علمائے فلک سے مدد لی، اور ایک عظیم الشان رصدگاہ اونچی جگہ پر مظبوط بنیادوں پر تعمیر کی، اس رصدگاہ میں دس کہکشاؤں کے نمونے بنائے گئے تھے، آسمان کے سات دائروں اور ان کے ساتھ کواکب سبعہ کا نمونہ بھی تیار کیا گیا تھا، اسی طرح بعض سیاروں، فضاؤں، سمندروں، صحراؤں اور پہاڑوں کے نمونے بھی بنائے گئے تھے، یہ تمام نمونے حیرت انگیز تصویروں کے ذریعہ نمایاں کئے گئے تھے، جو اس رصدگاہ کے مختلف کمروں میں نصب کی گئی تھیں۔کہا جاتا ہے کہ اس رصدگاہ کی بلندی قسطنطنیہ

کی مسجد آیا صوفیا کے گنبدوں کے برابر تھی۔ اپنی خصوصیات کی وجہ سے یہ عمارت اپنے زمانہ کے عجائبات عالم میں شمار ہوتی تھی، اس رصد گاہ کو نمونہ بنا کر تقی الدین کاشی نے مراد ثالث کے لئے استنبول میں رصد گاہ تعمیر کی، اسی طرح ہندوستان میں راجہ جئے سنگ نے دہلی، جئے پور، اجین، متھرا اور وارانسی پانچ مقامات پر جنتر منتر کی تعمیر کے لئے اسی رصد گار کو نمونہ بنایا تھا، جو 1724 سے 1735 کے درمیان تعمیر کئے گئے۔

اولغ بیگ نے یہاں اپنے دور کے ترقی یافتہ آلات رصد بہم پہونچائے، جو اپنے حجم اور معیار کے لحاظ سے ممتاز تھے، خود کئی آلات ایجاد کئے، یہاں غیاث الدین جمشید کاشی، قاضی زادہ رومی، اور علی قوشجی جیسے ماہرین فلکیات کو متعین کیا، اولغ بیگ نے ان کے ساتھ مل کر خود بھی فلکیاتی مشاہدے کئے۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ شمسی سال 365 دن، 6 گھنٹے، 10 منٹ اور 8 سیکنڈ کا ہوتا ہے۔

اس رصدگاہ میں اولغ بیگ نے جو مشاہدات کئے ان کی روشنی میں اپنی کتاب ''زیج سلطانی جدید'' تحریر کی، اس کتاب میں چار مقالات ہیں، پہلے مقالہ میں زمانی تاریخوں اور توقیت کا بیان ہے، جس میں ایک مقدمہ اور پانچ باب ہیں، مقدمہ میں انہوں نے اس زیج کو تحریر کرنے کا سبب لکھا ہے کہ وہ ان غلطیوں کی تصحیح کرنا چاہتے تھے جو ما قبل کے علمائے فلک نے خصوصا یونانیوں سے ہوئی ہیں، دوسرے مقالہ میں اوقات اور ان کے مطالع کا بیان ہے، جو 22 ابواب میں ہے، تیسرا مقالہ کواکب کی حرکت اور ان کے مقامات کے بارے میں ہے، جس میں 13 ابواب ہیں، چوتھا باب نجوم ثابتہ کے مقامات کی معرفت سے متعلق ہے، اس زیج میں 1018 ستاروں کے مقامات درجہ اور دقیقہ کی تعیین کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، مؤلف نے کسوف وخسوف کے حساب کے جدید طریقے بھی درج کئے ہیں، شمس وقمر اور ستاروں کی رفتار کے نقشے بھی بنائے ہیں، اسی طرح دنیا کے مشہور شہروں کے طول البلد وعرض البلد کے خطوط ذکر کئے ہیں۔

ٹیلی اسکوپ کی ایجاد سے قبل عصور وسطی میں اولغ بیگ نے فلکیات میں جو عظیم خدمات انجام دیں ان کو فلکیات کے عالمی ذخیرہ میں اہم اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ اولغ بیگ 853ھ/1449ء میں مقتول ہوئے۔

معلومات کی جانچ

1. فلکیات میں عبدالرحمٰن صوفی کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
2. نصیرالدین طوسی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، تحریر کیجیے۔
3. فلکیات کے حوالہ سے ابن شاطر کے کارنامے بیان کیجئے۔

6.5 علم ریاضیات

6.5.1 علم ریاضیات اور مسلمان

مسلمانوں کا تعلق ریاضیات سے سماجی اور علمی ہونے کے ساتھ مذہبی بھی تھا، مذہبی عبادات مثلا نماز کی رکعات کی تعداد، زکات کے نصاب کی مقداریں، میراث کی تقسیم وغیرہ میں ان کو حساب اور اعداد کی ضرورت پڑتی تھی، قرآن کریم میں جہاں مکمل اعداد کا ایک سے ایک لاکھ تک ذکر ہے، وہیں کسور کا نصف سے آٹھویں حصہ تک ہے۔ مامون کے زمانہ میں جب ترجمہ کا سلسلہ شروع ہوا تو ہندستان سے ریاضیات کے ایک عالم ''منکہ ہندی'' ایک کتاب لے کر حاضر ہوئے، جس کا نام سدھانت تھا، مامون کے حکم سے محمد بن ابراہیم فزاری نے اس کا عربی میں

ترجمہ کیا، جس کا نام ''سند ہند'' رکھا، یونان سے جو علوم بغداد پہونچے ان میں ان میں اقلیدس کی کتاب ''اصول ہندسہ'' بھی تھی، جس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا، اس طرح یونان اور ہندوستان سے حاصل شدہ ریاضیات کے علم پر عربوں نے اپنے عظیم الشان علم ریاضیات کی بنیاد رکھی، اور بعد کی آنے والی تمام تہذیبوں پر اپنا اثر چھوڑا۔

مسلمانوں نے علم ریاضیات میں اہم کارنامے انجام دیئے، انہوں نے اعداد کا ہندوستانی نظام اخذ کیا، اس کو ترقی دی، اس میں صفر کا اضافہ کیا، اور صفر کے استعمال کو بہتر طریقہ سے انجام دیتے ہوئے اس کو دنیا میں متعارف کرایا۔ عربوں نے علم الجبر والمقابلہ کو جب یونان سے حاصل کیا تو وہ ایک ابتدائی شکل میں تھا، انہوں نے اس کو ترقی دیکر ایک مستقل علم بنادیا، اور اس کا نام بھی عربی نام ہی پر رکھا گیا۔ مسلمانوں نے ریاضیات کو نظری کے ساتھ تطبیقی علم بنایا، اور اس سے علم فلکیات کی ترقی میں مدد لی، اسی وجہ سے عموما دور وسطی کے ماہرین فلکیات ہم کو ماہرین ریاضیات بھی نظر آتے ہیں، اسی طرح انہوں نے اس علم کا انجینئرنگ اور معماری میں بھی استعمال کیا، اور بڑی بڑی، خوبصورت، سڈول، بلند اور پائیدار عمارتوں کی تعمیر میں علم ہندسہ کو کام میں لائے۔ ذیل میں ریاضیات کے میدان میں چند مسلم سائنس دانوں کی خدمات کو ذکر کیا جاتا ہے۔

6.5.2 الخوارزمی

ابو عبد اللہ محمد بن موسی خوارزمی، تیسری صدی ہجری، نویں صدی عیسوی کے مشہور عالم ریاضیات وفلکیات، خوارزم (موجودہ خیوا، ازبکستان) میں پیدا ہوئے، اپنے خاندان کے ساتھ بغداد منتقل ہوئے، اور زندگی کا اکثر حصہ بغداد میں گذارا، عباسی خلیفہ مامون ان کی ذکاوت اور علم سے بہت متاثر ہوئے، اور ان کو بیت الحکمت میں کتب خانہ کا ذمہ دار بنایا تھا، اور یونانی کتابوں کو جمع کرنے اور ان کا ترجمہ کروانے کی ذمہ داری سپرد کی تھی، مامون کے حکم سے زمین کا نقشہ بنانے والی ٹیم میں کام کیا، اسی طرح زمین کا محیط معلوم کرنے کی مہم میں بھی بنوموسی شاکر کے ساتھ تھے، خوارزمی عربی، فارسی اور یونانی وغیرہ کئی زبانیں جانتے تھے، اور ترجمہ کی خدمت بھی بیت الحکمت میں انجام دی، انہوں نے بطلیموس کی کتاب مجسطی کا ترجمہ اور اختصار کیا، اور کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں کتاب الجمع والتفریق فی الحساب الہندی، کتاب تقویم البلدان، کتاب صورۃ الارض، کتاب العمل بالاسطرلاب، کتاب رسم الربع المعمور وغیرہ ہیں۔

محمد بن موسی خوارزمی کو ریاضیات میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، کیوں کہ انہوں نے اس علم کو آسان اور سہل الحصول بنادیا، اور اس میں کئی اکتشافات کیے، خوارزمی کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ ریاضی کے عمل کو آسان کر کے سماج کے تمام افراد کے لئے قابل عمل بنادیا جائے، انہوں نے ہارون رشید سے کہا تھا کہ امیر المؤمنین اب مجھے صرف ایک ہی فکر ہے وہ یہ کہ ریاضی کی تعلیم کو مختلف عمر کے تمام افراد کے لئے کیسے آسان بنادوں، کیوں کہ اس علم میں کوئی خیر نہیں جس کو عملی زندگی میں برتا نہ جاسکے۔ خوارزمی نے اس مقصد کے لئے ایک چھوٹی سی کتاب ''الحساب'' کے نام سے بھی تحریر کی، اس کتاب کا بھی یوروپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

خوارزمی کا اصل کارنامہ اور وجہ شہرت ان کی کتاب علم الجبر والمقابلہ ہے، ان کو الجبرا کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے، ابن خلدون نے کہا ہے کہ علم الجبر میں سب سے اول خوارزمی نے کتاب تصنیف کی، خوارزمی نے علم الجبر کے متفرق مسائل کو یکجا کیا، اور اس کو ایک علم کی حیثیت سے ترقی دی، اس فن کی پیچیدہ مساوات کو حل کیا۔ خوارزمی کی کتاب کے نام پر اس علم کا نام الجبرا (Algebra) پڑا اور تمام دنیا میں ریاضیات کی یہ شاخ اس نام سے معروف ہوئی۔ خوارزمی نے اپنی کتاب میں نامعلوم عدد (لاشئی) کے لئے ''س'' کا رمز استعمال کیا، جو آگے چل کر (x) بنا،

اس کتاب میں انہوں نے ضرب، تقسیم، جمع تفریق، جبری مساوات، پیمائش، خرید وفروخت، کرایہ، نقدی، ناپ تول اور وزن کے مسائل، ہموار سطح، دائرے، مثلث شکلوں کی پیمائش، ترکہ اور میراث کے حصوں کی تقسیم کے مسائل کو حل کیا ہے، اور ان تمام معاملات میں علم الجبر کا استعمال کیا ہے، اعداد کو جذر (Root)، مآل (Square Root)، اور عدد منفرد میں جس کا کوئی جذر یا مآل نہ ہو تقسیم کیا ہے۔ خوارزمی نے چکوری مساوات (Quadratic equation) کے حل کرنے کے طریقہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا، اور اس کے ہندسیاتی ثبوت دئے۔

ویل ڈیورانٹ نے لکھا ہے کہ سدھانتا کے ترجمہ سے عربی اعداد اور صفر ہندوستان سے عالم اسلام میں پہونچے، اور 813ء میں خوارزمی نے اپنے ریاضی جدولوں میں ان کا استعمال کیا، اور 825ء میں اپنا رسالہ شائع کیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں اس کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا، اور یہ اعداد یوروپ میں عربی اعداد کے نام سے معروف ہوئے، حالاں کہ خود عربوں نے ان کو ہندی اعداد کا نام دیا تھا۔ اس طرح یوروپ میں رومی حروف کی جگہ عربی اعداد نے لی، کیوں کہ رومی حروف کے مقابلہ عربی اعداد میں بے حد سہولت کے ساتھ لکھے جاسکتے ہیں، مثال کے طور پر اگر 387 لکھنا ہوتو اس کو (CCCLXXXVII) لکھتے تھے، جو یقیناً پیچیدہ ہے۔ جب کہ عربی اعداد میں اکائی، دہائی، سیکڑہ کے مقام کے اعتبار سے عدد کی قیمت ہوتی ہے، اور کسی عدد کو مکرر لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ حسابیات کی دنیا میں یہ ایک عظیم انقلاب تھا جو خوارزمی کے ہاتھوں شروع ہوا، اور انہوں نے ہندوستان کے اعداد سے ساری دنیا کو روشناس کروایا۔

ریاضیات میں خوارزمی کی ایک اور ایجاد "لوگارتھم" یعنی (Logarithm) ہے، اس حساب میں لمبے اور مشکل ضرب کے عمل کو جمع اور تقسیم کے عمل کو تفریق میں تبدیل کر کے طویل حسابات کو آسان کیا جاتا ہے، آج لوگارتھم کو سوئس ریاضی داں لیون ہارڈ اویلر سے منسوب کیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ لفظ خود (Algorithmus) ہے جو الخوارزمی کی بگڑی ہوئی لاطینی شکل ہے، جیسا کہ ویل ڈیورانٹ نے لکھا ہے، اور 1845ء میں فرانسیسی عالم Reinand نے ثابت کیا تھا۔

خوارزمی کی وفات بغداد میں 232ھ/847ء کے بعد ہوئی۔

6.5.3 ابوالوفاءالبوزجانی

محمد بن محمد بن یحیی، ابوالوفاء بوزجانی، مشہور ماہر ریاضیات اور فلکیات، ہرات اور نیشاپور کے درمیان بوزجان نامی ایک چھوٹے سے شہر میں (328ھ/940ء) میں پیدا ہوئے، اپنے چچا ابوعمرو مغازلی اور ماموں ابوعبداللہ سے علم اعداد اور علم حساب حاصل کیا، علم ہندسہ (Geometry) ابویحیی ماوردی اور ابوالعلا بن کرینب سے سیکھا، بیس سال کی عمر میں عراق منتقل ہوئے، اور بقیہ عمر یہیں گذاری، ابوالوفاء نے اپنی اکثر تصنیفات یہیں تحریر کیں، بغداد ہی سے وہ شہرت کے آسمان پر چمکے، ریاضیات، فلکیات اور دیگر علوم میں مہارت تامہ حاصل کی، امام بیہقی کا قول ہے کہ ریاضیات میں وہ سب سے بلند مقام پر فائز ہوئے، امام ذہبی نے ان کو الاستاذ الحاسب اور علم ہندسہ (Geometry) کا علم بردار کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ابوالوفاء نے اپنی عمر درس وتدریس، تصنیف اور مشاہدہ افلاک میں گذاری، شرف الدولہ بویہی کے تعمیر کی ہوئی رصدگاہ میں ایک عرصہ تک خدمت انجام دی، فلکیات میں ان کا مشہور کارنامہ چاند کی حرکت میں خلل ثالث کی نشاندہی ہے، جس کے اکتشاف کو غلط طور پر ڈنمارک کے ماہر فلکیات ٹیخو براھہ (Tycho Brahe) سے منسوب کیا گیا۔ انہوں نے اپنی کتاب الزیج الشامل میں اپنے دقیق ملاحظات نوٹ کیے ہیں۔

ابوالوفاءبوزجانی نے علم الفلک اور ریاضیات میں کئی کتابیں تصنیف کیں، ریاضیات میں انہوں نے یونانی عالم، اقلیدس، دیوفنطس اور خوارزمی کی کتابوں کی شرح کی، خوارزمی کی کتاب الجبر ولمقابلہ کی شرح، کتاب المدخل الی الارتماطیقی، کتاب استخراج ضلع المکعب، کتاب معرفۃ الدائرمن الفلک، اور کتاب الزیج الشامل ان کی مشہور کتابیں ہیں، عوام کے لئے انہوں نے ایک حساب کی کتاب تحریر کی جو منازل الحساب کے نام سے معروف ہے، Geometry میں ان کی کتاب الہندسہ اہم کتاب شمار کی جاتی ہے، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم الجبر اور علم الہندسہ کے درمیان تعلق دریافت کیا، اور خوارزمی کی تحقیقات میں اضافہ کیا۔ ان کا رسالہ "رسالۃ فی عمل المسطر ہ والبرکار والکونیا" میں انہوں نے اسکیل، پرکار اور مثلث قائم الزاویہ کے مختلف استعمالات سے بحث کی ہے، اور شکل سازی (Drawing) کے میدان کو وسیع کیا۔

بوزجانی کی شہرت اور اہمیت کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ انہوں نے علم المثلثات (Trigonometry) میں اہم خدمات انجام دیں، ان سے پہلے علم المثلثات فلکیات سے متعلق ایک شاخ شمار ہوتا تھا، ابوالوفاء نے اس میں اہم اضافہ کرتے ہوئے مماس یا دالہ (Tangent, *Tan*) کو مثلثات کے حساب میں داخل کیا، انہوں نے اس کے لئے "ظا" کا رمز استعمال کیا، انہوں نے اس کے ذریعہ تکونیات یا مثلثات کے کئی مسائل کو حل کیا، اور اس علم میں درج ذیل مساوات کو متعارف کرایا:

$$\sin(a+b)=\sin(a)\cos(b)+\cos(a)\sin(b)$$

$$\cos(2a)=1-2\sin^2(a)$$

$$\sin(2a)=2\sin(a)\cos(a)$$

انہوں نے Trigonometry میں قاطع (Secant) اور قاطع التمام (Cosecant) کو داخل کیا، اور کروی جیومٹری (Spherical geometry) کے لئے جیب الزاویہ (Sine) کا جدید طریقوں سے استعمال کرتے ہوئے قانون جیب (Law of Sines) کے درج ذیل صیغہ کو بیان کیا:

$$A/\sin(a) = B/\sin(b) = C/\sin(c)$$

ابوالوفاء البوزجانی کا بغداد میں 388ھ/998ء میں انتقال ہوا۔ ان کے کارناموں کے اعتراف میں ان کے نام پر چاند کے ایک دہانہ کا نام "دہانہ ابوالوفاء" رکھا گیا ہے۔

6.5.4 ابوبکر الکرجی

ابوبکر محمد بن الحسن الکرجی، ہمذان اور اصفہان کے درمیان کرج یا کرخ نامی مقام پر پیدا ہوئے، اور پانچویں صدی ہجری گیارویں صدی عیسوی میں بغداد میں ہندسہ اور ریاضیات میں شہرت پائی، ریاضیات میں اپنی اہم کتابیں بغداد ہی میں تصنیف کیں، ان کی کتابوں میں کتاب فی حساب الہند، کتاب نوادر الاشکال، کتاب فی الاستقراء بالتخت، کتاب الدور والوصایا، علل حساب الجبر، المدخل الی علم النجوم اور کتاب البدیع جیسی اہم تصنیفات ہیں، ان کی اہم کتابوں میں ایک الکافی فی الحساب اور الفخری فی الجبر والمقابلہ ہے، جو انہوں نے بنو بویہ کے وزیر ابو

غالب محمد بن علی فخری کو پیش کیں، انہوں نے ایک کتاب پوشیدہ پانی کے سرچشموں کے اخراج کے طریقوں پر بھی تصنیف کی جس کا نام ''انباط المیاہ الخفیۃ'' ہے، جو دائرۃ المعارف حیدرآباد 1359ھ میں چھپی، سے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ماہر ارضیات اور انجینیر بھی تھے۔

کتاب البدیع کو عادل انبوبا نے اپنی تحقیق اور فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اس کتاب میں کرجی نے جبری مساوات اور حسابی مسائل کو حل کیا ہے، اصول اقلیدس کے دوسرے، ساتویں، آٹھویں، اور نویں مقالہ کے مسائل سے بحث کی ہے، اسی طرح موافق اعداد (Amicable numbers)، غیر ناطق عدد، مفرد وغیر ناطق عدد کی مقداروں کی ضرب، تقسیم، جمع اور تفریق سے بحث کی ہے، اسی طرح مربع جذر، کسور کی جذر، اور مجہول کسر کی جذر وغیرہ مسائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اس کتاب میں انہوں نے سب سے پہلی مرتبہ الجبرا کے بعض مسائل میں مجہول عدد کا مربع جذر نکالا ہے۔

کتاب الکافی میں کرجی نے جذور معلوم کرنے، سطحوں کی پیائش، مختلف اجسام کی پیائش، جبر کے اصول ومسائل، زمین کا وزن وغیر موضوعات کو لیا ہے، اس کتاب کا شمار علم حساب کو آسان بنانے والی اہم کتابوں میں ہوتا ہے، جرمن زبان میں اس کا ترجمہ (Hochheim) نے کیا اور 1880ء میں اس کو شائع کیا، اور کئی عرب ریاضی دانوں نے اس کی شرح کی ہے۔

کرجی نے اپنی کتاب الفخری فی الجبر والمقابلہ میں الجبرا کے موضوعات پر اپنی نظر مرکوز کی ہے، اس میں مجہول اعداد کے مراتب بیان کئے ہیں، اور الجبرا میں قوت (Power) کے مفہوم وسعت دی ہے، ضرب، تقسیم، تناسب، مربع جذر (Square Root) کے استخراج، جبری اقدار میں جمع اور تقسیم کے عمل کو بیان کیا ہے، پھر الجبرا کے حساب میں ضروری قواعد ونظریات سے بحث کی ہے، اسی طرح الجبرا کی چھ مساواتوں کے مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ جرمن مستشرق فرانز وپکہ (Franz Woepcke) نے اس کتاب کی تحقیق کی اور پیرس سے 1853 میں اسے شائع کیا۔

فخر الدین محمد بن حسن کرجی کا شمار ان ریاضی دانوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے ریاضیات اور جیومٹری میں اہم اضافے کیے، انہوں نے اپنی معلومات کو منظم اور مرتب انداز میں پیش کیا، اور بعد کے آنے والوں پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے، جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ کرجی نے الجبرا میں جو اہم اور زیادہ مکمل خدمات پیش کیں، ان کا یوروپ پر احسان ہے، ان کی تالیفات علم حساب اور الجبرا میں انیسویں صدی تک قابل اعتماد مرجع کے طور باقی رہیں۔ کرجی کی وفات پانچویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہوئی۔

6.5.5 عمر خیام

غیاث الدین عمر بن ابراہیم، ابوالفتح خیام، نیشاپور میں 436ھ/1044ء میں پیدا ہوئے، بچپن میں خیموں کے بنانے کا کام کرتے تھے، اس لئے خیام لقب پڑا، نیشاپور میں موفق الدین بغدادی سے نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح کے ساتھ تلمذ حاصل کیا، طلب علم میں طویل سفر کئے، قدرت نے ذہن وذکاوت میں سے حظ وافر عطا کیا تھا، ریاضیات، فلکیات، ہندسہ، لغت، تاریخ، شعر وادب اور موسیقی میں کمال حاصل کیا، جب نظام الملک کو سلجوقی سلطان الپ ارسلان کے پاس وزارت حاصل ہوئی تو خیام کو بھی تقرب حاصل ہوا، الپ ارسلان کے بعد جلال الدین ملک شاہ نے خیام کو اپنی رصدگاہ میں خدمت پر مامور کیا، اور اس وقت کی شمسی تقویم میں تبدیلی کی خواہش کی، خیام نے اپنی ٹیم کے

ساتھ ایک ایسی جنتری بنائی جو موجودہ شمسی تقویم سے کہیں زیادہ بہتر تھی، اس تقویم کو فارسی تقویم، یا خراسانی تقویم کہا جاتا ہے، اور یہ بعض ممالک میں آج بھی مستعمل ہے۔ عمر خیام ایک ماہر فلکیات تھے، ساتھ ہی ان کی شہرت ماہر ریاضیات کی حیثیت سے بھی ہوئی، انہوں نے اس فن میں کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں قسمۃ ربع الدائرہ، مقالۃ فی الجبر والمقابلۃ، میزان الحکمۃ وغیرہ اہم ہیں، مقالۃ فی الجبر والمقابلہ میں انہوں نے مکعب مساواتوں کو حل کیا ہے، بروکلمان لکھتے ہیں کہ یہ مکعب مساواتوں کو حل کرنے کی یہ سب سے پہلی کامیاب کوشش ہے، یہ رسالہ پیرس میں 1815 میں چھپ چکا ہے، میزان الحکمۃ میں انہوں نے کسی مرکب جسم میں سونے چاندی کی مقدار معلوم کرنے کے طریقے بیان کئے ہیں۔ عمر خیام کو الجبرا سے بہت شغف تھا، انہوں نے دو درجی مساوات میں اعداد کی قوت 2,3,4,5,6,7, تک کی مقداروں کو حل کیا، انہوں نے مساوات کی ان کے مراتب کے اعتبار سے درجہ بندی کی، اوران کی تیرہ قسمیں بیان کیں، اوران تمام درجات کی جذر معلوم کی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ فارمولا بتایا کہ دو مکعب اعداد کے مجموعہ کا حاصل ایک مکعب عدد نہیں ہوسکتا۔ خیام نے دو درجی مساوات کے مسائل کو حل کرنے کے ساتھ مخروطی ٹکڑوں کی مدد سے سہ درجی مساوات کو حل کیا، ریاضیات کی دنیا میں یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سہ درجی مساوات کو حل کیا۔ انہوں نے علم الجبر کو مثلثات کے حساب میں داخل کیا، اور الجبرا کی مساواتوں کا استعمال کرتے ہوئے Trignomentry کے بے شمار مشکل مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ خیام کو جیومٹری سے بھی دلچسپی تھی، اقلیدس کی جیومٹری کے مطالعہ میں وقت صرف کیا، اوراس پر توجہ دی۔

ان کی کتابوں میں شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس، مشکلات الحساب، رسالۃ فی التقویم الجلالی، رسالۃ فی البراہین علی مسائل الجبر والمقابلہ، مقدمۃ فی المساحہ، المقنع فی الحساب الہندسی، رسالہ فی المعادلات ذات الدرجہ الثالثہ والرابعہ، کتاب الموسیقی اور رباعیات شامل ہیں۔

عمر خیام کی وفات 517ھ/1123ء میں نیشاپور میں ہوئی۔

معلومات کی جانچ

1۔ ریاضیات کے حوالہ سے ابو بکر کرجی کا تعارف پیش کیجئے۔

2۔ ابو الوفاء بوزجانی کی خدمات قلم بند کیجئے۔

6.6 خلاصہ

اس اکائی کے مطالعہ سے ہم نے جانا کہ:

☆ علم طبیعیات میں فارابی کا مقام بہت بلند ہے، انہوں نے سب سے پہلے خلا کے وجود پر گفتگو کی، اوراس بحث کو طبیعات میں داخل کیا، اپنی کتابوں میں کشش ثقل کا نظریہ پیش کیا۔ المقالات الرفیعہ فی علم الطبیعہ، کتاب الزمان، کتاب الخلاء کے نام سے کتابیں اس موضوع پر تحریر کیں۔

☆ ابن الہیثم نے طبیعیات کی کئی شاخوں میں کمال حاصل کیا، ان کی سب سے مشہور کتاب ''کتاب المناظر'' ہے، جس کی وجہ سے ان کو بطلیموس ثانی کا لقب ملا، انہوں نے بتایا کہ روشنی کسی سطح شئے سے ٹکرا کر آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ ریاضیات میں انہوں نے چہار درجی مساوات کو بیان کیا ہے، جس کو مسئلہ ابن الہیثم کے نام سے جانا جاتا ہے۔

☆ مسلمانوں نے اپنی مذہبی ضروریات کے پیش نظر علم فلکیات کی طرف توجہ کی، علم الفلک کو علم جوتش اور نجوم سے الگ کیا۔

☆ بنو موسیٰ شاکر نے زمین کی پیمائش کی، رصدگاہ قائم کی، کئی آلات ایجاد کئے، اور زائچے بنائے۔

☆ البتانی نے ستاروں کے حسابات اور ان کی حرکت کے علم میں کمال حاصل کیا، انہوں نے بتایا کہ زمین اور سورج کا فاصلہ سال بھر برابر نہیں رہتا، بتانی نے سمت اور نظیر کے متعلق گفتگو کی، ان کی کتاب زیج الصابی بہت مشہور ہے۔

☆ عبدالرحمٰن صوفی عظیم عالم فلکیات تھے، انہوں نے ستاروں کی حرکات کا مشاہدہ کیا، ان کے مقامات و حرکات کی تعیین کی، مختلف ستاروں اور مجموعوں کے طول وعرض کی تحدید کی، ایک ہزار سے زیادہ ستاروں کی چمک کی تعیین کی۔ ان کی سب سے مشہور کتاب صور الکواکب الثابتہ ہے۔

☆ ابن یونس نے فلکیات میں اپنی اہم کتاب الزیج الحاکمی تصنیف کی، جس میں گذشتہ علمائے فلک کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ رصد گاہ سے سورج گرہن اور چاند گرہن کا مشاہدہ کر کے اس کو تحریر کیا، انہوں نے فلکیاتی مشاہدات میں استعمال کے لئے پنڈولیم ایجاد کیا۔ چاند کی حرکت میں اضافہ کو بتایا۔

☆ نصیر الدین طوسی نے مراغہ میں رصدگاہ تعمیر کروائی، تمام آلات رصد مہیا کرائے، اجرام سماویہ کی حرکت کو شکلوں سے ظاہر کیا، الزیج الایلخانی کے نام سے کتاب لکھی۔

☆ ابن شاطر نے بتایا کہ زمین اپنے محور پر ہر دن و رات میں ایک چکر مکمل کرتی ہے، جس سے دن رات وجود میں آتے ہیں، اسی طرح تمام کواکب ایک گردش اپنے مدار پر اور ایک گردش اپنے محور پر کرتے ہیں۔ انہوں نے عطارد اور چاند کے مدار کی تحدید کی، اوقات نماز کی تعیین کے لئے دھوپ گھڑی ایجاد کی، اسطرلاب تیار کیا، ان کی مشہور کتاب نہایت السول فی تصحیح الاصول ہے۔

☆ الغ بیگ نے سمرقند میں رصدگاہ تعمیر کی، جس میں کہکشاؤں کے نمونے بھی تیار کئے، اس رصدگاہ میں اپنے زمانہ کے ترقی یافتہ آلات مہیا کئے، شمسی سال کی تحدید کی، اپنی کتاب زیج السلطانی الجدید تحریر کی۔

☆ الخوارزمی ریاضیات کے عظیم عالم تھے، انہوں نے ریاضیات کے عمل کو آسان کر کے پیش کیا، وہ الجبرا کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں، اپنی کتاب ''کتاب الجبر والمقابلہ'' میں انہوں نے ریاضیات کی اس شاخ کو متعارف کرایا۔ ہندوستان سے اعداد لیکر ان کو برتا، اور ساری دنیا کو اس سے روشناس کرایا۔ وہ لوگارتھم کے بھی بانی سمجھے جاتے ہیں۔

☆ ابوالوفاء بوزجانی ریاضیات میں سب سے بلند مقام پر فائز ہوئے، فلکیات میں ان کا مشہور کارنامہ چاند کی حرکت میں خلل ثالث کی نشاندہی ہے، وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے الجبرا اور جیومٹری کے درمیان تعلق دریافت کیا۔ اسکیل، پرکار اور مثلث قائم الزاویہ کے استعمال

سے بحث کی، مماس یا دالہ کو مثلثات کے حساب میں داخل کیا۔

☆ ابو بکر الکرجی نے کتاب البدیع میں الجبرا کی مساوات اور حسابی مسائل کو حل کیا ہے، موافق اعداد، غیر ناطق اعداد کی مقداروں کی ضرب تقسیم، جمع تقسیم سے بحث کی۔ کتاب الکافی اور الفخری فی الجبر والقابلہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

☆ عمر خیام نے الجبرا میں مکعب مساواتوں کو حل کیا، انہوں نے بتایا کہ دو مکعب اعداد کے مجموعے کا حاصل ایک مکعب عدد نہیں ہو سکتا، خیام نے دو درجی مساوات کے مسائل کو حل کرنے کے ساتھ سہ درجی مساوات کو بھی حل کیا، اور الجبرا کو مثلثات کے حساب میں داخل کیا۔

6.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجئے۔

1۔ بطلیموس ثانی کسے کہا جاتا ہے، اور کیوں؟ وضاحت کیجئے۔

2۔ فلکی مشاہدات کے لئے پنڈولیم کس نے ایجاد کیا، موجد کے کارناموں پر روشنی ڈالئے۔

3۔ جیومٹری اور ٹرگنامٹری میں ابوالوفاء بوزجانی کی خدمات تحریر کیجئے؟

4۔ الجبر والمقابلہ کا موجد کون تھا، لوگارتھم کے موجد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، لکھئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1۔ مسلمانوں نے علم فلکیات کو مستقل علم کی حیثیت دی، تبصرہ کیجئے، نیز مسلم ماہرین فلکیات میں سے کسی دو کی کتابوں کے نام تحریر کیجئے۔

2۔ الخوارزمی اور عمر خیام کے کارناموں پر تفصیلی مضمون قلم بند کیجئے۔

6.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

قرون وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے	ڈاکٹر غلام قادر لون	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی، 2014
سو عظیم سائنس داں	رفیق انجم، ابراہیم عمادہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013
سائنسی ترقی میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمات	حافظ زاہد علی	اریب پبلیکیشنز، دہلی 2013
اسلام سائنس اور مسلمان	ترتیب: ابوعلی عبدالوکیل	اریب پبلیکیشنز، دہلی 2012
مسلمان اور سائنس	پرویز امیر علی ہود بھائی	اریب پبلیکیشنز، دہلی 2012
ریاضیات کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ	شبیر احمد غوری	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1998

خیام	سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2010ء
موسوعة عباقرة الاسلام	ڈاکٹر محمد امین فرشوخ	دارالفکر العربی، بیروت
قصة الحضارة	ولیم جمیس ڈیورانٹ	ترجمہ ڈاکٹر زکی نجیب محمود وغیرہ ناشر: دارالجیل، بیروت
شمس العرب تسطع علی الغرب	زیغر ید ہونکہ	ترجمہ فاروق بیضون، کمال دسوقی ناشر دارالجیل، بیروت

اکائی 7: تاریخ نویسی اور جغرافیہ

اکائی کے اجزا

7.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو تاریخ نویسی اور علم جغرافیہ میں مسلمانوں کے فضل وکمال کی معلومات حاصل ہوں، اور وہ مسلم دور حکومت کے دوران ان علوم میں ہونے والی تبدیلیوں اور ارتقاء کے عمل کو جان سکیں، اور یہ معلوم کرسکیں کہ ان علوم کو حاصل کرنے، حفاظت کرنے، ترقی دینے، اور اس کو دوسروں تک پہونچانے میں انہوں نے کیا خدمات انجام دیں، اور ان کے بعد آنے والے زمانہ پر ان کوششوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

7.2 تمہید

تاریخ ایک ایسا فن ہے جس کے بغیر ہم گذشتہ زمانہ کے حوادث وواقعات کو نہیں معلوم کر سکتے، اور ماضی کی معرفت کے بغیر قوموں کے اندر ترقی کے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے، اس لئے ہر قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے اقدامات کئے ہیں، اور اپنی تاریخ کے ساتھ ساتھ دیگر اقوام عالم کی تاریخ کو جاننے اس کو سمجھنے اور اس سے سبق سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کا علم تاریخ سے بڑا گہرا ربط ہے، انہوں نے اس علم کو اپنایا، اس کے اصول وقواعد مرتب کئے، اور ایسی عظیم تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں کہ دیگر اقوام میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

جہاں تک فن جغرافیہ کا تعلق ہے تو اس کو ترقی دینے میں مسلمانوں کا اہم کردار رہا ہے، ابتدا میں اس فن پر ہند ویونان کے علماء کی چند تحریریں مہیا تھیں، جن کو بنیاد بنا کر مسلمان علماء نے کام آگے بڑھایا، اور اس کو اس اوج ترقی تک پہونچایا۔ اس کے لئے انہوں نے طویل اسفار کئے، سفر نامے مرتب کئے، راستوں کے متعلق معلومات مہیا کیں، نقشہ سازی کے فن کو عروج بخشا، اور علم جغرافیہ میں متعدد شاخوں کو متعارف کرایا، جغرافیہ انسانی، جغرافیہ ریاضیاتی، جغرافیہ طبیعی پر کتابیں تحریر کیں۔ اس علم میں بھی ہم ان کی حصہ داری کا جائزہ لیں گے۔

7.3 تاریخ نویسی

7.3.1 تاریخ نویسی اور مسلمان

اسلام سے قبل عربوں میں جنگوں کے حالات کو محفوظ رکھنے، اپنے بہادروں کے کارناموں کو یاد رکھ کر بیان کرنے کا رواج تھا، جس کو ایام العرب کہتے تھے، اسی طرح انہوں نے حیرہ اور یمن کے بادشاہوں کے حالات محفوظ کئے تھے، تاریخ کی تحدید کے لئے بڑے واقعات مثلاً اسماعیل علیہ السلام کا مکہ میں نزول، عام الفیل، حرب فجار وغیرہ کو مدون کیا تھا۔ اسلام کی آمد کے بعد مسلمانوں میں تاریخ کو جاننے اور اس کو مرتب ومدون کرنے کا شوق ان کی مذہبی کتاب کے مطالعہ سے پیدا ہوا، قرآن کریم میں بہت سے قصے اور گذشتہ اقوام کے حالات بیان کئے گئے ہیں، رسول ﷺ نے بھی ان کو ان قصوں کی تفصیلات اہل کتاب سے معلوم کرنے کی اجازت دی تھی۔ رسول ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عمر نے سنہ ہجری سے تاریخ کی تحدید شروع کی۔ قرآن کے علاوہ حدیث کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی لوگوں کے حالات کو معلوم کرنا ضروری سمجھا گیا، اور ایک مستقل فن وجود میں آیا، جس کو اسماء الرجال کہا جاتا ہے، آپ ﷺ کی زندگی کے حالات کو محفوظ رکھنے کے لئے مغازی کے نام واقعات مدون ہوئے، خلفاء وسلاطین نے گذشتہ اقوام کی تاریخ معلوم کرنے اور ان سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کے لئے جاننے والے افراد کو طلب کیا، جن کو اخباری کہا جاتا تھا۔ علمائے اسلام نے تاریخ کے سلسلہ میں جن موضوعات پر کتابیں لکھیں وہ یہ ہیں، سیرت ومغازی یعنی رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ، تراجم یعنی کسی بھی اعتبار سے مشہور ومعروف افراد کے حالات زندگی، کتب الفتوح یعنی جن کتابوں میں شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی تفصیلات درج بیان کی جائیں، کتب انساب یعنی جن کتابوں میں عربوں کے نسب نامے اور قبائل کے شجرے ذکر کئے جائیں، کتب طبقات یعنی جن کتابوں میں کسی خاص علم مثلاً تفسیر، حدیث، یا کسی پیشہ مثلاً طب میں مشہور لوگوں کے حالات طبقہ وار ذکر کئے جائیں، مقامی تاریخ یعنی کسی ایک شہر یا ملک کی تاریخی تفصیلات مثلاً تاریخ دمشق اور تاریخ بغداد، عمومی تاریخ یعنی وہ کتابیں جن میں تمام عالم کی تاریخ سنہ وار ذکر کی جائے، مثلاً تاریخ طبری، الکامل فی التاریخ۔

مسلمانوں کا اہم امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ لکھنے کے اصول مرتب کئے، واقعات کو روایت و درایت کے اصول پر پرکھا، عقل ونقل کی کسوٹی پر اتارا، خصوصا وہ روایات وواقعات جن کا تعلق مذہب سے ہے، ان کے راویوں کی چھان بین میں تمام طریقوں کو اختیار کیا، اور اس سلسلہ میں کسی بھی جانبداری کو جگہ نہیں دی۔ علمائے اسلام میں بڑے بڑے مؤرخین پیدا ہوئے، ذیل میں ہم ان میں سے چند کے حالات درج کرتے ہیں۔

7.3.2 ابن جریر طبری

ابو جعفر محمد بن جریر طبری، طبرستان کے شہر آمل میں 224ھ/839ء میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا، طلب علم میں مختلف ممالک کا سفر کیا، اور پچاسوں اساتذہ سے کسب فیض کیا، پھر بغداد کو اپنا وطن بنایا، قرآن، تفسیر، قرآت، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور تاریخ میں اعلی مقام پیدا کیا، اور اجتہاد کے منصب پر فائز ہوئے، آپ کی مشہور کتابوں میں تفسیر قرآن ہے، جس کا نام جامع البیان فی تاویل آی القرآن ہے، اسی طرح تہذیب الآثار، اختلاف علماء الامصار، الخفیف فی احکام شرائع الاسلام وغیرہ بھی اہم کتابیں ہیں۔

علم تاریخ میں امام طبری عظیم شہرت کے مالک ہیں، اس فن میں آپ کی کتاب ''تاریخ الرسل والملوک'' گیارہ ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی ہے، اس کتاب میں امام طبری نے ابتدائے آفرینش سے اپنے دور کے حالات مدون کئے ہیں، کتاب کے مقدمہ میں امام ابن جریر اپنا منہج بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس کتاب میں میں نے ان اخبار وآثار پر اعتماد کیا ہے جو بالسند منقول ہیں، اس سلسلہ میں میں عقلی دلائل کا خیال نہیں کیا، کیوں کہ گذشتہ لوگوں کی خبروں کا علم یا بعد کے افراد کے واقعات کی خبر روایات کے واسطہ ہی سے بعد والوں تک پہونچ سکتی ہے، اس میں عقلی استنباط اور تفکیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا، لہذا اگر قاری کو کتاب میں کوئی ایسی روایت یا ایسا واقعہ نظر آتا ہے جو صحت سے بعید تر ہو تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں، بلکہ راوی پر ہوگی، ہم نے تو جیسا سنا ویسا ہی بیان کر دیا۔

اس کتاب کی تصنیف میں ابن جریر کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اولا حضرت آدمؑ سے حضور ﷺ تک کے تمام انبیاء واقوام کی تاریخ مرحلہ وار بیان کی ہے، اس میں اہل کتاب علماء کے علاوہ ان کتابوں پر بھی اعتماد کیا ہے، جو ان سے پہلے لکھی گئیں، جن کتابوں سے طبری نے براہ راست استفادہ کیا ان میں سند ذکر نہیں کی ہے۔ سیرت نبوی ﷺ کو ہجرت تک بیان کرنے کے بعد سنہ وار تاریخ بیان کی ہے۔ ہر سال کے واقعات کو الگ الگ ذکر کیا ہے، اور اشخاص کا تذکرہ وفیات کے اعتبار سے کیا ہے۔ اہم واقعات کو عنوان بنا کر ذکر کیا ہے۔ امام طبری کی کتاب تاریخ الرسل والملوک کا شمار تاریخ کی خصوصا اسلامی تاریخ کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں، اول تو یہ کہ امام ابن جریر نے اس میں ہر بات کو نقل کرنے میں مکمل امانت اور دیانت کا ثبوت دیا ہے، جیسا کہ انہوں نے اپنے مقدمہ میں ذکر کیا، خود امام طبری بھی انتہائی ثقہ شخص ہیں، اور تمام علمائے تاریخ وسیر ان کی جلالت علمی کے قائل ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ امام طبری نے اپنی تاریخ میں تمام روایات کو سند کے ساتھ نقل کیا ہے، ابن خلکان وفیات الاعیان میں لکھتے ہیں کہ طبری نقل روایت میں ثقہ آدمی ہیں، ان کی تاریخ تمام تاریخی کتابوں میں صحیح ترین کتاب ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ اس کتاب میں بہت سی ایسی روایات آئی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں، انہوں نے عرب جاہلیت کے تاریخی ورثہ کو ضائع ہونے سے بچا کر محفوظ کر دیا۔ اسی وجہ سے تاریخ طبری بعد کے تمام مؤرخین واصحاب سیر کا مرجع رہی ہے، اس کتاب میں نہ

صرف عربوں بلکہ رومی اور ایرانی اقوام کی تاریخ بھی مفصل بیان ہوئی ہے، اور اپنے بعد کے تمام مؤرخین مثلا ابن اثیر، ابن خلدون، ابن کثیر وغیرہ کا مرجع رہی ہے۔ آج بھی تاریخ طبری کی اہمیت مسلم ہے، اور وہ اسلامی تاریخ ہی نہیں بلکہ دیگر اقوام عالم کی تاریخ کا اہم اور عظیم مرجع شمار ہوتی ہے۔

امام ابن جریر طبری کی وفات بغداد میں 310ھ/922ء میں ہوئی۔

7.3.3 مسعودی

ابوالحسن علی بن حسین مسعودی، مؤرخ اور جغرافیہ داں، حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی اولاد میں سے تھے، اسی وجہ سے مسعودی کہلائے، بغداد میں پیدا ہوئے، وہیں علم حاصل کیا، پھر مختلف شہروں اور ملکوں کا رخ کیا، تاریخ اور جغرافیہ کا علم حاصل کیا، کئی زبانیں فارسی ہندی، یونانی، رومی اور سریانی زبان سیکھی، بلاد فارس اور کرمان کی سیر کی، پھر سندھ، ملتان اور کھمبات ہوتے ہوئے، جنوبی ہندوستان پہونچے، اور سراندیپ میں بھی قیام کیا، اسی طرح چین تک گئے، بحر ہند کے جزیروں کا مشاہدہ کیا، مدگاسکر، زنجبار ہوتے ہوئے، عمان واپس پہونچے۔ پھر عالم اسلامی کی سیر کی، اور اخیر میں مصر میں قیام کیا۔

ان طویل اسفار میں مسعودی نے تاریخ وجغرافیہ کا عمیق علم حاصل کیا، اور تقریبا پچیس سے زیادہ کتابیں تحریر کیں، اور اپنی مطول تاریخیں لکھیں، جن میں اخبار الزمان ومن اباده الحدثان تیس جلدوں میں لکھی، جو مرور زمانہ سے ناپید ہوگئی، اس کا کچھ حصہ طبع ہوا تھا، ان کی ایک اور کتاب جو مسعودی کی شہرت کا سبب بنی، مروج الذہب ہے، جو چار جلدوں میں طبع ہوئی ہے، اس کا پورا نام مروج الذہب ومعادن الجوہر فی تحفۃ الاشراف والملوک ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کا مواد اپنے زمانہ کی بہت سی تاریخی وغیر تاریخی کتابوں سے حاصل کیا ہے، جن میں سے چند ہی زمانہ کی دست برد سے باقی بچیں، ان میں تاریخ وسیاست اور معاشرہ کے موضوعات کی کئی کتابیں ہیں، اس وجہ سے اس کتاب کا پایہ اور بھی بلند ہوجاتا ہے کہ اس میں موجود مواد دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوتا۔ وہ اس کتاب میں جگہ جگہ اپنی دوسری طویل کتاب اخبار الزمان کا حوالہ دیتے نظر آتے ہیں، اکثر اختصار کی جگہ پر کہتے ہیں کہ اس کی تفصیل ہم نے اخبار الزمان میں لکھ دی ہے۔ مروج الذہب کی پہلی جلد میں مسعودی نے مخلوقات اور انبیاء کے واقعات کو مختصرا ذکر کیا ہے، پھر بحر و بر اور ان کے عجائبات کو بیان کیا ہے، اور اسی میں اقوام قدیمہ ایرانی، سریانی، یونانی، رومی، فرنگی، عرب متقدمین اور ان کے ادیان وعادات، مذاہب، تقویم، اور خانوادوں کے حالات لکھے ہیں، پھر تاریخ اسلام کو شروع کرکے حضرت عثمان کے قتل تک کے واقعات بیان کئے ہیں۔ دوسری جلد میں حضرت علی کے دور خلافت سے عباسی خلیفہ مطیع للہ تک کے حالات قلم بند کئے ہیں، جو مصنف کے دور میں زندہ تھے۔ جس کا فرانسیسی اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے،

مصنف کی ایک اور کتاب التنبیہ والاشراف ہے، جس میں مصنف نے تاریخ، جغرافیہ، فلکیات، فلسفہ وغیرہ کو جگہ دی ہے، اس کتاب کی ابتدا انہوں نے افلاک اور ان کی اشکال کے ذکر سے کی ہے، پھر ستاروں اور ان کی تاثیرات، عناصر اور ان کی ترکیبات، زمانہ کے اقسام، موسم، ہوا، زمین اور اس کی پیمائش ممالک کے حدود، دریاؤں وغیرہ کو ذکر کیا ہے، پھر اقوام قدیمہ، ملوک فارس، ملوک روم، اور دنیا کی عمومی تاریخ اور قصص النبیین کو بیان کیا ہے۔ پھر تاریخ اسلام کی طرف آئے ہیں۔ مسعودی کی یہ دونوں کتابیں مروج الذہب اور التنبیہ والاشراف میں معلومات

تاریخی اسباب وعلل کا بیش قیمت مواد ہے،ان کتابوں سے ایک طرف مسعودی کی جلالت علمی کا اعتراف ہوتا ہے،دوسری طرف یہ بعد میں آنے والوں کے لئے ایک عظیم علمی وتاریخی مرجع کا کام دیتی ہیں۔اس کتاب میں بہت سا ایسا مواد ملتا ہے جو تاریخ کے دیگر مصادر میں دستیاب نہیں ہوتا۔سب سے پہلے یہ لائڈن سے 1894ء میں طبع ہوئی،پھر مصر سے کئی مرتبہ طبع ہوئی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسعودی نے عالم اسلام کے جس دور کے حالات تحریر کئے ہیں،وہ اسلام اور مسلمانوں کا زریں دور ہے،جس میں اسلامی تہذیب وثقافت اپنے عروج کو پہونچی ہوئی تھی،خود مسعودی نے بھی ان ثقافتوں سے کسب فیض کیا تھا،اس وجہ سے بھی اس کو مرجعیت حاصل ہوئی۔مسعودی نے اپنی کتابوں کا مواد حاصل کرنے کے لئے کتابوں کے ساتھ اپنے علم ومشاہدہ سے بھی استفادہ کیا ہے،اور اپنے زمانہ میں موجود تاریخی روایات جو سینہ بسینہ چلی آرہی تھیں،ان کو بھی اہمیت دی ہے،اور اس کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے،اس وجہ سے ان کی کتابوں میں عجیب وغریب باتیں بھی داخل ہوگئی ہیں۔مسعودی پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ شیعہ ہونے کی وجہ سے جانبداری سے کام لیتے ہیں۔

مسعودی نے اپنی کتابوں کے ذریعہ ایک عالم کی تاریخ آئندہ کے لئے محفوظ کردی،روسی مستشرق دمتری ف میکولسکی نے اپنی کتاب میں مسعودی کو عرب کا ہیرودوٹس قرار دیا ہے۔مسعودی کی وفات 346ھ/957ء میں ہوئی۔

7.3.4 ابن خلکان

ابوالعباس شمس الدین احمد بن محمد،ابن خلکان،عراق کے شہر موصل کے قریب اربل نامی مقام میں 608ھ/1211ء میں پیدا ہوئے، فقہ اور حدیث،شعروادب اور تاریخ میں مہارت تامہ حاصل کی،ابتدائے عمر ہی میں دمشق منتقل ہوگئے تھے،اس لئے دمشق کے کبار علماء میں شمار ہوتے ہیں،دمشق اور مصر میں عہدہ قضاء پر بھی کئی مرتبہ فائز رہے،اور مختلف مدارس میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔

شمس الدین ابن خلکان کی شہرت ان کی مشہور تاریخ وفیات الاعیان کی وجہ سے ہے جو آٹھ جلدوں میں طبع ہوئی ہے،یہ کتاب تاریخ اسلام کی مشہور شخصیات کا انسائکلو پیڈیا ہے،جس میں انہوں نے اپنے دور تک کے تمام اہم لوگوں کا بہت ہی عمدگی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے،عموما تاریخیں سنہ وار لکھی جاتی تھیں،ابن خلکان نے اس کتاب میں شخصیات کا حروف تہجی کے اعتبار سے تذکرہ کیا ہے،کیوں کہ اس ترتیب میں قاری کے لئے زیادہ آسانی ہوتی ہے۔کتاب میں مصنف نے صحابہ وتابعین میں سے صرف چند لوگوں کو ہی ذکر کیا ہے،اسی طرح خلفاء کے تذکرہ سے بھی گریز کیا ہے،اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ ان کے احوال کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔شخصیات کے انتخاب میں انہوں نے صرف علماء،یا امراء،یا وزراء یا شعراء کو معیار نہیں بنایا ہے،بلکہ ہر وہ شخصیت جس کی شہرت لوگوں میں پھیل گئی ہو،اور اس کے بارے میں سوال کیا جاتا ہو،اس کے حالات زندگی انہوں نے اختصار کے ساتھ تحریر کئے ہیں،اسی طرح صرف انہی مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے جن کی تاریخ وفات کا علم مصنف کو ہوسکا۔ابن خلکان نے ہر شخص کی خوبیوں کو جو کسی کارنامہ،اختراع،شعر یا تحریر کی شکل میں ہوں ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے،وفیات الاعیان میں تقریبا 855 شخصیات کے تراجم ہیں،ایک اور خوبی اس کتاب کی یہ ہے اس میں تنوع ونیرنگی ہے،تمام شخصیات کے ذکر میں ایک ہی اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے،بلکہ مصنف اپنی ادبیت اور شگفتگی سے قاری کو اکتاہٹ میں مبتلا نہیں ہوتے دیتے۔مصنف نے اس تصنیف کو تاریخ کی کتابوں،اپنے اساتذہ کی معلومات اور اپنے ذاتی مشاہدات کی روشنی میں مرتب کیا ہے،کتاب کا مکمل نام "وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان،مما ثبت بالنقل او السماع او اثبتتہ الاعیان" ہے۔

زرکلی کہتے ہیں کہ کتب تراجم میں یہ کتاب سب سے مشہور ہے، پختگی اور معلومات کے اعتبار سے سب سے عمدہ ہے، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ابن خلکان کی تاریخ نافع ہے، اور بہت اہم اور تخلیقی تصنیف ہے۔

ابن خلکان کا 681ھ/1282ء میں دمشق میں انتقال ہوا۔

7.3.5 امام ذہبی

محمد بن احمد بن عثمان، شمس الدین ابوعبداللہ ذہبی، محدث کبیر اور مؤرخ اسلام۔ دمشق کے قریب ایک گاؤں میں 673ھ/1274ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد شہاب الدین احمد سونے کا کام کرتے تھے، اسی وجہ سے آپ بھی ذہبی کے نام سے معروف ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں علم حاصل کرنا شروع کیا، اور علم قرآت وعلم حدیث کی طرف توجہ کی، جلد ہی دونوں میدانوں میں فائق ہوگئے، علم حدیث کے لئے آپ نے سفر کیا، یہ علم آپ کے ذہن ودماغ پر اس قدر حاوی ہوگیا کہ بعد کی پوری زندگی اسی علم کی طلب وتحصیل اور اس کی خدمت میں گذری، علم حدیث ہی سے آپ کی توجہ تاریخ کی طرف مبذول ہوئی، اور اس فن میں بھی نمایاں ہوئے۔

مشہور محقق بشار عواد معروف نے امام ذہبی کی تصنیفات کی تعداد دوسو سے زائد شمار کی ہے، جن میں پچاس سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں تاریخ، سیرت اور تراجم پر ہیں، اور ستائیس رسائل میں شخصیات کے انفرادی حالات ہیں۔ تاریخ پر امام ذہبی کی اہم تصنیفات میں سیر اعلام النبلاء، تاریخ الاسلام، دول الاسلام، العبر فی خبر من غبر، تذکرۃ الحفاظ، معرفۃ القراء الکبار اور میزان الاعتدال وغیرہ ہیں۔ ذہبی کی سب سے اہم کتاب تاریخ الاسلام ہے جس کا پورا نام تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام ہے، اس کتاب میں امام ذہبی نے ابتدائے اسلام سے 700ھ/1300ء تک کے اہم واقعات کو سنہ وار ترتیب سے ذکر کیا ہے، اعلام اور مشاہیر کے حالات بھی واقعات کے پہلو بہ پہلو بیان کئے ہیں، امام ذہبی مقدمہ میں فرماتے ہیں: ''اس کتاب کو میں نے کئی تصانیف سے جمع کیا ہے، اس کے ذریعہ سے انسان ابتدائے تاریخ اسلام سے ہمارے زمانہ تک کے اہم واقعات کو معلوم کرسکتا ہے، خلفاء، قراء، زہاد، فقہاء، محدثین، علماء، سلاطین، وزراء، نحویین، شعراء، اور ان کے طبقات، اساتذہ، ان کے حالات زندگی اور اس زمانہ کے واقعات، مشہور فتوحات، بڑی جنگیں، عجائبات وغیرہ طوالت کے بغیر معلوم ہوسکتے ہیں''۔ اس کتاب کا زمانی دائرہ ساڑھے سات سوصدیوں کو محیط ہے، جبکہ مکانی رقبہ تمام عالم اسلام ہے، اس کتاب میں انہوں نے تقریباً چالیس ہزار افراد کے حالات زندگی بیان کئے ہیں، اس لئے یہ کتاب اپنے باب میں بے مثال ہے۔ امام ذہبی نے یہ کتاب اس دور میں تصنیف کی جب وہ طلب علم سے فارغ ہوکر اپنے گاؤں کی مسجد میں درس وخطابت میں مشغول ہوئے تھے، اور ان کی شہرت کا آفتاب بام عروج کو نہیں پہونچا تھا، اس کتاب نے ان کو مؤرخ اسلام کا لقب ملا۔ اس کا امتیاز یہ ہے کہ اسلامی حکومتوں کے انتظامی، سیاسی، اقتصادی احوال پر اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ اور وسیع مواد اس میں جمع کیا گیا ہے، اس میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے، ان میں سے کئی کتابیں ہم تک نہیں پہونچ سکیں، کتاب میں سات صدیوں تک عالم اسلامی کی علمی وفکری زندگی کا ارتقاء، اسلامی علوم کے اہم مراکز اور ان کی جلوہ سامانیاں، اسلامی تہذیب وثقافت کے مختلف پہلو، عروج وزوال، غرض ان صدیوں کا ایک ایسا مرقع سامنے آتا ہے، جس میں انسان ماضی کی تصویر بھی دیکھ سکتا ہے، اور وہ مستقبل کے خاکہ میں رنگ بھی بھر سکتا ہے۔

امام ذہبی کی دوسری اہم کتاب سیر اعلام النبلاء ہے، اس میں امام ذہبی نے حضرت محمد ﷺ سے لیکر اپنے دور تک کے ''اعلام'' یعنی

نمایاں شخصیات کے حالات زندگی بیان کئے ہیں، یہ اٹھائیس جلدوں پر مشتمل کتاب ہے، جس میں انہوں نے خلفاء، امراء، بادشاہ، وزراء، قضاۃ ، قراء، محدثین، فقہاء، ادباء، لغویین، نحویین، شعراء، متکلمین، فلاسفہ وغیرہ کے حالات ذکر کئے ہیں، ان میں اکثر محدثین ہیں، زمانی اعتبار سے اس کی مدت سات صدیوں پر محیط ہے، اور مکانی اعتبار سے اس کتاب کا دائرہ اندلس سے مشرق تک کے تمام عالم اسلامی کی اہم شخصیات تک وسیع ہے، ایسی شمولیت تاریخ کی کتابوں میں کم ہی دیکھنے میں آئی ہے، اس کتاب میں امام ذہبی نے شخصیات کے حالات میں پیدائش ونشو ونما، اساتذہ وتلامذہ، علمی، ادبی اور سماجی کارہائے نمایاں، علماء کی نظر میں ان کا مقام اور ان کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ سوانح تحریر کرنے میں امام ذہبی کا اسلوب بہت دلچسپ اور ممتاز ہے، اس لئے جب وہ کسی کتاب سے اخذ کرتے ہیں تو اگر مناسب ہو اس کی ترتیب میں بھی تغیر کرتے ہیں، ہاں اگر اقوال وآراء کو نقل کرتے ہیں تو بلفظہ ادا کرتے ہیں۔ سیر اعلام النبلاء تاریخ اسلام کا اختصار نہیں، اس میں جن شخصیات کے سوانح مذکور ہیں، ان میں تصحیح، تہذیب، حذف واضافہ اور استدراک بھی ہے۔ کیوں کہ یہ کتاب زمانی اعتبار سے طبقات پر مشتمل ہے، اس لئے اس سے مختلف ادوار کے مسلم سماج کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے، سماجی اور اقتصادی حالات بھی سامنے آتے ہیں، امام ذہبی نے ایسے افراد کا بھی تذکرہ کیا ہے جو سماج میں شاگرد پیشہ تھے، ان کی اقتصادی حالت نہایت کمزور تھی، لیکن علم کے میدان میں وہ شہسوار اور زینت مجالس تھے۔ ساتھ ہی وہ تمام شخصیات پر تنقیدی نظر بھی ڈالتے جاتے ہیں، اور علم حدیث کے اعتبار سے ان کا مقام ومرتبہ متعین کرتے جاتے ہیں۔

اخیر عمر میں امام ذہبی کی بینائی ختم ہوگئی تھی، اسی حالت میں 748ھ/1348ء میں دمشق میں انتقال ہوا۔

7.3.6 ابن خلدون

ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد، ابن خلدون، تونس میں 732ھ/1332ء میں پیدا ہوئے، خلدون آپ کے جدامجد کا لقب تھا، جو اندلسی تھے، اسی مناسبت سے آپ ابن خلدون کے نام سے معروف ہوئے۔ بچپن میں قرآن کریم حفظ کیا، اپنے والد سے اور تونس کے کبار علماء سے کسب فیض کیا، علوم شرعیہ، طبعیات، ریاضیات، منطق وفلسفہ کی تحصیل کی، طلب علم کی مزید خواہش کے باوجود والد کی وفات کی وجہ سے کسب معاش کی طرف متوجہ ہوئے، اور حکومت وسیاست میں دلچسپی لی، اپنی عمر کے پچیس سال اسی میدان میں گذارے، مصر، تونس اور مراکش کی حکومتوں میں قاضی، کاتب اور دیگر مناصب پر خدمت انجام دی، اندلس کا سفر کیا، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے، اسی دوران ان کو اتنی فرصت میسر آئی کہ اپنی عظیم کتاب تصنیف کی، جو تاریخ ابن خلدون کے نام سے معروف ہوئی، اور اس کا شہرہ آفاق مقدمہ تحریر کیا۔

ابن خلدون دور اندیش، باریک بیں، اور ایک عظیم ادیب ومصنف تھے، انہوں نے زمانہ کے سرد وگرم کا مزہ چکھا تھا، تاریخ عالم کا مطالعہ کیا تھا، مختلف علوم میں درک حاصل کیا تھا، اسفار بھی کئے، قبائل کے درمیان رہ کر ان کے طرز معیشت کا مشاہدہ کیا تھا، اس لئے انہوں نے اپنی تاریخ اور مقدمہ لکھنے میں اپنے علم ومطالعہ اور مشاہدات وتجربات سے کافی استفادہ کیا، اور ایک ایسا مقدمہ تحریر کیا جو فلسفہ تاریخ اور علم الاجتماع کی بنیاد قرار پایا، ابن خلدون کی شہرت تاریخ سے زیادہ ان کے مقدمہ سے ہے، جس میں انہوں نے قوموں کے عروج وزوال کے اسباب سے بحث کی ہے، انہوں نے اس کے لئے انسانی زندگی کی تشبیہ بیان کی ہے، جو پیدائش، بلوغ وشباب، پختگی اور پھر کمزوری وخاتمہ سے دوچار ہوتی ہے۔

ابن خلدون کی تاریخ کا پورا نام "كتاب العبر وديوان المبتدأ والخبر ومن عاصرهم من ذوى السلطان الاكبر" ہے، یہ

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ مطالعہ تاریخ کی ایک تمہید اور تمدن کے متعلق ایک مقدمہ پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ ابتدائے آفرینش سے آٹھویں صدی تک عرب اور دوسری قوموں کے حالات پر مشتمل ہے، تیسرے حصہ میں بربر کی تاریخ ہے، ڈاکٹر طہ حسین لکھتے ہیں:...... (ابن خلدون) کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ تاریخ کے مطالعہ وتحریر کے طریقہ میں ایک بڑا تغیر پیدا کرنا چاہیے، اس لئے اس نے تاریخ کی صحت اور اس کو عمدہ طور پر سمجھنے کے لئے ضروری خیال کیا کہ تاریخی واقعات کی تحقیق اور ان قوانین کو پیش کرنے کے لئے جن کے مطابق نظم اجتماعی واضح طور میں عمل پذیر ہو سکے، ایک مضبوط طریقہ قائم کیا جائے۔ تاریخ کو ایک عمدہ روش پر لے چلنے اور ان غلطیوں سے بچنے کے لئے جن میں مؤرخین پڑ گئے ہیں، ابن خلدون ان اسباب سے بحث کرتے ہیں جن کی وجہ سے یہ غلطیاں واقع ہوئی ہیں، اس کے سات سبب ہیں جو تین اصول پر مبنی ہیں، ایک مصنفین کی جانب داری، دوسرے مؤرخ کا راوی کی تمام روایات کی تصدیق کرنا، تیسرے تمدن کے حالات کی حقیقت سے ناواقفیت۔

ابن خلدون نے اپنی تاریخی روش کے بارے میں اپنے مقدمہ میں خود بیان کیا ہے کہ ''تاریخ ظاہر میں تو زمانوں اور سلطنتوں کی روایتوں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی، لیکن باطن میں وہ نام ہے نظر و تحقیق کا مخلوقات اور اس کے اصول کی باریک تعلیل کا، اس گہرے علم کا جس کا تعلق واقعات کی کیفیت اور اسباب سے ہے، اس حیثیت سے اس کے رگ و ریشے فن حکمت سے وابستہ ہیں، اور وہ اس کی مستحق ہے کہ اس کا شمار علوم حکمیہ میں کیا جائے''۔

ابن خلدون سے پہلے تاریخ صرف سیاسی واقعات کے تسلسل کا نام تھا؛ لیکن ابن خلدون غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ اجتماع اقوام وہ مقام ہے جہاں حوادث پیدا ہوتے ہیں، اور نشو و نما پاتے ہیں۔ وہ بدوی قبیلہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، کیوں کہ ان کی رائے میں وہی ہر سلطنت کی اصل ہے، قناعت، خشونت اور عصبیت کی زندگی اس کو فتح پر آمادہ کرتی ہے، ور ایک زمانہ تک کے لئے اس کو ایک ایسا اقتدار عطا کرتی ہے جس میں استبداد کی آمیزش نہیں ہوتی، پھر وہ عیش و عشرت میں ڈوب کر عصبیت کھو دیتی ہے، اور مائل بہ استبداد پھر مائل بہ زوال ہو جاتی ہے۔ تاریخ اسی طرح ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اپنے آپ کو دہرایا کرتی ہے۔

مقدمہ کے مطالعہ سے ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابن خلدون ایک عظیم مدبر، مفکر، مؤرخ اور علم الاجتماع کے ماہر ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے بعد مسلمانوں میں ان کی طرح اس علم کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے والا پیدا نہیں ہوا۔ مقریزی کہتے ہیں کہ مقدمہ ایک ایسا کارنامہ ہے، جو کسی انسان نے کسی دور اور کسی مقام پر انجام نہیں دیا۔

ابن خلدون کا انتقال 808ھ/1406ء میں قاہرہ میں ہوا۔

7.3.7 معلومات کی جانچ

1. طبری کی تاریخ پر ایک نوٹ تحریر کیجئے۔
2. مسعودی کا بحیثیت مؤرخ جائزہ لیجئے۔
3. امام ذہبی کی تاریخی تصنیفات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں تحریر کیجئے۔

7.4 جغرافیہ

7.4.1 علم جغرافیہ اور مسلمان

مسلمانوں کو علم جغرافیہ کی ضرورت ان کی مذہبی، سماجی اور علمی ضروریات کی وجہ سے محسوس ہوئی، قرآن میں زمین میں چلنے پھرنے اور گذشتہ اقوام کے حالات میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے (آل عمران)، سورج کے طلوع وغروب، چاند کی منزلوں، زمین، سمندر، پہاڑ اور طبعی حالات میں غور وفکر پر بھی ابھارا گیا ہے، حج کے سفر کا ہر مسلمان کو اشتیاق رہا کرتا تھا، اور دور دور سے لوگ مکہ کی طرف روانہ ہوتے تھے، اس کے لئے انہیں ایسی کتابوں کی ضرورت پڑتی تھی جو راستوں اور مسافتوں کے متعلق ان کی رہنمائی کریں، حج کے سفر سے ہی متعدد مسلم سیاحوں کی سیاحت کا آغاز ہوتا ہے۔ جو آگے چل کر علم جغرافیہ میں اپنے سفر ناموں سے رنگ بھرتے ہیں۔

فتوحات اسلامی کی وسعت سے ملکوں کے درمیان دوریاں کم ہوئیں، دربار خلافت کو اپنے تمام مفتوحہ ممالک کے احوال جاننے کی فکر ہوئی، اور اس کے لئے بھی انہوں نے حکومت کے ذمہ داروں اور علماء کو آمادہ کیا کہ وہ آباد دنیا کا نقشہ بنائیں۔ عباسی خلافت کے دور میں ترجمہ کا کام تیز تر ہوا، اور مختلف زبانوں کے علوم ترجمہ ہو کر عربی میں منتقل ہوئے، ان میں ہندوستان سے آنے والی کتاب سدھانتا اور یونان سے آنے والی بطلیموس کی کتاب المحسطی علم جغرافیہ میں عربوں کا ابتدائی علمی ماخذ بنیں، عموما عربوں کی تصنیفات میں بطلیموسی نظام سے شدید تاثر ظاہر ہوتا ہے۔ عباسی خلیفہ مامون نے دیگر علوم کی طرح علم جغرافیہ میں دلچسپی لی، اس نے تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں ایک نقشہ بنوایا تھا، جو خریطہ مامونی کے نام سے مشہور ہوا، اور ایک عرصہ تک جغرافیہ دانوں کا مرجع بنا رہا، آگے چل کر علم جغرافیہ میں مسلمانوں نے بے مثال خدمات انجام دیں، اور اس علم کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے چند جغرافیہ دانوں کے نام اور کام پر یہاں روشنی ڈالی جاتی ہے۔

7.4.2 ابن خُرداذبہ

ابو القاسم عبید اللہ بن احمد الکاتب تقریبا 205ھ/820ء میں پیدا ہوئے، دادا کا نام خرداذبہ تھا جو مجوسی تھے اور برامکہ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا تھا، انہی کی نسبت سے ابو القاسم عبید اللہ کی شہرت ابن خُرداذبہ کے نام سے ہوئی، ان کے والد فوجی تھے، اور طبرستان میں تعینات تھے، اور بعض علاقوں کو فتح کرنے کی وجہ سے ان کی شہرت ہوئی تھی، ابن خرداذبہ نے ادب اور موسیقی کا علم حاصل کیا، وہ مؤرخ بھی تھے۔ ان کو عباسی خلیفہ معتمد کے دربار میں تقرب نصیب ہوا، اور ان کے ہم نشین ہوئے اور عراق کے شمالی منطقہ میں جس کو اس وقت جبل کا علاقہ کہا جاتا تھا، خبر رسانی اور ڈاک کی خدمات پر مامور ہوئے، اس لئے صاحب البرید کہلائے، اس اہم منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے ان کو سرکاری کاغذات، ڈاک کے راستوں کے نقشے اور اہم دستاویزات تک رسائی آسان تھی۔

ابن خُرداذبہ نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں المسالک والممالک، جمہرۃ انساب الفرس، کتاب اللہو والملاہی وغیرہ ہیں، ان میں سب سے زیادہ شہرت کتاب المسالک والممالک کو حاصل ہوئی، جس میں انہوں نے زمین کا وصف اور مختلف ممالک کے جغرافیائی حالات بیان کئے ہیں، اپنے دور کے لحاظ سے ابن خرداذبہ کی معلومات دنیا کے ممالک کے متعلق نہایت وسیع ہیں، خصوصا سواد عراق کے مختلف حصوں کی جغرافیائی حالت انہوں نے نہایت خوبی سے بیان کی ہے، ان کی کتاب میں ہم کو زمین کے گول ہونے کا تصور ملتا ہے، نیز ان کے نزدیک زمین

کائنات میں بغیر کسی سہارے کے قائم ہے، زمین پر موجود اشیاء کے جمے رہنے کا سبب وہ کشش ثقل کو قرار دیتے ہیں، کتاب کے آغاز ہی میں وہ کہتے ہیں: زمین کا وصف یہ ہے کہ وہ گیند کی طرح گول ہے، اور آسمان کے بیچ میں اس طرح قائم ہے جیسے انڈے کے اندر کی زردی، اور زمین کے ارد گرد ہوا کا غلاف ہے جو اس کو آسمان کی طرف کھینچ رہا ہے، اور زمین پر مخلوقات اس طور سے ہیں کہ ہوا ان کو آسمان کی طرف کھینچتی ہے، اور زمین ثقل کی وجہ سے ان کو اپنی طرف کھینچتی ہے، کیوں کہ زمین کی مثال حجر (مقناطیس) کی طرح ہے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ تمام معلومات مصنف نے بطلیموس کی کتاب المجسطی سے اختصار کر کے بیان کی ہیں۔

کتاب میں ابن خرداذبہ نے مختلف ممالک کو ملانے والے راستے اور درمیانی مسافتیں تفصیل سے بیان کی ہیں، انہوں نے اپنی کتاب میں چین تک کے راستہ اور شاہ راہ ریشم کا تذکرہ بھی کیا ہے، کتاب میں ساتھ فصلیں ہیں، سب سے پہلے انہوں نے ہی ''مسالک وممالک'' کا لفظ استعمال کیا، جو بعد میں اس فن کی کتابوں کے لئے مشہور ہوا۔

کتاب المسالک والممالک کو جغرافیہ کے کتب خانہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، ہالینڈ کے مستشرق ڈی خویہ (De Goeje) نے اس کتاب کی تحقیق کی اور لائڈن سے شائع کیا، وہ کہتے ہیں کہ ایک مدت تک طالب علموں اور مؤلفین کے نزدیک یہی کتاب متداول رہی، کیوں کہ یہ ایسی معلومات پیش کرتی ہے جو اس وقت تک معلوم نہیں تھیں، ابن خرداذبہ نے اقصائے مغرب اور اقصائے مشرق تک بری اور بحری راستوں کی تجارت کا تذکرہ کیا ہے، بعد کے آنے والے جغرافیہ دانوں اور مؤرخین نے اس کتاب سے کافی فائدہ اٹھایا۔ مغرب میں ان کو (Khordadhbeh) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ابن خرداذبہ کی وفات 300ھ/912ء میں بغداد میں ہوئی۔

7.4.3 اصطخری

ابو اسحاق ابراہیم بن محمد، ایران کے قدیم شہر اصطخر میں پیدا ہوئے، چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی عالم اسلام ان کے حالات زندگی غیر معروف ہیں، یہ معلوم ہے کہ انہوں نے عالم اسلام کے بڑے حصہ کی سیاحت کی، دیار عرب، خلیج عربی، ایران اور ایشیا کے مختلف حصوں کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے، اپنی سیاحت میں وہ بحر اٹلانٹک تک بھی پہونچے۔ سیاحت کے دوران انہوں نے اپنے ملاحظات، افکار اور مشاہدات کو مدون کیا، علاقوں کے درمیان اختلافات اور فروق کو نوٹ کیا، اقوام وممالک کا بیدار مغزی سے مطالعہ کیا۔ راستوں کے درمیان کی مسافتوں کی طرف بھی توجہ کی۔ طویل اسفار کرنے کی وجہ سے اپنی کتابوں میں انہوں نے جغرافیائی معلومات کو نہایت باریکی اور وضاحت کے ساتھ درج کیا ہے۔

اصطخری کی شہرت ان کی دو کتابوں ''مسالک الممالک'' اور ''صور الاقالیم'' کی وجہ سے ہے، اصطخری کا شمار ان جغرافیہ دانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی کتابوں کا مواد تیار کرنے میں تصانیف اور مشاہدہ دونوں کو بنیاد بنایا، صور الاقالیم کا نام انہوں نے اپنے پیش رو ابو زید بلخی کی کتاب کے نام سے لیا ہے، جیسا کہ خود انہوں نے بیان کیا، اور مسالک الممالک کا نام انہوں نے ابن خرداذبہ کی کتاب سے متاثر ہو کر رکھا، دونوں کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ثانی الذکر کتاب میں انہوں نے عالم اسلام کو بیس خطوں (اقالیم) میں تقسیم کیا ہے، اور اقلیم عرب سے کتاب کی ابتدا کی ہے، ام القری مکہ کو وہ ان تمام اقالیم کا مرکز قرار دیتے ہیں، عرب کے بعد خلیج فارس، پھر، عرب کے مغربی حصہ کا جغرافیہ بیان

کرتے ہوئے مصر تک پہونچتے ہیں، پر شام، بحر روم، جزیرہ، عراق، خوزستان، ایران، کرمان منصورہ، سندھ، ہندوستان تک آجاتے ہیں، اس کے آگے انہوں نے آذربائجان، دیلم، بحر خزر، بجستان، خراسان پھر ماوراء النہر کے علاقے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ اقالیم کی تفصیلات میں وہ وہاں کے شہروں، علاقوں، سمندروں، پہاڑوں اور نہروں کی تفصیلات بھی ذکر کرتے جاتے ہیں۔ روسی مستشرق کراچ کووسکی اپنی کتاب تاریخ الادب الجغرافی العربی میں اصطخری کے منہج کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ ''اصطخری ہر ملک کی معلومات اس کی سرحدوں، شہروں، مسافتوں، حمل ونقل کے راستوں سے متعلق ذکر کرتے ہیں، اسی طرح تجارت وصناعت، پیداوار، اور اجناس کی متفرق تفصیلات بھی بیان کرتے ہیں، جن ملکوں کی زیارت کی ہے اکثر تفصیلات انہی کے متعلق بیان کی ہیں، لیکن کبھی کبھی ان کی اختصار بیانی کی بھی بڑی اہمیت ہے، انہوں نے صقلیہ کے متعلق کم معلومات فراہم کی ہیں، لیکن جو معلومات دی ہیں وہ جوہری اور نہایت اہم ہیں، یہی حال بحر متوسط کے جزیرہ قلال کے بارے میں فراہم کی ہوئی معلومات کا ہے، جو ساحل فرانس کے نزدیک واقع ہے۔ صقالبہ سے متعلق ان کی معلومات منتشر اور قلیل ہیں، لیکن ان کی اپنی اہمیت ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے ہر اقلیم کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد نقشے بھی بنائے ہیں، ان کے تیار کیے ہوئے نقشے اس عہد کے علم جغرافیہ ونقشہ سازی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ مسالک الممالک میں اصطخری نے ہر اقلیم کا ایک نقشہ بھی بنایا ہے، جس میں اس کی جغرافیائی اور طبیعی ساخت کو نمایاں کیا ہے، اور اخیر میں پوری دنیا کا ایک نقشہ بھی دیا ہے۔ اصطخری کی کتابوں میں تفصیلات، شمولیت، باریک بینی، توسع اور مقابلہ جاتی منہج نظر آتا ہے، انہوں نے زمین کے طبیعی حالات، آبادی، مسافتیں، حمل ونقل کے ذرائع، تجارت وصناعت، تعمیری اور تہذیبی ترقی، شہروں کی بناوٹ وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ان کی کتابوں نے بعد کے آنے والے محققین اور طلبہ کے فن جغرافیہ کو آسان تر بنا دیا، اور وہ معلومات ان کو مہیا کیں، جو بآسانی میسر نہ آسکتی تھیں، اسی وجہ سے وہ بعد کے لوگوں کا مرجع بنیں، مستشرقین نے بھی ان پر دھیان دیا، مسالک الممالک کو سب سے پہلے جرمن مستشرق مولر نے 1839ء میں لاطینی مقدمہ کے ساتھ شائع کیا، اس کے بعد ڈی خویہ نے پانچ قلمی نسخوں کی مدد سے 1870ء میں لائڈن سے شائع کیا، اس کتاب کے کئی فارسی تراجم بھی ہوئے، اور شائع ہو چکے ہیں۔

ابو اسحاق اصطخری کی وفات 346ھ/957ء میں ہوئی۔

7.4.4 مقدسی

شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد البشاری، مشہور جغرافیہ داں، 335ھ/946ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے، اس مناسبت سے آپ کو مقدسی کہا جاتا ہے، دادا ابو بکر معمار تھے، اس لئے البنا (معمار) کے لقب سے بھی مشہور ہوئے، قرآن کریم حفظ کیا۔ لغت اور ادب کا علم حاصل کیا، فارسی زبان بھی گھر میں سیکھی، پھر طلب علم میں عراق کا قصد کیا، فقہ حنفی اور علم کلام کی تحصیل کی، کتب خانوں اور علماء کی مجلسوں سے بکثرت استفادہ کیا، تجارت کو اپنا پیشہ بنایا، اور عالم اسلام کے بڑے حصہ کی سیاحت کی، انہوں نے اپنا سفر اپنے شہر بیت المقدس سے شروع کیا، اور حج کے ارادہ سے حجاز گئے، پھر عراق، جزیرہ، شام، مصر، مراکش تک پہونچے، عجمی ممالک میں انہوں نے منطقہ مشرق، ملک دیلم، جبال، خوزستان، فارس، کرمان، سندھ کی سیر کی، مقدسی کو سیاحت، مطالعہ اور علماء سے استفادہ کے نتیجہ میں انسانی اور طبعی جغرافیہ کے بارے میں وسیع معلومات حاصل ہو گئی تھیں، انہوں نے اپنے مطالعہ ومشاہدہ کی روشنی میں مشہور عالم کتاب تحریر کی، جو ان کی شہرت کا سبب بنی۔

مقدسی کی کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم قرون وسطی میں تحریر کی گئی جغرافیہ کی بہترین اور اہم کتابوں میں سے ہے، جس میں

انہوں نے عالم اسلام کا خصوصاً اور تمام دنیا کا عموماً جغرافیہ پیش کیا ہے، انہوں نے ممالک کی تقسیم میں اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں نئی راہ نکالی اور سب سے اول دین کی بنیاد پر عالم کو تقسیم کیا، ایک عالم اسلامی، اور دوسرا غیر اسلامی۔ تقسیم کی دوسری بنیاد زبان کو بنایا ایک عربی ممالک جن میں جزیرۃ العرب، شام، عراق، مصر، مغرب (مراکش)، آقور (سرحدی علاقے مثلاً دیار بکر اور دیار مضر) چھ علاقے (اقلیم) آتے ہیں اور دوسرے عجمی ممالک جن میں مشرق، دیلم، رحاب، جبال، خوزستان، فارس، کرمان، سندھ آٹھ ممالک آتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہر اقلیم کو پانچ انتظامی حصوں میں تقسیم کیا ہے، جس کی بنیاد آبادی ہے، سب سے بڑی اکائی اقلیم، اس کے بعد کورہ، اس کے بعد قصبہ، اس کے بعد مدینہ (شہر) اس کے بعد قریہ (گاؤں)۔ اسی طرح انہوں نے سیاسی تقسیم کی ہے، خلیفہ، بادشاہ، پھر حاجب، پھر جند، پھر عام آدمی۔

مقدسی نے اپنی کتاب میں جغرافیائی اعتبار سے اپنے پیش نظر کئی مقاصد رکھے ہیں، وہ سب سے پہلے ہر اقلیم کی شناخت اور اس کے خدوخال نمایاں کرتے ہیں، پھر اس اقلیم کے طبعی جغرافیہ یعنی پہاڑ، صحرا، جنگل، ترائیوں اور وادیوں کو لیا ہے، اس کے بعد ماحول، موسمی حالات بیان کرتے ہیں، اسی طرح وہ اس ملک کے ذخائر آب، نہریں اور دریاؤں نیز سمندر اور بحیرہ کی کیفیت بھی بیان کرتے ہیں۔ طبعی جغرافیہ کے ساتھ مقدسی انسانی جغرافیہ پر بھی تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔ ملک کے باشندوں اور قبیلوں، ان کے رسم ورواج، عادات، زبانیں، ادیان ومذاہب کو بھی بیان کیا ہے، ملک کے اقتصادی حالات، زرعی پیداوار، زراعت کی قسمیں، حیوانات، معدنیات، صنعتیں، تجارت، بازار، ٹیکس اور خراج کا نظام، ناپ تول کے پیمانے، مروج کرنسی کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔ راستوں، شہروں اور اہم علاقوں کے درمیان کی مسافتوں اور راستوں، تاریخی آثار، مقبرے، مساجد کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔

مقدسی نے ان جغرافیائی حالات بتانے کے لئے نقشوں سے بھی کام لیا ہے، یہ نقشے خود ان کے بنائے ہوئے ہیں، نقشہ نویسی میں ان کے اختراعی ذہن نے رنگوں کے استعمال میں جدت برتی ہے، جغرافیائی خدوخال کو نمایاں کرنے میں سمندر کے لئے سبز رنگ اور میٹھے پانی کے ذخیروں مثلاً نہر اور تالاب کے لئے آسمانی رنگ استعمال کیا ہے، پہاڑ کے لئے بھورا رنگ استعمال کیا ہے، جو پہاڑ کی بلندی کے ساتھ گہرا ہوتا جاتا ہے، راستوں کے لئے سرخ، اور صحراؤں، جنگلات اور ریت کے لئے زرد رنگ استعمال کیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں انہوں نے اس فن کی گذشتہ کتابوں کا جائزہ لیا ہے، اور بعض معلومات پر شدید تنقید بھی کی ہے۔ مقدسی کا شمار قرون وسطی کے عظیم جغرافیہ دانوں میں ہوتا ہے، مشہور مستشرق اسپرنگر (Sprenger) کے بقول مقدسی تمام عالم میں سب سے عظیم جغرافیہ داں ہیں، اسفار کی کثرت، مشاہدہ میں باریک بینی اور اپنے مواد کو منظم طور سے پیش کرنے میں کوئی شخص ان کی طرح ان سے قبل نہیں گذرا۔ فؤاد سزکین لکھتے ہیں: فرانسیسی مستشرق علم جغرافیہ کے ماہر اندرے مائکل (Andre Michael) جنہوں نے احسن التقاسیم کا ایک طول عرصہ تک گہرائی سے مطالعہ اور اس کے بڑے حصہ کو فرانسیسی زبان میں منتقل ہوا، ان کا کہنا ہے کہ مقدسی انسانی جغرافیہ کی نئی طرح ڈالنے والے ہیں۔

مقدسی کی وفات 380ھ/990ء میں ہوئی۔

7.4.5 البیرونی

ابوریحان محمد بن احمد، خوارزم کے نواحی علاقہ (موجودہ خیوا، ازبکستان) میں 362ھ/973ء میں پیدا ہوئے، مضافاتی علاقہ کی

نسبت سے بیرونی کے لقب سے مشہور ہوئے، یوروپ میں ان کو Aliboron کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بچپن میں قرآن شریف حفظ کیا، حدیث، فقہ، ریاضیات، فلکیات کا علم حاصل کیا، منصور بن علی سے ریاضیات کا علم حاصل کیا، یونانی اور سنسکرت زبانیں سیکھیں، متعدد علوم ریاضیات، طبعیات، جغرافیہ، دوا سازی، فلکیات، فلسفہ، علم تاریخ، لغت اور ادب میں کمال حاصل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں بیرونی کی طرح جامع الکمالات اور مختلف علوم میں اختصاصی شان رکھنے والی شخصیت بہت کم نظر آتی ہے، اور جن کے بارے میں یہ طئے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کو کس فن کے تحت ذکر کیا جائے۔ اپنی گونا گوں صلاحیتوں کی وجہ سے جلد بیرونی کی شہرت ہوئی، اور شاہان عالم ان کو اپنے دربار علم کی زینت بنانے کے لئے کوشاں ہوئے، اولا بخاری میں بنو سامان کے حکمراں خاندان سے تعلق ہوا، جہاں البیرونی کی ابن سینا سے ملاقات ہوئی، آل سامان کے زوال کے بعد جرجان میں شمس المعالی کے دربار کو زینت بخشی، یہاں انہوں نے اپنی نادر کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیۃ تصنیف کی اور شمس المعالی کو تحفۃ پیش کی، اس کے بعد وہ اپنے وطن خوارزم لوٹے، جہاں امیر مامون نے ان کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کیا، 407ھ/1016ء میں جب امیر مامون مقتول ہوا تو اس کا بدلہ لینے کے لئے محمود غزنوی خوارزم میں داخل ہوا، اور واپسی میں بیرونی کو بھی ساتھ لیتا گیا، امیر محمود کے ساتھ بیرونی نے ہندوستان کا سفر کیا، اور اس کے ساتھ تیرہ مرتبہ ہندوستان آنے کا موقع ملا، جہاں بیرونی نے بہت تفصیل سے ہندوستان کے حالات قلم بند کئے، محمود کے بعد اس کے لڑکے مسعود کے لئے القانون المسعودی تصنیف کی، جو علم ہیئت اور علم نجوم کی اہم کتابوں میں ہے، امیر مسعود نے اس کے صلہ میں تین انٹوں پر چاندی لدوا کر روانہ کی تو بیرونی نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ: ہم علم برائے علم خدمت کرتے ہیں، علم برائے مال نہیں، غزنہ میں بیرونی نے طویل عرصہ گذارا اور اخیر عمر تک یہیں رہے، اپنی اکثر کتابیں یہیں تصنیف کیں۔

بیرونی کی شہرت ان کی کتابوں کی وجہ سے ہے، جو انہوں نے عربی اور فارسی زبان میں تصنیف کیں، مختلف علوم میں ان کی تالیفات اختراعی نوعیت کی حامل ہیں، ڈاکٹر سخاو نے بیرونی کی 113 تصنیفات ذکر کی ہیں، اور بعد کی تحقیقات میں ان کی تعداد 150 سے زیادہ شمار کرائی گئی ہیں۔ علم فلکیات میں ان کی کئی کتابیں ہیں، جن میں کتاب العمل بالاسطرلاب، الاستیعاب فی صنعۃ الاسطرلاب، کتاب مقالید الہیئۃ، کتاب تسطیح الکرہ کے علاوہ دو اہم کتابیں القانون المسعودی اور التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم ہیں، جن میں انہوں نے متعدد علمی حقائق پیش کئے، جن میں زمین کی پیمائش اور چاند کے مقابلہ اس کے تناسب کا بیان ہے، انہوں نے بتایا کہ سورج زمین کا مرکز ہے، انہوں نے چاند سے سورج کے فاصلہ پر گفتگو کی، التفہیم لاوائل التنجیم میں انہوں نے سورج گرہن اور چاند گرہن کے مشاہدے بیان کئے، اور وضاحت کے ساتھ شفق اور غسق کی کی تشریح کی۔ اپنے ریاضیاتی نظریہ استعمال کر کے قبلہ کی تحدید کی، بیرونی کے نام سے ریاضیات کے کئی مسائل معروف ہیں، انہوں نے زاویہ کو تین برابر اقسام میں تقسیم کرنے کی کوشش کی، زمین کا قطر معلوم کیا، اور یہ بھی بتایا کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے تیز ہے۔ بیرونی نے الجبرا پر توجہ دی، خوارزمی کی کتابوں کا باریکی سے مطالعہ کیا، اور سہ درجی مساوات کا مطالعہ کیا، اور جیومٹری کے ذریعہ اس کو ترقی دی، اور قرون وسطی کی مشہور مساوات (س3=1 3 س) کو حل کیا، اور اس کے جذور کے چھ اعشاری مقام تک نتائج حاصل کئے۔ البیرونی نے اپنی کتاب الجواہر فی معرفۃ الجواہر میں جو دائرۃ المعارف حیدر آباد سے چھپ چکی ہے، بعض جواہر اور فلزات کا نوعی وزن بیان کیا ہے، قیمتی پتھروں مثلا یاقوت، لولو، زمرد، الماس، فیروزہ، عقیق، مرجان اور جست وغیرہ کی تفصیلات دی ہیں، ساتھ ہی معدنیات پارہ، سونا، چاندی، پیتل، لوہا اور تانبہ اور ان کی طبعی صفات رنگ، چمک، شفافیت، انتشار ضوء، ٹھوس ہونے وغیرہ پر بحث کی ہے، علم کیمیا میں بھی بیرونی کی حصہ داری اہمیت کی حامل ہے، اور علم طب میں ان کی مشہور کتاب الصیدلہ فی الطب ہے، جس میں دواؤں کے اسماء وخواص اور اطباء کی آراء ذکر کی ہیں، اور ابجدی

ترتیب پر اس کو مرتب کیا ہے۔

بیرونی کی سب سے پہلی کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ہے، اس کتاب میں انہوں نے مختلف اقوام کے درمیان رائج جنتریوں کو ذکر کیا ہے، کتاب میں ریاضیات، طبیعیات، فلکیات کی بھی بحثیں ہیں، اور عہد قدیم کے آشور، بابل، کلدانی قبطی، رومی اور یونانی بادشاہوں کی تاریخ بھی ذکر کی ہے۔

بیرونی کی اہم ترین کتابوں میں ہندوستان کے متعلق ان کی کتاب ہے، جس کو کتاب الہند کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کتاب کا پورا نام "تحقیق ما للھند من مقولة مقبولة فی العقل او مرذولة" ہے، یہ کتاب البیرونی کے طویل سفر ہند کا نچوڑ اور ان کی انتھک کاوشوں کا ثمرہ ہے، اس کتاب میں انہوں نے عہد وسطی کے ہندوستان کا جغرافیہ، تاریخ، علوم اور مذاہب بیان کئے ہیں، انہوں نے یہاں رہ کر سنسکرت زبان سیکھی۔ کئی سال یہاں گذارے، باوجود سخت دشواریوں کے جو سیاسی اور دینی اسباب سے ان کو پیش آئیں اپنی جد وجہد جاری رکھی، اور پنڈتوں سے ہندوستانی علوم حاصل کئے۔ اس کتاب میں اسی ابواب ہیں، جن میں سنسکرت کے تین ہزار سے زیادہ الفاظ آئے ہیں، اس کتاب میں بیرونی نے جغرافیہ طبیعی پر توجہ مرکوز کی ہے۔ وہ ہندوستان کی طبعی خصوصیات، ترائیاں، پہاڑ، آب وہوا، حمل ونقل کے ذرائع، تجارت، زراعت، حیوانات، لوگوں کے عقائد ومذاہب، آداب واخلاق، تاریخ کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں ان کی کتاب بعد کے علماء کا مرجع بن گئی ہے۔ اس کی طباعت سب سے اول 1925ء میں لیبزگ میں ہوئی مستشرق سخاؤ نے اس کو تصحیح وتحقیق کے بعد شائع کیا، پھر دوبارہ حیدر آباد سے 1958ء طبع ہوئی۔

علم جغرافیہ میں بیرونی کا پایہ بہت بلند ہے، اس سلسلہ میں ان کی اہم کتاب القانون المسعودی ہے، جو انہوں نے مسعود غزنوی سے منسوب کر کے اس کو تحفۃ پیش کی تھی، اور ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ کے مطابق یہ سب سے بڑا شاہکار ہے جو البیرونی نے اپنی زندگی میں انجام دیا ہے۔ اس کتاب میں 11 مقالات ہیں، اور ہر مقالہ میں تین سے نو ابواب ہیں، فصل خامس کے نویں اور دسویں باب میں کرہ ارضی کے آباد منطقوں کے حالات درج کئے ہیں، کتاب میں جداول اور نقشے بنائے گئے ہیں، جو دنیا کے آباد ملکوں کے طول البلد اور عرض البلد جاننے کے لئے تیار کئے گئے ہیں، علم جغرافیہ میں ان کی بڑی اہمیت ہے، عرب جغرافیہ دانوں میں شائد بیرونی پہلے شخص ہیں جنہوں نے آباد عالم کو اس تفصیل سے طول البلد اور عرض البلد میں تقسیم کیا ہے، بعد میں آنے والے ادوار میں عالم اسلام میں کئی رصد گاہیں قائم ہوئیں، لیکن کوئی بھی ماہر فلکیات یا جغرافیہ داں بیرونی کے نقشوں سے بے نیاز نہیں رہ سکا، ابوالفدا، یاقوت، طوسی اور الغ بیگ وغیرہ نے بیرونی کے نقشہ جات سے استفادہ کیا ہے۔ اس موضوع پر بیرونی کی مزید چار کتابیں پائی جاتی ہیں، جو تحدید نھایات الاماکن، تہذیب الاقوال فی تصحیح العروض والاطوال، تصحیف المنقول من العرض والطول، اور تصحیح الطول والعرض للمساکن المعمورۃ من الارض ہیں۔

ڈاکٹر عباس سعدی نے ریاضیاتی جغرافیہ پر ان کی تصانیفات کی تعداد دس تک ذکر کی ہے، اور کہا ہے کہ بیرونی نے زمین کی ہیئت پر چار کتابیں تحریر کیں، جغرافیہ میں ان کی اختراعات میں سے یہ ہے کہ انہوں نے زمین کی کروی شکل کو مسطح ورق پر نقل کرنے کے طریقے ذکر کئے ہیں، اس سلسلہ میں ان کی تصنیفات "تسطیح الصور وتبطیح الکور"، "تحدید المعمورۃ وتصحیحھا فی الصورۃ"، کتاب تکمیل صناعۃ التسطیح" ہیں، اور القانون المسعودی میں کئی فصلیں اس کے لئے خاص ہیں۔ فؤاد سزکین لکھتے ہیں کہ البیرونی نے اپنی کتاب "تحدید نهايات الاماكن لتصحيح

مسافات المساکن ''میں ریاضیاتی جغرافیہ کے علم کی بنیاد ڈالی ہے، اور وہ اس کی وجہ سے علوم کی تاریخ میں ''علم ریاضیاتی جغرافیہ'' کے باوا آدم کہلانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے طول البلد کا حساب جاننے کے لئے غزنی اور بغداد کے درمیان چالیس مقامات کا استعمال کیا، جن نتائج تک بیرونی پہونچے تھے ان میں اور موجودہ زمانہ میں طول البلد کے جو درجات معلوم کئے گئے ہیں ان میں بہت کم فرق ہے۔ بیرونی نے زمین کی پیمائش کی تھی، اور ایک نصف کرہ بنایا تھا جس پر دنیا کے آباد علاقوں کا نقشہ بنایا تھا، اور اس کو سامنے رکھ کر وہ اپنے فلکیاتی مشاہدات کو جانچتے تھے۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان کی ترائی کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ یہ جگہ سمندر کی گہرائی میں واقع تھی جس کو رسوبات نے بھر دیا تھا، انہوں نے زمین کے قشرہ یعنی پہلی پرت کے بننے کے بارے میں اپنی آراء ذکر کی ہیں، انہوں نے کہا ہے کہ زمین کے قشرہ کے بننے کا عمل بہت دھیرے دھیرے وجود پذیر ہوا، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ زمین کے طبقات میں کھدائی کے دوران جو باقیات دریافت ہوتی ہیں وہ قدیم زمانوں کی مخلوقات کی باقیات ہیں۔

بیرونی نے بہت طویل اسفار کئے، اس وجہ سے انہوں نے وسط ایشیا، افغانستان، ہندوستان وغیرہ کے متعلق مفصل معلومات پیش کی ہیں، اور اس وقت تک ان علاقوں کے بارے میں عربوں کو زیادہ معلومات نہیں تھیں، اس طرح بیرونی نے ایک اہم علمی خلا کو پورا کیا، اور اس کی بنیاد خود اپنے مشاہدہ، ذاتی تجربہ اور خالص علمی تحقیق پر رکھی۔ کیوں کہ انہوں نے سنسکرت زبان کے علاوہ عبرانی، یونانی سریانی زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا تھا۔

البیرونی کو یوروپ میں بطلیموس العرب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، جارج سارٹن کے مطابق ''بیرونی''مسلمان علماء میں سب سے عظیم عالم اور دنیا کے بڑے سائنس دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مستشرق سخاو نے کہا ہے کہ تاریخ کی سب سے عظیم عقلیت کا نام بیرونی ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں ناسا نے چاند کے دہانوں میں سے ایک دہانہ کا نام البیرونی کے نام پر رکھا ہے۔ بیرونی کی وفات 440ھ 1048ء میں غزنہ میں ہوئی۔

7.4.6 ادریسی

ابوعبداللہ محمد بن محمد، آپ کے جد امجد ادریس مراکش کی ادریسی سلطنت کے بانی تھے، ان کی طرف نسبت کی وجہ سے ادریسی کہلاتے ہیں، اور حضرت علیؓ سے نسبی تعلق ہونے کی وجہ سے شریف ادریسی کے لقب مشہور ہیں، مراکش کے ایک خوبصورت ساحلی شہر سبتہ میں 493ھ/ 1100ء میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں قرطبہ منتقل ہوگئے، جو دنیا کا عظیم تعلیمی وثقافتی مرکز تھا، یہیں پرورش ہوئی، اور یہاں کی جامعات میں سائنس اور ریاضیات کی تعلیم حاصل کی، تاریخ اور جغرافیہ کی طرف توجہ دی اور ان دونوں میدانوں میں کمال حاصل کیا۔ شریف ادریسی نے ابتدائے عمر ہی میں اپنے فطری شوق کو پورا کرنے کے لئے سیاحت شروع کی، اسپین اور مراکش تو ان کا وطن ہی تھا، لیکن مستشرق کراچیکووسکی نے لکھا ہے کہ ان کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پرتگال کے دارالحکومت لزبن، فرانس کے سواحل بلکہ انگلینڈ کی بھی سیر کی، سولہ سال کی عمر میں وہ ایشیائے کوچک کی بھی سیاحت کر چکے تھے۔

بحر متوسط میں ایک جزیرہ صقلیہ (Sicily) کے نام سے ہے، جس پر مسلمانوں نے تقریباً ڈھائی سو سال حکومت کی تھی، پھر وہ جزیرہ

مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اور راجر اول نورمنڈی نے یہاں کی حکومت سنبھالی، اس کی وفات کے بعد راجر دوم تخت پر بیٹھا، راجر دوم ایک علم دوست اور علماء پرور بادشاہ تھا، وہ خود بھی علم جغرافیہ کی وسیع معلومات رکھتا تھا۔ اس کے دربار میں بہت سے مسلم اور غیر مسلم سائنس داں جمع تھے، جن میں ادریسی کے چچازاد آل حمود بھی موجود تھے، راجر دوم نے جب جغرافیہ کے میدان میں ادریسی کی شہرت سنی تو ان کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی، اور ادریسی نے یہ دعوت قبول کی۔

1134ء میں شریف ادریسی نے سمندر پار کیا اور صقلیہ کے صدر مقام پالیرمو (Palermo) پہونچا، جو علم وتحقیق کا مرکز بن چکا تھا، یہاں بادشاہ نے اس کا بے حد اعزاز واکرام کیا، بادشاہوں کی طرح اس سے برتاو کیا، اور ان سے ایک ایسی کتاب لکھنے کی فرمائش کی جو اس کی مملکت اور تمام معلوم شدہ ملکوں کے تفصیلی حالات پر مبنی ہو، ساتھ ہی ان سے کہا کہ وہ ایک ایسا نقشہ تیار کریں جن میں ان ممالک کے تصاویر ہوں، ادریسی نے راجر کے دربار میں موجود علماء کو اطراف عالم میں روانہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ ہر اقلیم کا نقشہ وہاں کی ہر چھوٹی بڑی معلومات نوٹ کریں، ادریسی نے ان لوگوں کی مدد سے اپنی کتاب ''نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق'' مکمل کی، جو اس دور کے علم جغرافیہ کی جامع ترین کتابوں میں سے ہے، اس کتاب کی تدوین میں پندرہ سال صرف ہوئے، اس کتاب کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں عالم اسلام کے علاوہ مغربی دنیا کے جغرافیہ پر بھی برابر توجہ دی گئی ہے، جب کہ اس سے پہلے کے جغرافیہ داں صرف عالم اسلام کے جغرافیہ کو بیان کرتے تھے، کراچیکووسکی نے لکھا ہے کہ کسی اور کتاب میں مغربی دنیا کے تعلق سے اتنی اہم اور وافر مقدار میں معلومات محفوظ نہیں ہیں، جتنی ادریسی کی کتاب میں ہیں، ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے کہ یوروپ کے علمی حلقوں میں جغرافیہ کے عربی لٹریچر میں صرف یہی کتاب متداول تھی''۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ صقلیہ کی عیسائی حکومت میں رہنے کی وجہ سے ادریسی کو غیر اسلامی ممالک کے متعلق دیگر علماء کے مقابلے میں زیادہ معلومات حاصل ہوسکیں۔ نزہۃ المشتاق وہ پہلی کتاب ہے جس میں فلکیاتی جغرافیہ اور وصفی یا بیانی جغرافیہ کو جمع کرنے کی کافی حد تک کامیاب کوشش کی گئی ہے، اور اس میں مشرقی فلسفہ کے ساتھ مغربی فلسفہ کا منہج بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ادریسی نے یہ کتاب راجر دوم کی فرمائش پر تحریر کی تھی، اس لئے اس کو ''کتاب راجر'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، یہ کتاب سب سے پہلے عربی زبان میں روم کے ایک مطبعہ سے 1592ء میں چھپی، جو عربی کی مطبوعہ قدیم ترین کتابوں میں بھی شمار ہوتی ہے، پھر اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں 1619ء میں پیرس سے چھپا۔ اس کتاب میں ادریسی نے اپنے پیش رو جغرافیہ دانوں کی طرح تمام عالم کو طول میں سات اقالیم میں تقسیم کیا ہے، ادریسی کی جدت یہ ہے کہ انہوں نے ہر اقلیم کو اس کے مشرق سے مغرب تک دس حصوں میں تقسیم کرکے اس کی تفصیلات بیان کی ہیں، اور ہر حصہ کا الگ نقشہ بنایا ہے، اس طرح ستر نقشے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم حصہ شمالی افریقہ، اندلس، صقلیہ، اٹلی اور مغربی یوروپ کا ہے، کیوں کہ یہ براہ راست مصنف کے مشاہدہ پر مبنی ہے، اور انہوں نے بڑی مہارت سے اس کی تفصیلات درج کی ہیں، ادریسی کی معلومات شمالی بالٹک کے علاقہ تک جاپہونچی ہیں، جرمنی، پولینڈ اور روس کے بارے میں ان کی تفصیلات دقیق تو نہیں، مگر اہم ضرور ہیں۔ ادریسی نے رومانیہ کے علاقہ کی تجارت کے اہم مراکز اور راستے بھی ذکر کئے ہیں جو ان کو عرب، یہودی، یونانی اور فرانسیسی تاجروں سے حاصل ہوئے، اسی طرح بیزنطینی سلطنت اور بلغاریا کی اقتصادی حالت پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ ادریسی کے ستر نقشوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، ان کو ملا کر جرمن مستشرق میلر (Konard Miller) نے 1931ء میں اپنا مشہور دنیا کا نقشہ تیار کیا تھا، اور اسی کو سامنے رکھتے ہوئے المجمع العلمی العراقی 1951 نے ایک اور دو میٹر لمبا ایک میٹر چوڑا نقشہ تیار کیا، جس کی نقلیں تمام دنیا میں پائی جاتی ہیں۔

ادریسی نے راجر دوم کے لئے کرہ سماوی کا بھی ایک ڈیزائن تیار کیا تھا، جس کے لئے چاندی کو پگھلا کر چھوٹے چھوٹے گیند نما کرے بنائے تھے، اور ان کو آپس میں مربوط کر کے اجرام سماوی کو دکھایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ادریسی نے راجر دوم کے لئے چاندی کے دو نقشے تیار کئے، جن میں ایک بہت بڑی میز پر مستطیل تھا، اور دوسرا گول، دونوں نقشوں پر اس نے اقالیم ممالک، شہروں، راستوں، نہروں، صحراؤں، کھیتوں اور پہاڑوں، یہاں تک کہ اجناس، پیداوار اور صنعتوں کو بھی کندہ کرایا تھا، ادریسی نے اپنی کتاب نزہۃ المشتاق کے مقدمہ میں ان دونوں نقشوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

راجر دوم کی وفات کے بعد اس کے جانشین ولیم اول کے لئے ادریسی نے ایک اور کتاب تصنیف کی جس کا نام ''روض الانس ونزہۃ النفس'' ہے، جس کو المسالک والممالک بھی کہا جاتا ہے، یہ کتاب بھی فن جغرافیہ پر ہے۔ اور بعد کے مصنفین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

علم جغرافیہ میں کمال حاصل کرنے کے علاوہ ادریسی کی شخصیت اس دور کے علماء کی طرح موسوعی ہے، ان کی ایک اور کتاب علم نباتات پر ہے، جس کا نام الجامع لصفات اشتات النبات ہے، ایک اور کتاب الادویہ المفردہ کے نام سے پائی جاتی ہے، یہ دونوں کتابیں اپنے موضوع پر بڑی اہمیت کی حامل ہیں، اور شریف ادریسی کی ہمہ جہتی علمی شخصیت کو نمایاں کرتی ہیں، لیکن علم جغرافیہ میں ان کی شہرت نے دیگر پہلوؤں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

اخیر عمر میں شریف ادریسی اپنے وطن سبتہ لوٹ گئے، اور وہیں 560ھ/1166ء میں ان کا انتقال ہوا۔

معلومات کی جانچ

1. ابن خرداذبہ کی المسالک والممالک پر ایک نوٹ تحریر کیجئے۔
2. البیرونی کی جغرافیہ کے موضوع پر تصنیفات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں تحریر کیجئے۔
3. علم جغرافیہ میں ادریسی کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

7.5 خلاصہ

اس اکائی کے مطالعہ سے ہم نے جانا کہ:

☆ علم تاریخ میں ابن جریر طبری کی کتاب تاریخ الرسل والملوک کی اہمیت مسلم ہے، جس میں انہوں نے ابتدائے آفرینش سے اپنے عہد تک کے حالات مدون کئے ہیں، تمام واقعات وحالات کو سند کے ساتھ بیان کیا ہے، ہر بات کو امانت داری اور سچائی سے نقل کیا ہے۔ ان کی کتاب دنیا کی تاریخ کا خصوصاً اسلام کی ابتدائی تاریخ کا اہم ترین مرجع ہے۔

☆ مسعودی قرون وسطی کے مشہور مؤرخ ہیں، ان کی کتاب مروج الذہب ومعادن الجوہر میں کئی اقوام کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اور اس کا مواد اس دور کی متعدد کتابوں سے جمع کیا ہے، جن میں سے اکثر ناپید ہوگئیں۔ ان کی دوسری اہم کتاب التنبیہ والاشراف ہے، اس کتاب میں بھی تاریخ پر بہت عمدہ مواد ملتا ہے۔

☆ ابن خلکان کی شہرت ان کی مشہور تاریخ وفیات الاعیان کی وجہ سے ہے، جو تاریخ اسلام کی مشہور شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا ہے، کتب تراجم میں یہ مشہور کتاب ہے، پختگی معلومات کے لحاظ سے سب سے عمدہ ہے۔

☆ امام ذہبی کو مؤرخ اسلام کہا جاتا ہے، تاریخ کے موضوع پر ان کی کتابوں کی تعداد پچاس سے زائد ہے، جن میں سب سے مشہور تاریخ اسلام ہے، جس میں ابتدائے اسلام سے ساتویں صدی تک کے حالات کو سنہ وار ترتیب سے لکھا گیا ہے، دوسری اہم کتاب سیر اعلام النبلاء ہے، جس میں ابتدائے اسلام سے اپنے زمانہ تک کی تمام نمایاں شخصیات کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں، اور ہر طبقہ کے افراد کو شامل کیا ہے، یہ کتاب زمانی اعتبار سے طبقات پر مشتمل ہے۔

☆ ابن خلدون کی شہرت ان کی تاریخ سے زیادہ مقدمہ تاریخ سے ہے، جس میں انہوں نے سب سے پہلے فلسفہ تاریخ پر گفتگو کی ہے، قوموں کے عروج وزوال کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے اس کے لئے انسانی زندگی سے تشبیہ بیان کی ہے، جو پیدائش، بلوغ اور پختگی کے بعد خاتمہ سے دوچار ہوتی ہے۔

☆ ابن خُرداذبہ کو مسلمانوں میں جغرافیہ کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے، ان کی کتاب کا نام المسالک والمما لک ہے، جس میں انہوں نے زمین کا وصف اور مختلف مما لک کے جغرافیائی حالات بیان کئے ہیں۔مختلف مما لک کو ملانے والے راستوں اور ان کے درمیان مسافتوں سے بھی بحث کی ہے۔

☆ اصطخری مشہور سیاح اور جغرافیہ داں گذرے ہیں، جن کی شہرت ان کی دو کتابوں مسا لک الممالک اور صور الاقالیم کی وجہ سے ہے، صور الاقالیم میں ہر ملک کی معلومات، اس کی سرحدوں، شہروں، مسافتوں، حمل ونقل کے ذرائع اور راستوں کے متعلق تفصیلات دی ہیں۔اس کتاب میں انہوں نے ہر اقلیم کے نقشے بھی بنائے، جس میں اس کی جغرافیائی اور طبعی ساخت کو نمایاں کیا، اخیر میں پوری دنیا کا ایک نقشہ بھی دیا ہے۔

☆ مقدسی عالم اسلام کے عظیم سیاح اور جغرافیہ داں ہیں، ان کی کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم قرون وسطی میں تحریر کی گئی جغرافیہ کی اہم ترین کتاب ہے، جس میں خصوصاً عالم اسلام کا جغرافیہ پیش کیا ہے، وہ ہر اقلیم کی شناخت اور اس کے خدوخال نمایاں کرتے ہیں، پھر اس اقلیم کی طبیعی جغرافیہ کو لیتے ہیں، اس کے بعد ماحول اور موسمی حالات کو بیان کرتے ہیں، طبیعی جغرافیہ کے ساتھ انسانی جغرافیہ پر بھی تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔وہ نقشہ نویس بھی ہیں، اور اپنی کتاب میں کئی نقشے بنائے ہیں۔

☆ علم جغرافیہ میں بیرونی کا پایہ بہت بلند ہے، اس سلسلہ میں ان کی اہم کتاب القانون المسعودی ہے، جس میں کرہ ارض کے آباد منطقوں کے حالات درج کئے ہیں بلکوں کے طول البلد اور عرض البلد جاننے کے لئے نقشے بنائے ہیں، انہوں نے زمین کی کروی شکل کو سطح ورق پر نقل کرنے کے طریقے ذکر کئے ہیں۔کتاب الہند میں انہوں نے عہد وسطی کے ہندوستان کا جغرافیہ، تاریخ، علوم اور مذاہب بیان کئے ہیں، ہندوستان کے طبیعی جغرافیہ اور طبیعی خصوصیات پر توجہ مرکوز کی ہے۔البیرونی کو ریاضیاتی جغرافیہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

☆ ادریسی نے علم جغرافیہ میں کمال حاصل کیا، سسلی کے بادشاہ راجر دوم کے لئے اپنی عظیم کتاب ''نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق''

تصنیف کی، جو اس دور کے علم جغرافیہ کی جامع ترین کتابوں میں سے ہے، اس میں مغربی دنیا پر بھی توجہ دی گئی، اس کتاب میں فلکیاتی جغرافیہ اور وصفی جغرافیہ کو جمع کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، انہوں نے اپنی کتاب میں ستر نقشے بھی بنائے ہیں۔

7.6 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجئے۔

1۔ مقدمہ ابن خلدون کا جائزہ لیجئے۔

2۔ مقدسی کے کارناموں پر مختصر اتبصرہ کیجئے۔

3۔ بیرونی کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1۔ ابن خلکان اور ادریسی کے کارناموں کو بیان کیجئے۔

2۔ تاریخ وسیرت کے میدانوں میں طبری اور ذہبی کی حصہ داری کا جائزہ لیجئے۔

3۔ علم جغرافیہ کی ترقی میں مسلمانوں کی خدمات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے دو مسلمان جغرافیہ دانوں کی کتابوں پر تبصرہ کیجئے۔

7.7 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

قرون وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے	ڈاکٹر غلام قادر لون	مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، 2014ء
ابن خلدون	ڈاکٹر طہ حسین، ترجمہ: عبدالسلام ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2013ء
نشأة علم التاریخ عند المسلمین	ڈاکٹر عبدالعزیز دوری	مرکز زائد للتراث 2000ء
مقدمہ سیر اعلام النبلاء	ڈاکٹر بشار عواد معروف	مؤسسة الرسالہ، بیروت 1985ء
الوافی بالوفیات	صلاح الدین صفدی	داراحیاء التراث، بیروت 2000ء
مقدمہ التنبیہ والاشراف	عبداللہ اسماعیل الصاوی	مکتبہ الشرق الاسلامیہ، 1934ء
مقدمہ مروج الذہب	کمال حسن مرعی	المکتبہ العصریہ، بیروت، 2005ء
تاریخ الادب الجغرافی العربی	یولیانووچ کراچکووسکی، ترجمہ: صلاح الدین عثمان ہاشم	ادارة الثقافہ، جامعہ الدول العربیہ، 1963ء،
اسہام المسلمین غیر المعروف فی تاریخ الجغرافیہ	فؤاد سزکین	محاضرة الاسلام

اعلام الجغرافیین العرب	ڈاکٹر عبدالرحمٰن حمیدہ	دارالفکر دمشق، 1995ء
الجغرافیا عندالمسلمین	جمال آفندی	دارالکتاب اللبنانی، بیروت، 1982ء
روادعلم الجغرافیا فی الحضارۃ العربیہ الاسلامیہ	ڈاکٹر علی بن عبداللہ الدفاع	مکتبہ التوبہ، ریاض، 1993ء

اکائی 8: فنون لطیفہ اور تعمیرات

اکائی کے اجزاء

8.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو فنون لطیفہ اور فن تعمیر میں مسلمانوں کی خدمات سے واقف کرانا ہے، اس اکائی کو پڑھ کر وہ جان سکیں گے کہ مسلم ماہرین نے فنون لطیفہ اور فن تعمیر میں کیا کیا نیرنگیاں دکھائیں، اور اپنے ذوق جمال ولطافت حس کا استعمال کرتے ہوئے موسیقی، نقاشی، خطاطی، مصوری اور تعمیرات میں کیسی جدت واختراع، اور کیا کیا گل کاریاں پیدا کیں، نیز اس اکائی میں ہم دیکھیں گے کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ان فنون کے ارتقا اور ان میں جدت طرازی کے لئے نئے طریقے دریافت کئے کہ آج تک ان کے ذوق لطیف اور فن تعمیر کی داد دی جاتی ہے، اور ان کی بنائے ہوئے آلات ومحلات، موسیقی وساز دیکھنے والے کو حیران اور سننے والے کو مسحور کر دیتے ہیں۔

8.2 تمہید

فن یا فنون ان مہارتوں کا نام ہے جو انسان تخلیق کرتا ہے، اور ان کے سہارے جدت، لطافت، انسانی صلاحیتوں اور قوتوں کی ترقی کی

طرف گامزن ہوتا ہے، جب انسان کے احساسات وشعور تک کائنات کی خوبصورتی ونزاکت کی رسائی ہوتی ہے تو زندگی مزید حسین وجمیل ہو جاتی ہے۔فن چاہے کوئی بھی ہو، اپنا فرض اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ با مقصد نہ ہو، اور اپنے اندر اخلاقی اقدار کو سموئے ہوئے نہ ہو۔ ابن سینا کا قول ہے: ہر شئے کی خوبصورتی اور رونق اس وقت ہوتی ہے، جب وہ صحیح مقام پر ہو۔ ایک ناقد کا قول ہے: جمال اور اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فن اور صلاحیت کا جمالیات سے تعلق اخلاق واقدار کی رعایت کے ساتھ ہے۔ لہذا جب جمالیات واخلاقیات میں وحدت ہوگی، تو تربیت کی بنیاد اور فکر کی تبدیلی کی اساس بنے گی۔ فنون لطیفہ کی تاریخ انسان کی تاریخ ہی کی طرح قدیم ہے، اور زندگی جمالیات کے ذوق کے بغیر ادھوری ہے، زندگی میں فنون لطیفہ کا کردار اس لئے بھی اہم ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کو حسن کے ساتھ ساتھ تازگی عطا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ ہر تہذیب کی طرح مسلم تاریخ ومعاشرہ میں بھی رواں دواں اور فعالیت کا عنصر لئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

8.3 اسلام اور فنون لطیفہ

فنون لطیفہ میں سنگ تراشی وفن تعمیر، نقاشی وگلکاری، پینٹنگ، موسیقی، رقص اور ادب وشعر کا شمار ہوتا ہے، ان میں سے بعض فنون کے تعلق سے اسلامی احکام احتیاط پر مبنی ہیں، اور ان کے لئے فقہاء نے حد بندیاں مقرر کی ہیں، مسلمان جب جزیرۃ العرب سے نکلے تو فتوحات کے نتیجہ میں انہیں مختلف ممالک اور اقوام کے ساتھ روابط استوار کرنے کا موقع ملا، انہوں نے ان اقوام پر اپنا اثر ڈالا، اور خود بھی ان سے متأثر ہوئے، اس لئے یونانی، ایرانی، مصری، ہندوستانی اور رومی ثقافت کے اثرات اسلامی تہذیب پر نمایاں ہیں، مسلمانوں نے ان اقوام میں مروجہ فنون کو اسلامی دائرہ میں رہتے ہوئے اپنایا، ان سے مخالف اسلام اجزا کو الگ کیا، اور موافق اجزا کو اسلامی رنگ میں رنگ کر ان میں جدت پیدا کی، بہت سی شاخیں پیدا کیں، اور ایسی مہارت بہم پہونچائی کہ ان کو اپنے فنون کی حیثیت سے پیش کیا، اور ان کے اصول وقواعد مقرر کئے۔ اسلام نے فنون لطیفہ کے تئیں توحید کے رجحان کو سامنے رکھا، ایمانیات میں توحید کو پہلا مقام عطا کیا، اس میلان کا تمام فنون پر اثر پڑنا لازمی تھا، جس کے نتیجہ میں سنگ تراشی اور مصوری سے ہر اس شئے کو دور کر دیا گیا، جو انسان یا جاندار کی تصویر کشی ومجسمہ سازی سے تعلق رکھتی ہو۔ اور ان دونوں فنون کا رخ موڑ دیا۔ بقول واضح رشید ندوی مسلمان فنکاروں نے ایسے ایسا دلپذیر ودلکش فن تعمیر ایجاد کیا، جس میں درختوں، پھولوں، پتیوں، بیلوں کی تزئین کاری، محرابوں، گنبدوں اور تکونی چھتوں کے سبب بے مثال حسن پیدا ہوتا ہے، انہوں نے مختلف رنگوں کی آمیزش سے جدت بھرا ایسا نظام مرتب کیا جو نہ صرف خوش منظر ودلکش ہو، بلکہ اس میں آنکھوں کی بھی تسکین کا سامان ہو۔ ادب وشعر اور موسیقی کے حوالہ سے مسلمانوں میں جسم سے زیادہ روح کی پرورش، اور لذت قلب ودماغ کی فراہمی کا رجحان رہا، بادشاہ، صوفیاء، عوام الناس اور خوش آوازی کے شیدائیوں کے لئے یہاں غذائے روح اور دوائے دل کا سامان مہیا ہوتا تھا، چاہے وہ کلام الٰہی کی تلاوت ہو، یا وجد میں لانے والے اشعار، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم دور میں فنون لطیفہ پر اسلامی چھاپ نمایاں رہی ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ اگر عملی اور تطبیقی لحاظ سے نظر دوڑائی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ فقہاء کی تحدیدات سے قطع نظر فنون لطیفہ کے ساتھ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں نے ان تمام فنون سے کمال درجہ اعتنا کیا ہے، اور ان میں سے ہر میدان میں فنی اور تکنیکی اعتبار سے اعلی صلاحیت وقابلیت کا مظاہرہ کیا، اور ایسے نقوش چھوڑے ہیں، جو ان کی مہارت وپختگی کی گواہی دیتے ہیں۔

8.4 نقاشی

8.4.1 مسلمان اور نقاشی

مسلم فنکاروں نے سنگ تراشی اور نقش نگاری کی طرف بھرپور توجہ کی، اور دینی پابندیوں کے ملحوظ رکھتے ہوئے جانداروں کی تصویر بنانے کے بجائے فطرت کی ترجمانی میں احساس وشعور اور ذوق لطافت کا استعمال کرتے ہوئے اپنی عبقریت، تخلیقی صلاحیت، خیال آرائی اور معنی آفرینی کا اظہار کیا، اس کے نتیجہ میں نقش نگاری اور کتابت کا وجود ہوا۔ فنون لطیفہ کا مقصد حسن و جمال کو وجود بخشنا ہے، اور نقش نگاری اس کے اہم ذرائع میں سے ہے، اسلامی فنون میں اس کو پہلا مقام حاصل ہے، اور وہ مسلم قوم کی پہچان بن چکا ہے، یہاں تک کہا گیا کہ اسلامی فن کاری تو نقش نگاری میں پوشیدہ ہے۔ کیوں کہ ہاتھ کی انگوٹھی سے لیکر عظیم الشان عمارتوں تک کوئی بھی اسلامی شئے نقش ونگار سے خالی کم ہی ہوتی ہے۔

8.4.2 نباتی نقش نگاری اور ہندسی نقش نگاری

مسلم نقاشوں نے نقش نگاری میں دو قسموں کا استعمال کیا، ایک نباتی نقش نگاری، دوسرے ہندسی نقش نگاری، کہیں پر دونوں کو ایک ساتھ برتا، اور کہیں الگ الگ، نباتی نقش نگاری سے مراد پتیوں اور پھولوں کی شکلوں کا استعمال ہے، اس کو فن توریق بھی کہا جاتا ہے، جو انفرادی، ثنائی اور تقابلی اسالیب میں ظاہر ہوتا ہے، عام طور پر ایک مقام پر فنی قطعہ میں کئی نباتی عناصر تداخل اور تقابل کے ساتھ مکرر اور منظم طریقہ سے نظر آتے ہیں۔ نباتی نقش نگاری کا اظہار دیوار، گنبد، محراب، منبر، مختلف معدنی، شیشہ اور مٹی کے برتنوں، اور کتاب کے صفحات کی تزیین میں ہوتا ہے۔ نقش نگاری عموما دو رخی ہوتی ہے، جیسا کہ دیوار، دروازہ، چھت، قالین اور کتابوں میں نظر آتی ہے، اور کبھی سہ رخی ہوتی ہے، جیسے ستونوں، گنبد، اونچے دروازوں کی اوپری سطح پر ہوتی ہے۔

ہندسی نقش نگاری سے مراد جیومٹری کی اشکال اور خطوط کے ذریعہ نقش نگاری کرنا، جس کے نتیجہ میں ضلعی اشکال، متداخل دائرے، ستارے کی شکلیں نقش نگاری میں ظاہر ہوئیں، ان اشکال سے عمارتوں کے علاوہ لکڑی سے بنے ہوئے تختوں، تانبہ کے برتنوں، دروازوں اور چھتوں کو مزین کیا جاتا ہے، اور خالی جگہوں کو بھرا جاتا ہے، ہندسی نقش نگاری اسلامی فن میں خصوصی اہمیت کی حاصل ہے، کیوں کہ وہ نقش نگاری کے ساتھ مسلم فنکار کی جیومٹری میں مہارت کو بھی ظاہر کرتا ہے، نقاشوں نے متنوع اشکال کو استعمال کیا، جو گول، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن اور معشر یعنی دس پہلوؤں کی حامل ہوتی تھیں، ان شکلوں کو ایک دوسرے میں داخل کرکے بعض کو خالی چھوڑ دیا جاتا، اور بعض کو بھر دیا جاتا، اور دیکھنے والا جز سے کل کی طرف اور دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی شکلوں پر غور کرتا رہ جاتا۔

نقش نگاری ایک اسلامی فن ہے، جو اگرچہ ماقبل اسلام بھی پایا جاتا تھا، لیکن مسلم دور میں فنکاروں نے اس میں ایسی گل کاریاں کیں کہ تمام ماہرین اس کو عربی یا اسلامی فن مانتے ہیں، اس فن کی خصوصیت حرکیت اور امتداد ہے، دیکھنے والا وقفہ سے حرکت کی طرف اور حرکت سے وقفہ کی طرف اپنی نظر دوڑاتا رہتا ہے۔ اسی طرح ان میں لامتناہی امتداد ہے، جو کسی حدود پر توقف نہیں کرتا۔ نقش نگاری کے ذریعہ سطحوں کی خالی جگہ کو پر کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

8.5 خطاطی

8.5.1 مسلمان اور خطاطی

کلمہ اور کلام عربی زبان میں ہمیشہ فنکاری کا موضوع رہے ہیں، اور تقریر و تحریر دونوں میں ان کے حسن و جمال کی طرف توجہ کی گئی ہے، الفاظ پر توجہ کے نتیجہ میں شعر و خطابت، نظم و نثر، ادب اور فصاحت و بلاغت کے فنون وجود میں آئے، کتابت کے ذریعہ خطوط کی داغ بیل پڑی، فن کی حیثیت سے خطاطی کا آغاز قرآن پاک کی کتابت کے نتیجہ میں ہوا، یہ حقیقت ہے کہ کلام کا مشاہداتی جمال قرآن کریم سے پہلے کسی بھی قوم میں وجود میں نہیں ہوا۔ اور متمدن اقوام میں سے کسی نے کتابت اور خط کی تزئین پر اتنی توجہ نہیں دی، جتنی مسلمانوں نے دی، جس کی دلیل خطوط کا تنوع ہے، جن میں خط کوفی، خط نسخ، خط ثلث، خط مغربی، خط رقعہ، خط دیوانی، خط تعلیق یا خط فارسی، خط اجازہ، خط طغری وغیرہ شامل ہیں، پھر ان خطوط سے دیگر فرعی خطوط پیدا ہوئے، مثلاً خط کوفی سے کوفی مورق، کوفی مزہر، کوفی مخصر، کوفی معشق، خط دیوانی سے دیوانی جلی، خط ثلث سے ثلث جلی، خط فارسی سے فارسی مختزل فارسی شکستہ وغیرہ۔

خطاطوں نے اپنی صلاحیتوں کے مظاہرے کے لئے ایک تختہ میں ایک سے زائد خطوط کو استعمال کیا، باریکیاں اور نزاکتیں پیدا کیں، فن میں مزید نکھار آیا، اور فن خطاطی تحسین و کمال، تخلیق و ارتقا کے منازل طئے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا، اگلے مرحلہ میں مسلم فنکار نے خطاطی میں نقش نگاری کو شامل کرتے ہوئے منقش خطاطی کی طرف قدم بڑھائے، ایسے فن پارے تحریر کئے جو گلکاری، نقاشی اور خطاطی کا امتزاج تھے، جو نگاہوں کو لذت بخشتے تھے۔ کبھی کبھی یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا کہ یہ فن پارہ خطاطی کے زمرہ میں داخل ہونے کے لائق ہے یا نقاشی کی صف میں شامل ہوتا ہے۔ اس منزل کو بھی قطع کرتے ہوئے فنکاروں نے حرف کو تصویر کی شکل عطا کی، اور اس انداز سے خطاطی کی کہ پہلی نظر میں فن پارہ میں کسی پرندہ، پھل، درخت، قندیل، کشتی وغیرہ کی شکل نظر آتی، غور کرنے سے معلوم ہوتا کہ یہ قرآن کی کوئی آیت، حدیث کا کوئی ٹکڑا یا اقوال زریں میں سے کوئی قول ہے۔ یہ فنکار کے قلم کا کمال تھا کہ اس نے خطوط کو تصویر کی شکل عطا کی۔

مشہور خطاطین

8.5.2 ابن مقلہ

ابوعلی محمد بن علی، ابن مقلہ، بغداد میں 272ھ/866ء میں پیدا ہوئے، کبار علما سے ادب اور لغت کا درس لیا، ابن درید اور ثعلب جیسے علمائے لغت و ادب کی شاگردی اختیار کی، ابتدائی زندگی فقر و فاقہ میں گذاری، بلند حوصلہ اور عالی ہمت تھے، پہلے خراج کی وصولی پر مقرر ہوئے، پھر ترقی کرتے کرتے عباسی خلافت میں وزیر اعظم کے عہدہ تک پہونچے، اور تین خلفاء مقتدر باللہ، قاہر باللہ اور راضی باللہ کے وزیر رہے، مال و دولت میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ رہا، مزاج میں سختی تھی، سیاسی زندگی ان کو راس نہ آئی، دو مرتبہ جلاوطن ہوئے، اور مال و جائداد سے محروم ہونا پڑا۔ بالآخر سیاسی ہتھکنڈوں کی بھینٹ چڑھے، اور قید میں انتقال ہوا۔

مؤرخین اور محققین کا اتفاق ہے کہ ابن مقلہ کے خط کی خوبصورتی نہ ان کے معاصرین میں ہے نہ ان سے پہلے کسی میں تھی اور نہ ان کے

بعد، انہوں نے قرآن مجید بھی تحریر کیا تھا، جس کے خط کی مثال نہ تھی، وفیات الاعیان میں ہے: ابوعلی ابن مقلہ نے خطاطی کا طریقہ کوفیوں سے نقل کیا، اور خوبصورت شکل میں اس کو ظاہر کیا، اس میدان میں سبقت کا شرف ان کو حاصل ہے، اور ان کا خط نہایت خوبصورت ہے۔ ابن مقلہ نے رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی صلح کی ایک تحریر اپنے ہاتھ سے لکھی تھی، جس کو رومیوں نے قسطنطنیہ کے گرجا گھر میں رکھا تھا، اور اس کے حسن و جمال اور باریکی کی وجہ سے اس کو عبادت خانوں میں لٹکاتے، اور عید کے موقع پر اس کی زیارت کرتے تھے۔ ان کو اپنے فن سے اور قلم ودوات سے محبت تھی، علماء اور مؤرخین نے ایک ماہر خطاط ہونے کی حیثیت سے ان کی تعریف کی ہے، ثعالبی کہتے ہیں: حسن و جمال میں ابن مقلہ کا خط ضرب المثل ہے، کیوں کہ وہ دنیا کا سب سے حسین خط ہے، جو جادو کے مثل ہے، آنکھوں نے کبھی ان کے خط کی طرح کوئی نمونہ نہیں دیکھا۔ یاقوت حموی لکھتے ہیں: خطاطی میں وہ مشہور تھے، بلکہ ان کی مثال دی جاتی تھی، رقعات اور توقیعات لکھنے میں دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ابوحیان کہتے ہیں: ابن مقلہ کے ہاتھ میں خطاطی کا ایسے الہام ہوا ہے جیسے شہد کی مکھی کو چھتہ بنانے کا فن۔ روایت ہے کہ سیاسی وجوہات کی بنیاد پر ان کو ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوئی، اور سیدھا ہاتھ کاٹا گیا تو وہ اپنے بازو میں قلم پکڑ کر تحریر لکھتے تھے، جو ہاتھ سے لکھنے کی طرح خوبصورت ہوتی تھی۔ ابن مقلہ نے رسالہ فی علم الخط والقلم کے نام سے ایک کتابچہ تحریر کیا تھا، جو موجود ہے۔

ابن مقلہ کی وفات حالت قید میں 328/940 میں بغداد میں ہوئی۔

8.5.3 ابن البواب

ابوالحسن علی بن ہلال، ان کے والد دربان تھے، اسی وجہ سے ابن البواب کے نام سے مشہور ہوئے، ابتدا میں وہ گھروں پر نقش ونگار کرتے تھے، پھر کتابوں کو مطلا کرتے، اور ان تصویریں بناتے تھے، پھر کتابت سیکھی، ان کے استاذ محمد بن اسد مشہور کاتب تھے، صلاح الدین صفدی کے مطابق نقش نگاری اور تصویر کشی نے ان کو خطاطی میں نئے نئے طریقے ایجاد کرنے میں مدد دی، معاصر ومتاخر خطاطوں کے مقابلہ ان کے اندر چند اوصاف تھے، اولا انہوں نے مصوری سے کتابت میں مدد لی، ثانیا مصوری میں کمال کی وجہ سے ان کے لئے خیال کو کاغذ پر مرتسم کرنا آسان تھا، جو دیگر خطاطوں کے لئے آسان نہیں ہوتا، سوم یہ کہ انہوں نے کتابت کی نئی شکلوں کو وجود بخشا۔ چہارم یہ کہ انہوں نے اپنی جانفشانی سے فن میں مزید نکھار پیدا کیا، ان کے خط کی شہرت کی وجہ سے کئی لوگوں کے خطاطی کے جعلی نمونے ان کی طرف منسوب کرنے چاہے، لیکن کامیابی نہ مل سکی۔

ابن خلکان لکھتے ہیں: متقدمین اور متاخرین میں سے کوئی خطاطی میں ان کے مماثل نہیں، بلکہ ان کے قریب بھی نہیں پہونچ سکا، ابوعلی ابن مقلہ کا خط بھی نہایت خوبصورت ہے، لیکن ابن بواب نے ابن مقلہ کے طریقہ کی تہذیب وتنقیح کی، اس کی رونق وجمال میں اضافہ کیا۔ ذہبی لکھتے ہیں: ابن بواب کی زندگی میں ان کی اتنی قدر نہ ہوئی جتنی موت کے بعد ہوئی، ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خریطہ جس میں انہوں نے امیر سے اپنے دوست کے لئے دو دینار کی سفارش کی تھی، اور ستر سطر میں سفارش تحریر کی تھی، ان کی موت کے بعد سترہ دینار میں فروخت ہوا۔ اس فن پارہ کی قیمت میں اضافہ ہی ہوتا رہا، اگلی بار وہ پچیس دینار میں فروخت ہوا۔

ذہبی مزید کہتے ہیں: خطاطی میں ابن بواب کا وہی مقام ہے جو قضا میں علی بن ابی طالب، حدیث میں ابن حنبل، لغت میں ابوعبید، اور تاریخ میں واقدی کا ہے۔ صلاح الدین صفدی کہتے ہیں: منقول ہے کہ وہ حرف لکھ کر صدقہ دیتے تھے، اگر کوئی فقیر ان کے پاس آتا تو اس کو ایک

حرف لکھ کر دیتے، وہ بازار میں جا کر اس کو فروخت کرتا اور جتنی قیمت چاہتا وصول کرتا۔ انہوں نے خط ریحانی اور خط محقق ایجاد کیا، اور خطاطی میں ایک مدرسہ قائم کیا، جو یاقوت کے زمانہ تک باقی رہا۔ ابن البواب نے قرآن مجید کی کتابت میں دلچسپی لی، مصاحف کی تزئین ونقش نگاری میں شہرت حاصل کی، 64 مرتبہ قرآن مجید کی کتابت کی، جن میں ایک کی کتابت خط ریحانی سے کی، جو آج بھی قسطنطیہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ ماقبل اسلام کے عربی شاعر سلامہ بن جندل کا دیوان بھی اب کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکتبہ آیا صوفیا میں محفوظ ہے۔ ابن البواب خطاطی کے ساتھ شاعری اور تعبیر رؤیا میں بھی کمال رکھتے تھے، اپنے اشعار کی بھی کتابت کرتے تھے، معاصرین نے ان کی تواضع، دین داری اور امانت داری کی شہادت دی ہے، مسجد میں وعظ بھی کہتے تھے، منصب وسیاست سے دور رہتے، خوش خلقی، نرمی، تقوی و پرہیزگاری کو اختیار کرنے والے تھے۔

ابن البواب کی وفات 423ھ/1032 میں بغداد میں ہوئی، اور امام احمد کی قبر کے قریب مدفون ہوئے۔

8.5.4 یاقوت مستعصمی

ابو الدر یاقوت رومی غلام تھے، جن کو بچپن میں سلطنت عباسیہ کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ نے خریدا تھا، اسی نسبت سے مستعصمی کہلائے، قصر خلافت میں پرورش پائی، خلیفہ نے ان کو مدرسہ مستنصریہ کے استاذ صفی الدین عبد المؤمن کے سپرد کیا تھا، تاکہ اس کو خطاطی اور انشا پردازی کی تعلیم دیں، فقیہ صفی الدین کاتب اور ابن حبیب سے کتابت سیکھی، اور بچپن ہی میں خطاطی میں مہارت حاصل کی۔ یاقوت کی خواہش تھی کہ ان کو کتب خانہ کا ناظم بنادیا جائے۔ ان کی خواہش پوری ہوئی، کبار علما، مؤرخین، ادبا، مفسرین، اور تمام علوم کے ماہرین سے ملاقات کی، جس سے ان کا سر بلند ہوا، کتابت کے علاوہ مدرسہ مستنصریہ میں پڑھائے جانے والے تمام علوم میں مہارت حاصل کی، وہ کاتب کے ساتھ ادیب، شاعر اور حکیم بھی تھے، کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں "اخبار واشعار"، "اسرار الحکماء" اور "فقر النتقت وجمعت عن افلاطون" موجود ہیں، آخر الذکر کتاب میں افلاطون حکیم کے اقوال کو جمع کیا ہے۔

خطاطی سے محبت کی وجہ سے گذشتہ خطاطوں کی سیرت کا مطالعہ کیا، ان کی خطاطی کے طریقوں پر غور کیا، پھر اپنے فن میں اس قدر کمال پیدا کیا کہ خطاطی کے حسن وجمال میں تمام متقدمین اور متاخرین پر فوقیت لیگئے، دور دور تک ان کی شہرت ہوئی، یہاں تک کہ جب کسی خط کی خوبصورتی کی تعریف کرنی ہوتی تو کہتے یہ یاقوتی خط ہے۔ اور قبلۃ الکتاب یعنی کاتبوں اور خطاطوں کے قبلہ کا لقب ملا۔ اعیان سلطنت اور اہل علم نے ان سے کتابت سیکھی، اور ان کی شاگردی پر فخر کیا، خطاطی اور خط کی تجمیل وتزئین میں یاقوت نے لازوال شہرت حاصل کی، مؤرخین نے ان کی خطاطی کی تعریف ہے، اور فن کاروں نے ان کو تسلیم کیا ہے، بعد والوں کے لئے اسوہ قرار دیا ہے، یاقوت نے قرآن مجید لکھنے کی طرف توجہ کی اور اپنی مہارت سے 1001 قرآن مجید کی کتابت کی، جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ لوگوں نے ان کے مخطوطات کو تلاش کر کے محفوظ رکھنا شروع کیا، ان کی خطاطی کے نمونے قاہرہ، استنبول، پیرس میں موجود ہیں، جن میں قرآن کریم کے بھی دو نسخے ہیں۔

جب ہلاکو خاں نے 656ھ میں بغداد کو تاراج کیا تو وہ بغداد ہی میں تھے، مدرسہ مستنصریہ کا کتب خانہ دریا برد کر دیا گیا، لیکن یاقوت کسی طرح بچ گئے، اور ایک مدت تک حیات رہے، ان کے اکثر فن پارے اسی دور کے تحریر کردہ ہیں، جن میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف کے چھوٹے چھوٹے مجموعے، دیوان شعر اور رسائل ہیں۔ 698ھ/1299ء میں وفات پائی۔

8.6 مصوری

8.6.1 مسلمان اور مصوری

اسلام نے جاندار کی تصویر بنانے سے منع کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ بت پرستی اور شرک سے ان کو دور رکھا جائے، اس وجہ سے مسلمانوں نے ابتدا سے اس کی طرف توجہ نہیں دی، لیکن آگے چل کر ان میں دوسری اقوام سے اختلاط کے نتیجہ میں تصویر اور مجسمہ سازی پروان چڑھی، مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں دوسری قوموں کی بہت سی تمدنی چیزوں اور علوم وفنون کو حاصل کیا، اسی طرح انہوں نے مصوری اور نقش آرائی بھی سیکھی، اور بحیثیت فن کے وہ اس میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اسی طرح نومسلم اقوام مثلاً ایرانیوں اور رومیوں میں مصوری کا ذوق موروثی تھا، جو قبول اسلام کے بعد قائم رہا۔ لیکن مذہب کی طرف سے ممانعت کے نتیجہ میں مسلمان ماہرین میں ہم کو مصور بہت کم نظر آتے ہیں، اور دیگر فنون کے مقابلہ مصوری و مجسمہ سازی کی طرف ان کی توجہ محدود رہی ہے۔

اموی دور میں مصوری فطرت کے عناصر کی تصویر کشی تک محدود تھی، ان میں حیوانات کی تصویریں بہت کم ہیں، عباسی دور میں اس کا رواج زیادہ ہوا، معتصم کے بنائے ہوئے شہر سامرا کے محلات میں مشرقی طرز کی ابھری ہوئی اور گچ میں کھدی ہوئی انسانوں وغیرہ کی رنگین تصویریں ہیں، متوکل نے سامرہ کے اپنے محل میں کلیسا کی ایک مکمل تصویر بنوائی تھی، جس میں راہب بھی تھے۔ سامرہ کے کھنڈرات کی کھدائی کے دوران محلوں کے ملبوں میں دیواری تصاویر اور مجسموں کا ظہور ہوا، ان تصاویر میں چرند وپرند، حیوانات اور انسانوں کی تصاویر ہیں، ان مناظر میں جنگل میں انسان جانوروں کا شکار کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں، یا رقاصائیں مختلف طرز کی پوشاکیں پہنے خلیفہ کے روبرو دربار میں رقص کرتی دکھائی گئی ہیں۔ عباسی دور کی اکثر تصاویر ہندوستانی قصہ گوئی اور یونانی نباتات، حیوانات، طب اور طبیعیات کی کتابوں کے خیال پر بنائی گئی ہیں، سب سے قدیم مخطوطہ دیسقوریدس کی کتاب خواص العقاقیر کا باتصویر ترجمہ ہے، باتصویر کتابوں میں مشہور کتاب مقامات حریری بھی ہے، جس کو یحیی بن محمود واسطی نے تحریر کیا، اور تصاویر سے مزین کیا ہے، واسطی اس دور کا بہت مشہور مصور ہے۔ ان ہی کتابوں میں کلیلہ ودمنہ بھی ہے، جس کا تیرھویں صدی کا مصور مخطوطہ دستیاب ہے۔

اندلس کے قصور ومحلات میں بھی تصاویر بنانے کا رواج تھا، عبدالرحمٰن الناصر نے الزہراء شہر تعمیر کیا تھا، جس کے دروازہ پر اپنی محبوبہ زہراء کی تصویر نقش کروائی تھی۔ مصوری کی سب سے زیادہ ترقی تیموری دور میں ہوئی، تیمور لنگ عالم اسلام کے مختلف حصوں سے فنکاروں اور مصوروں کو سمرقند لایا، تیموری دور میں ہرات کو خصوصاً مصوری میں شہرت حاصل ہوئی، جہاں ایک وقت میں چالیس مصور موجود رہتے تھے، حسین مرزا اور اس کے وزیر دانش مند علی شیر نوائی نے ہرات کو ایرانی تصویر سازی کا مرکز بنا دیا، جس کا سب سے اہم مصور کمال الدین بہزاد ہے۔

8.6.2 کمال الدین بہزاد

بہزاد کی پیدائش افغانستان کے شہر ہرات میں پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوئی، پیر سید احمد تبریزی اور ممتاز مصور میرک سے مصوری کا علم حاصل کیا، حسین بائقرا اور علی شیر نوائی کے دربار میں تقرب نصیب ہوا، بہزاد نے ہرات کو اپنا مرکز بنایا، اور جب شاہ اسماعیل صفوی نے 916ھ/1510ء میں ہرات پر قبضہ کیا تو شاہ کے ساتھ تبریز منتقل ہوئے، یہاں ان کا ستارہ مزید چمکا، شاہ اسماعیل نے ان کو شاہی کتب خانہ

کا ناظم بنایا تھا، جس کے تحت فن کتابت کا ایک مدرسہ بھی تھا، شاہ اسماعیل اور اس کے فرزند طہماسپ نے قدردانی کی، کہا جاتا ہے کہ جب صفویوں اور ترکوں میں جنگ چھڑی تو شاہ اسماعیل نے ان کو ایک تہہ خانہ میں چھپا دیا تھا، تاکہ دشمن کے ہاتھوں سے محفوظ رہیں، اور جب جنگ ختم ہوئی تو شاہ کی سب سے پہلی فکر یہی تھی کہ ان کے بارے میں اطمینان حاصل کرے۔

بہزاد نے تیموریوں اور صفویوں کے لئے بحیثیت مصور کام کیا، خمسہ نظامی کا ایک نسخہ جو مولانا احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس پر بہزاد کے ہاتھ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ بابر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ بہزاد ایک ماہر فنکار تھا، اس کی مصوری اعلی درجہ کی تھی۔ بہزاد کی بنائی ہوئی تصویروں کا امتیاز رنگوں کے امتزاج میں ان کی مہارت ہے، اور مختلف نفسیاتی حالتوں کی بہت باریکی سے تصویر کشی کرتے ہیں، عمارتوں اور فطری مناظر کے نمونوں کو دیکھنے والا ان کے ذوق اور اختراع کی داد دئے بغیر نہیں رہتا، وہ تصویر کو عمدہ گل بوٹوں اور متناسب اشکال سے سجاتے ہیں۔ ان کے شہ پاروں میں گلستان سعدی کا ایک مصور مخطوطہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے، جو حسین بائقرا کے لئے تیار کیا گیا تھا، اس میں یوسف وزلیخا کی تصویر بہزاد کے جادوئی ہاتھوں کے کمال کا نمونہ ہے۔

بہزاد کا انتقال 1535 /941 میں خراسان میں ہوا۔

8.6.3 ہندوستان میں مسلم دور حکومت میں مصوری

مصوری کے مراکز میں ہندوستان بھی ہے، جہاں مسلم دور حکومت میں مصوری کی سرپرستی ہوئی، سلاطین دہلی کے دور میں ایسے مصور تھے، جو درباروں اور محلوں کی دیواروں پر نقش ونگار اور گل بوٹے بناتے تھے۔ سلاطین کے خلوت خانوں میں مصور نقاشی کیا کرتے تھے۔ تمدنی جلوے میں فتوحات فیروز شاہی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پوشاک، گھوڑے کی زین، لگام، ساغر، مینا، بارگاہ، خرگاہ، پردے اور تخت وغیرہ کی تصویریں بنانے کا عام رواج تھا، البتہ جاندار کی تصویریں نہیں پائی جاتی تھیں۔

مغلیہ دور کے بادشاہوں کو مصوری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا، بابر اور ہمایوں بھی تصویر کا اچھا ذوق رکھتے تھے، اکبر نے باقاعدہ مصوری کی سرپرستی کی، ہر مصور کو اس کے کام کے مطابق انعام اور اضافہ تنخواہ سے سرفراز کیا جاتا، رنگ آمیزی کے فن کو بڑی ترقی ہوئی، اور صفائی ولطافت میں تازگی پیدا ہوئی، کامل فن استادوں نے بے جان اشیا میں تصویر کے ذریعہ جان ڈال دی۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس فن میں سو سے زیادہ اساتذہ پیدا ہوئے، جن میں میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبد الصمد شیرازی شامل ہیں، میر سید علی تبریزی اس قدر با کمال تھا کہ چاول کے ایک دانہ پر ایسی تصویر بنائی تھی جس میں دو آدمی چوگان کھیل رہے تھے، اور دونوں سروں پر کھمبے نصب تھے، اور ایک شعر بھی لکھا ہوا تھا۔ عبد الصمد شیرازی نے آگے بڑھ کر ایک چاول کے دانہ پر سات آدمیوں کو چوگان کھیلتے ہوئے دکھایا۔ اس دور میں داستان امیر حمزہ کی ایک ہزار چار سو حیرت انگیز تصویریں بنائی گئیں۔ چنگیز نامہ، ظفر نامہ، اکبر نامہ وغیرہ کتابیں تصویروں سے آراستہ کی گئیں، مہابھارت کے فارسی ترجمہ میں محمد شریف نے 165 تصویریں بنائی تھیں۔

شہنشاہ جہاں گیر نہ صرف مصوری کا قدرداں بلکہ خود اس کا ماہر تھا، وہ اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ میری مہارت اس فن کے استادوں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ فن کو پرکھنے کی جتنی مہارت جہانگیر کو تھی اتنی مصوروں کو بھی نہ تھی، ایک مصور نے اس کو ایک تصویر لا کر دی، جس میں ایک

عورت کی تصویر اس طرح کھینچی تھی کہ اس کی کنیز اس کے تلوے سہلا رہی ہے، جہاں گیر نے پانچ ہزار روپئے دے کر وہ تصویر لے لی، اس پر مصور نے تعجب سے پوچھا حضور اس میں کیا بات ہے، بادشاہ نے جواب دیا: جب تلوے سہلائے جاتے ہیں تو خفیف سی گدگدی پیدا ہوتی ہے، اس کا اثر چہرے پر ظاہر ہوتا ہے، اور یہ اثر تصویر میں موجود ہے۔ اس کے چڑیا گھر میں طرح طرح کے پرند اور جانور تھے، ان میں سے جو اس کو پسند آجاتے یا عجیب وغریب معلوم ہوتے، ان کی تصویر بنوا کر اپنی تزک میں شامل کر لیتا۔ جب وہ کوئی اچھی تصویر دیکھتا تو اس کی نقل بنوا کر اپنے پاس رکھ لیتا، ایک بار اس نے مشہور مصور بہزاد کی تصویر دیکھی، جس میں دو اونٹ لڑ رہے تھے، اور ان کے مالک الگ کھڑے ہو کر تماشہ دیکھ رہے تھے، جہاں گیر کو یہ تصویر پسند آئی، اس نے اپنے ایک ہندو مصور نانہا کو اس کی نقل تیار کرنے کا حکم دیا، جب یہ نقل تیار ہوئی تو اصل کے بالکل مطابق تھی۔ یہ تصویر ایران کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اس کے دور کے مشہور مصور آقا رضائی ہروی اور نادر الزماں ابوالحسن ہیں۔

شاہ جہاں کے دور میں بھی مصوری کو فروغ ہوا، اس کے درباری مصوروں میں محمد فقیر اللہ، نادر سمرقندی، میر محمد ہاشم امتیازی شہرت رکھتے ہیں، اس کے دور میں شبیہ سازی پر زیادہ زور دیا گیا، شہزادوں، سنیاسیوں، درویشوں کی جیتی جاگتی تصویریں تیار ہوئیں، دربار کی تزئین وآرائش اور اس کے آداب ومراسم دکھانے پر زیادہ توجہ دی گئی۔ اس عہد کی تصویریں بڑی دیدہ زیب اور نظر افروز ہیں، خاکہ کاری میں بڑی پر کاری ہے۔ انسانی شبیہوں میں جسم کے ہر حصہ کو، پھر جسم کے لباس واسلحہ، وضع قطع اور جزئیات کو بھی اچھی طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی۔

8.7 موسیقی

8.7.1 مسلمان اور موسیقی

خوش الحانی کو اسلام میں مطلوب قرار دیا ہے، داود علیہ السلام کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ جب وہ زبور پڑھتے تھے تو ان کی خوش الحانی کی وجہ سے پہاڑ اور پرندے بھی جھوم جاتے تھے، ان کو صوتی مزامیر عطا کیے گئے تھے۔ خوش آوازی کے ساتھ اچھے اشعار پڑھنا مطلوب ہے، البتہ ایسے اشعار جو برائی کی طرف لے جانے والے ہوں، ممنوع ہیں۔ فقہا نے منہ اور ہاتھ سے بجنے والے باجوں کو منع کیا ہے، البتہ دف کی اجازت دی ہے۔

فقہا اور ارباب افتا کے اقوال اور دینی رجحان کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موسیقی سے دور رہی، لیکن عوام وخواص میں ہر زمانہ میں ایک طبقہ ایسا رہا، جس نے فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں کی طرح اس طرف بھی رخ کیا، اور موسیقی میں کمال پیدا کیا۔

عربی موسیقی حجاز سے شروع ہوئی، جس کو ایران وروم کے موالی لائے تھے، ان میں ابو عبدالمنعم عیسی بن عبداللہ ملقب بہ طویس اور سعید بن مسجح کے نام ملتے ہیں، سعید پہلا شخص تھا جس نے یونانی فیثاغورث کے پیمانہ ہفت اوزان کو عربی موسیقی میں داخل کیا۔ عربی موسیقی میں سادے باجے شامل تھے، جن میں دف، قصبہ، مزمار، بوق، قضیب، ضوج اور طبل کے نام ملتے ہیں، جب اسلامی حکومت میں وسعت آئی تو ان آلات میں بھی جدت آئی، نیز موسیقی کے قواعد وضوابط مدون ہوئے، خلفا اور امرا نے اس طرف توجہ کی، عباسی دور میں اس طرف رجحان زیادہ ہوا، مامون کو اس فن پر اس قدر عبور تھا کہ گانے والی عورتوں کے جھرمٹ میں کسی سے اگر ذرا سے بے اصولی ہوتی تو اس کو پہچان کر درست کرتا تھا۔

اندلس میں عرب موسیقی کو زریاب کی وجہ سے فروغ ہو، اس شخص نے مشرقی موسیقی سے اہل اندلس کو روشناس کرایا، اندلسیوں سے ان

کے پڑوسیوں نے حاصل کیا، اندلس کا شہر آمدہ اپنی تفریحات کے لئے مشہور تھا، یہاں عود، رباب، قانون، مونس، کیثرہ، قیثار، زلامی، قشرہ، نورہ اور بوق وغیرہ آلات موسیقی استعمال ہوتے تھے۔ اس فن کو وسعت دینے کے لئے موشحات کی ایجاد ہوئی، موسیقی کا فن یہاں ابن باجہ کے ہاتھوں عروج کو پہونچا۔

مسلمانوں میں صوفیا کے ذریعہ بھی موسیقی کا فروغ ہوا، چشتیہ، سہروردیہ اور فردوسیہ سلسلہ کے صوفیا کرام اپنے یہاں سماع کی مجلسیں برابر منعقد کراتے رہے، چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے یہاں تو سماع مذاق اس قدر بڑھ گیا کہ مجلس سماع ان کے یہاں راہ طریقت کا ایک جز بن گئی۔ صوفیاء نے سماع میں موسیقی کا آلات کے ساتھ استعمال کیا، اور عوام کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ شریک ہوتی۔

موسیقی کو ایران میں بڑا فروغ حاصل ہوا، ایرانی راگ عرب موسیقی سے متاثر تھے، ان کی بارہ قسمیں تھیں، جن میں سے ہر راگ کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، جو کل 24 راگ ہوئے، جو رات دن کے چوبیس گھنٹوں کے مطابق ہوگئے۔ ایران اور عرب کی موسیقی میں عشاق، نوروز، مبارکہ کرشمہ، بیعت، عراق، نیشاپور، زنگلہ، چہارگاہ، پیدازل، اشیران، رہوائے، زنگلہ حجاز، گوشہ ازل جیسے راگ اور راگنیاں مقبول رہیں۔

8.7.2 ہندوستان میں مسلم دور حکومت میں موسیقی

ہندوستان میں سلاطین دہلی کے دربار اور عام معاشرت میں موسیقی مزامیر کے ساتھ مقبول رہی، رکن الدین فیروز شاہ دربار کے طرب وعشرت میں ایسا مشغول ہوا کہ اسے سلطنت کے اور معاملات سے کوئی سروکار نہ رہا، غیاث الدین بلبن ایک سخت بیماری سے اچھا ہوا تو خوشی میں گانے بجانے کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ سلاطین کی سرپرستی سے موسیقی کے فن کو بڑی ترقی ہوئی، مسلمان ہندوستان آئے تو تاروالے ساز قانون، عون، قنبور، کمان جاہ، اور منہ سے بجانے والے باجے بق، نئے اور سرنا وغیرہ ساتھ لائے، نقارہ، سنج، دف، طبل، اور نوبت بھی ان کی وجہ سے ہندوستان میں رائج ہوئے۔ ایران وعرب کے راگ جب ہندوستان میں مقبول ہوئے تو ہندوستانی، ایرانی اور عربی راگوں میں بڑا امتزاج پیدا ہوا، اور ایسی ہم آہنگی پیدا ہوئی کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ ایرانی اور عربی راگنیاں ہندوستانی راگوں سے مستعار ہیں، یا ہندوستانی راگ ایرانی وعربی راگوں سے متاثر ہیں۔

مشہور موسیقار

8.7.3 زریاب

ابوالحسن علی بن نافع، عباسی خلیفہ مہدی کا آزاد کردہ غلام تھا، بغداد میں پرورش ہوئی، اسحاق موصلی سے موسیقی کی تربیت حاصل کی، استاذ نے اس کو ہارون الرشید کے دربار میں پیش کیا، اور زریاب سے گانے کی فرمائش کی، اس کا گانا سن کر ہارون نے تعریفی کلمات کہے، جس سے اسحاق موصلی کو خوف ہوا کہ کہیں شاگرد اس سے آگے نہ بڑھ جائے، لہذا اس نے زریاب کو بغداد چھوڑنے کا حکم دیا، زریاب نے بغداد سے سفر کرکے اندلس کی راہ لی، اور عبدالرحمٰن ثانی کے دربار سے وابستہ ہوا، اور بڑی شہرت حاصل کی، قرطبہ میں ایک فنون لطیفہ کا مدرسہ کھولا۔ اس نے اندلس میں موسیقی کو فروغ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ موشحات کی ایجاد اسی کے سبب ہوئی، کیوں کہ اس نے نئے موسیقی کے مدرسہ کی بنا ڈالی، اس

نے موسیقی میں کئی چیزیں داخل کیں، مثلاً عود کے چار تار ہوتے تھے، اس میں پانچویں تار کا اضافہ کیا، موسیقی میں کئی مقامات کا اضافہ کیا، عود کا مضراب جواب تک لکڑی سے بنتا تھا، اس کو گدھ کے پروں سے تیار کیا۔ مبتدئین کے لئے موسیقی سیکھنے کے قواعد مقرر کئے۔ بہت سے مردوں اور عورتوں خصوصاً باندیوں کو موسیقی کی تعلیم دی۔

زریاب کا انتقال قرطبہ میں 845 /230 میں ہوا۔

8.7.4 الکندی

ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی 805 /185 میں کوفہ میں پیدا ہوئے، قرآن کریم حفظ کیا، حدیث شریف کا علم حاصل کیا، ریاضیات، فلکیات، طبیعیات اور فلسفہ میں مہارت حاصل کی، ساتھ ہی موسیقی میں کمال پیدا کیا، یوروپ میں ان کو (Alkindus) کہا جاتا ہے۔

کندی نے موسیقی پر طبی اعتبار سے بھی توجہ دی، اور بتایا کہ نغموں کا جسم پر اثر پڑتا ہے، جس سے ہاضمہ میں سہولت ہوتی ہے، کندی نے ان نغموں، اوتار، سروں اور تال کی تفصیل بیان کی ہے جو جسم کی صحت کے لئے فائدہ مند ہیں۔ کندی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے موسیقی کو ابجدی حروف میں مدون کیا ہے، اپنی کتاب میں انہوں نے موسیقی کے پیمانہ (Musical scale) تحریر کئے، جو عربی موسیقی میں آج بھی مستعمل ہے۔ کندی کہتے ہیں کہ جس طرح طبیب فلسفی کو علاج سے پہلے حفظان صحت اور علاج کے احوال معلوم کرنے کی ضرورت ہے، اسی طرح موسیقار فلسفی کے لئے نغموں کی تالیف سے پہلے سر، تال، شعر اور نغمہ کی اصناف کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ کندی نے موسیقی پر کئی پہلوؤں سے بحث کی ہے، مثلاً سر اور ان کی تالیف کے وقت ان میں ہم آہنگ ہونے والی اور نہ ہونے والی قسمیں، تال اور ان کی ضرب کی تعداد، اور ہر ضرب کے ساتھ کے الحان، موسیقی کا نفسیات پر اثر، الحان سے پیدا ہونے والے خوشی، غم اور بہادری کے احساسات، صحت اور مزاج پر مختلف نغموں کا اثر، تاروں اور نغموں اور اجرام ساویہ کے درمیان تعلق وغیرہ، یہ موضوعات ان کی کتابوں میں آئے ہیں، انہوں نے ان تمام امور کے لئے اصول وقوانین بنائے جن کو برتنا ایک ماہر موسیقار کے لئے ضروری ہوتا ہے، اپنے اقوال کی تائید میں ریاضیاتی اور منطقی دلیلیں دیں۔ اپنے رسائل میں انہوں نے موسیقی کی اقسام بیان کی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بچپن کے الحان الگ ہوتے ہیں، جوانی اور بڑھاپے کے الحان الگ ہوتے ہیں، اسی طرح گرمی، سردی، صبح وشام اور رات کے الحان اوقات کے لحاظ سے الگ الگ ہوتے ہیں۔

ان کی تصنیفات کی تعداد دو سو سے زائد ہے، جن میں موسیقی پر کئی کتابیں پائی جاتی ہیں، جن میں رسالۃ فی خبر صناع التالیف، رسالۃ فی الایقاع، رسالۃ فی المدخل الی صناعۃ الموسیقی، رسالۃ فی ترتیب النغم الدال علی طبائع الاشخاص العالیہ وتشابہ التالیف، رسال فی صناعۃ الشعر شامل ہیں۔

کندی کی وفات 256/873ھ میں بغداد میں ہوئی۔

8.7.5 الفارابی

محمد بن محمد، ابونصر فارابی کی پیدائش ترکستان میں فاراب نامی گاں میں 874 /260 میں ہوئی، اپنے علاقے اور عراق میں تعلیم

حاصل کی، فلسفہ، منطق، ریاضیات، طبعیات، طب کے ساتھ موسیقی میں بھی مہارت بہم پہونچائی، موسیقی کے تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہو ں نے کئی آلات ایجاد کئے تھے، جن میں قانون نامی آلہ بھی تھا، انہوں نے ایک تار اور دوتار سے بجنے والے رباب کا وصف بیان کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے موسیقی کا لفظ استعمال کیا، اور بعض اصطلاحات اور آوازوں کے نام وضع کئے۔ انہوں نے موسیقی کو ریاضیات کی شاخ کی طور پر متعارف کرایا، اس فن کی تمام گذشتہ کتابوں کا مطالعہ کیا، وہ موسیقی کی عوامی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موسیقی نغموں کا وہ مجموعہ ہے جو کلام سے مل کر ایک منفرد اور خاص ترتیب کے ساتھ سامنے آئے۔ اور پیشہ ورانہ حیثیت سے اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ: موسیقی ان الحان وقواعد پر مشتمل ہوتی ہے، جو موسیقی سے جڑتے اور خوبصورتی وکمال حاصل کرتے ہیں۔

موسیقی میں ان کی کتاب المدخل الی صناعة الموسیقی، کتاب فی احصاء الایقاع ہے، اس کے علاوہ کتاب الموسیقی الکبیر ان کی اہم کتابوں میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں موسیقی میں مہارت تھی، اور اس میں کمال پیدا کیا تھا، ایک عجیب آلہ ایجاد کیا، جس کو بجانے سے احساسات متحرک ہو جاتے تھے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ سیف الدولہ کے دربار میں داخل ہوئے، اور ایسا ساز بجایا، جس سے سب ہنسنے لگے، پھر دوسرا ساز بجایا تو سب کو رلا دیا، پھر تیسرا ساز بجایا تو سب کو نیند آگئی، اور وہ سب کو سوتا ہوا چھوڑ کر چلے آئے۔

فارابی کی وفات 339/950 میں ہوئی۔

8.7.6 امیر خسرو

ابو الحسن بن امیر سیف الدین محمود کی پیدائش 1253 /651 میں ہوئی، آٹھ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا، اور نانا عماد الملک کی پرورش میں آگئے، جو صاحب علم فضل بھی تھے اور عزت واقتدار بھی خدا نے عطا کیا تھا، آغاز شباب ہی میں تمام مروجہ علوم میں کمال حاصل کیا، فارسی اور ہندی شاعری تو گویا زبان پر رہتی تھی، کئی درباروں سے وابستہ رہے، آٹھ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، لیکن خواجہ نظام الدین کے فقیرانہ ٹھاٹ نے سب سے بے نیاز رکھا، وہ ہندوستان کی کئی زبانیں جانتے تھے، اردو کا پہلا شعر انہیں سے منسوب ہے۔ ہندوستانی موسیقی میں ان کی حصہ داری اہم ہے، وہ ایرانی موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے، لیکن طبعا ہندوسانی موسیقی سے والہانہ لگاؤ تھا، مسلمانوں اور ہندوں کے راگوں کے امتزاج میں ان کا بڑا حصہ ہے، صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں: وہ بہت بڑے صوفی بھی تھے، اور بہت بڑے شاعر بھی، نائک بھی تھے، اور بہت بڑے محب وطن بھی، ان گونا گوں اوصاف کی وجہ سے ان کی طریقت، شاعری اور موسیقی میں جلوہ صد رنگ نہیں بلکہ ہزار رنگ پیدا ہو گئے۔ انہون نے اعجاز خسروی میں ایک باب موسیقی کے اصول وفروع پر بھی لکھا ہے۔ امیر خسرو نے مختلف راگوں کے امتزاج سے کئی راگ مثلا مجیر، منم، زیلف، سازگری، ایمن، عشاق، موافق، غنم، فرغنہ، سرپردہ، باخرز، فردوست اور محرم ایجاد کئے۔ امیر خسرو نے ہندووں کے دنیا اور ایرانی طنبورہ کو ملا کر ستار ایجاد کیا، اور اس میں تین تار بڑھائے۔

امیر خسرو کو موسیقی میں مہارت کی وجہ سے: نائک کا خطاب دیا گیا تھا، جو اس فن کا سب سے بڑا خطاب تھا۔ امیر خسرو کی وفات 1325ء میں ہوئی۔

8.8 تعمیرات

8.8.1 مسلمان اور فن تعمیر

اسلامی تہذیب عالمی تہذیبوں میں اپنا مستقل وجود اور مقام رکھتی ہے، وہ ایک زندہ تہذیب ہے، جس کے آثار ونقوش روئے زمین کے ایک بڑے رقبہ میں صدیوں سے قائم ہوتے چلے آ رہے ہیں فن تعمیر تہذیب اسلامی کا لازمی عنصر ہے جس نے آغاز اسلام سے اپنا سفر شروع کیا، ہجرت کے فوراً بعد حضورﷺ نے دو مسجدیں تعمیر کرائیں، جن کی سادگی میں پرکاری تھی، فتوحات کی وسعت کے ساتھ عربوں کے تعمیری ذوق نے مزید ترقی کی، جب مختلف ممالک کے مقامی باشندے اسلام میں داخل ہوئے تو اسلامی فن تعمیر میں رومی، ایرانی، مصری، اور اس سے آگے بڑھ کر اندلسی اور ہندی ذوق شامل ہوا، ہر ملک وقوم کے ذوق پر اسلامی اقدار وروایات کا اثر پڑا، اور ان عناصر سے ملکر جو طرز تعمیر سامنے آیا، وہ کبھی اموی کہلایا، کبھی عباسی، کہیں اس کا نام فاطمی، طولونی، مغربی اور اندلسی پڑا، تو کہیں مملوکی، سلجوقی، مغل اور ہندی۔ ان تمام طرز کے نمونوں میں جو قدر مشترک پائی جاتی ہے، وہ عقیدہ توحید سے تاثر، روحانیت، عوامی خدمت وبہبود اور انسانیت ہے، اس کے مظاہر میں سب سے اول مسجد ہے، جو اسلامی معاشرہ کی بنیاد کا پتھر ہے، اس کے علاوہ مدرسہ، خانقاہ، شفاخانے، حمامات، سرائے اور مسافر خانے، باغات، محلات، شہر، پل، قلعے اور فوجی چھاونیاں، نہریں، تالاب اور فصیلیں ہیں۔

8.8.2 مسجد

مسجد اسلامی فن تعمیر کا اولین نقش ہے، جس کی طرف مسلمانوں نے اول روز سے توجہ کی، عبادت کے تقدس کے ساتھ اس کو فن تعمیر کا جمال بھی عطا کیا، تاکہ عبادت گذار سکون واطمینان کے ساتھ خشوع وخضوع اختیار کر سکیں۔ مسجد کی تعمیر نماز کے قواعد کے مطابق کی جاتی تھی، جس میں صفوں کی درستگی، بلا کسی رکاوٹ کے امام کی اقتدا، آواز کو مسجد کے تمام حصوں تک پہونچانا، محراب ومنبر کی جگہ کی تعیین اور طہارت وپاکیزگی کا لحاظ رکھنا ضروری تھا۔ ابتدا میں مسجدیں سادہ ہوا کرتی تھیں، جوں جوں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، عربوں نے مقامی آبادیوں اور تہذیبوں سے متاثر ہو کر مسجدوں میں بھی تزئین وآرائش کا خیال رکھنا شروع کیا، خلفا نے مسجدوں کی تعمیر میں دلچسپی لی، اور اس کے نتیجہ میں مساجد اسلامی فن تعمیر کے نمونے کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔

8.8.3 جامع اموی

اس مسجد کی بنیاد ولید بن عبدالملک نے 86ھ/705ء میں رکھی، دس سال تعمیر جاری رہی۔ مسجد کی چہار دیواری بڑے بڑے پتھروں سے بنائی گئی ہے، جن کو کلس کا پتھر کہتے ہیں، مسجد کی وسعت 97x156 میٹر ہے، اس کے چار دروازے ہیں، مغربی دروازہ باب البرید کہلاتا ہے، جو سوق حمیدیہ کی طرف کھلتا ہے، اس دروازہ میں تین مدخل ہیں، ایک مرکزی، اور دو ضمنی، لکڑی کے بھاری بھرکم کواڑوں کو مملوکی دور میں تانبہ سے مونڈھا گیا ہے۔ مشرقی دروازہ آج بھی اموی دور کی شکل پر برقرار ہے، اس کو باب جیرون کہا جاتا تھا، اب اس کو باب النوفرہ کہا جاتا ہے، یہ بھی بہت لکڑی کا بڑا دروازہ ہے، اس کے دونوں جانب دو چھوٹے دروازے ہیں، مشرقی اور مغربی دروازے متصل برآمدے ہیں، جو صحن مسجد کو گھیرے ہوئے ہیں، شمالی دروازے میں صرف ایک مدخل ہے، اس دروازہ کو باب الفرادیس کہا جاتا تھا، اب اس کا نام باب العمارہ ہے۔ اس

سے متصل خانقاہ سمیساطیہ اور صلاح الدین ایوبی کا مزار ہے۔ چوتھا دروازہ قبلہ کی دیوار میں بعد میں کھولا گیا تھا۔ اس لئے اس کو باب الزیادہ کہتے ہیں۔ صحن مسجد مستطیل ہے، جس میں مغربی دروازہ کے قریب ایک گنبد نما چھوٹی سے ہشت پہلو عمارت آٹھ ستونوں پر قائم ہے، اس گنبد کی تعمیر 172ھ میں ہوئی، اس قبۃ الخزانہ کہتے ہیں، اس پر فیسیفساء کی جاذب نظر نقاشی کی گئی ہے۔ مسجد کا حصہ تین مساوی دالانوں پر مشتمل ہے، جن میں پتھر کے لمبے لمبے ستونوں پر مخروطی چھت قائم ہے، جو لکڑی سے بنائی گئی ہے، اور اوپر سے تانبہ مونڈھا گیا ہے۔ وسط میں ایک ہشت پہلو گنبد ہے، جس کو قبۃ النسر کہا جاتا ہے، یہ 36 میٹر بلند ہے۔ مسجد کے چاروں کونوں پر چوکور برج قائم تھے، جن میں سے اگلے دو برج اب بھی قائم ہیں، ان پر دو اونچے مینار قائم ہیں، مغربی سمت کے مینار کو منار الغزالی کہتے ہیں، اور مشرقی سمت کے مینار کو منار عیسی کہتے ہیں۔ شمالی دروازہ پر ایک اور مینار قائم ہے، جس نام قائتبائی کا مینار ہے، لیکن اس کی خوبصورتی کی وجہ سے منارۃ العروس کہا جاتا ہے۔

جامع اموی کی خوبصورتی کو دوبالا کرنے کے لئے محراب کی بلند و بالا دیوار، گنبد اور جنوبی دیوار کی کھڑکیوں پر رنگین شیشہ کا کام ہے، اور دیواروں کی بلندیوں کو جگہ جگہ فسیفساء کی استر کاری سے مزین کیا گیا ہے، فسیفساء کی استر کاری میں گچ کے ساتھ رنگین شیشوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، سیپی اور صدف کو ملایا جاتا ہے۔ باب البرید کے داخلی حصہ میں بھی فسیفساء کا زریں کام ہے، جس میں درختوں اور گھروں کی تصویریں بھی بنائی گئیں ہیں۔ دیوار کے نچلے حصوں کو چار میٹر تک مرمر سے مزین کیا گیا ہے۔ ستونوں کے تاج میں عمدہ گلکاری کی گئی ہے، اور کئی ستونوں پر خطاطی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

8.8.4 مسجد قرطبہ

اندلس میں اسلامی تہذیب کا مینار، اور قرطبہ میں اسلامی و اموی طرز تعمیر کا شاہ کار، مسجد قرطبہ، جس کو یوروپ اور اسلام کے ملاپ کا اولین سنگم کہتے ہیں۔ دنیا کے فن تعمیر کے نادر نمونوں میں سے ایک فن پارہ، جس کا حسن و جمال اور عظمت آج بھی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ مسجد قرطبہ کی تعمیر وادی کبیر کی نہر کے قریب ایک اونچے اور بلند ٹیلے پر 169ھ/785ء میں عبدالرحمٰن الداخل نے کرائی تھی، ابتدا میں اس کا نام مسجد حضرہ تھا، اس کے لئے اشبیلیہ، قسطنطنیہ اور اربونہ سے ستون اور مرمر منگوایا، مسجد کی عمارت اپنی بھاری بھی کم فصیل اور برجیوں کی وجہ سے قلعہ نما دکھائی دیتی ہے، اس کے مینار کی بلندی 23.5 میٹر تھی، جس کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا تھا، لیکن وہ منہدم ہو گیا۔ مسجد کا رقبہ 135x180 میٹر یا 24300 مربع میٹر ہے، داخلہ کے لئے کانسہ کے بنے ہوئے انیس دروازے ہیں، اس کے وسیع و عریض صحن کو نارنگیوں کا صحن کہا جاتا ہے، مسجد کے احاطہ میں گیارہ عمودی دالان ہیں، اور اس میں 1290 ستون تھے، ان میں سے اب 856 ستون باقی ہیں، ستونوں کے سروں پر تاج ہیں، اور ہر دو ستونوں کے اوپر دو کمانیں ہیں، جو چھت کو سہارا دیتی ہیں۔ مسجد کی تعمیر میں سرخ اور زرد پتھر استعمال کیا گیا ہے، چھت اور دیواروں پر قرآن کریم کی آیات اور نقش و نگار کندہ ہیں، دیواروں پر مینا کاری اور فسیفساء کی استر کاری کی گئی ہے۔ بعض جگہ سونے اور چاندی سے مزین کیا گیا ہے۔ دو سو فانوسوں میں سات ہزار قندیلیں خوشبودار تیل سے روشن کی جاتی تھیں۔

مسجد کے قبلہ کی دیوار میں ایک مقصورہ یا محراب نما کمرہ ہے، جس کی زمین میں چاندی اور قاشانی کا کام ہے، اس مقصورہ پر تین منقش گنبد ہیں، مسجد کی محراب میں اوپر دیوار میں سات کھڑکیاں ہیں، جو سات آسمانوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، مسجد کی ہفت ضلعی محراب دنیا کی خوبصورت ترین محرابوں میں سے ہے، جس کی قرمزی رنگ کی دیواروں پر پر سونے، مرمر، مینا اور فسیفساء کا کام ہے۔ مسجد کا منبر ہاتھ دانت،

صندل، آبنوس، عود اور دیگر خوشبودار لکڑیوں کے 3700 ٹکڑوں سے جوڑ کر بنایا گیا ہے، اس میں سونے اور چاندی کی کیلیں لگائی گئی ہیں۔ مسجد عبادت کے علاوہ درس وتدریس کے استعمال میں بھی آتی تھی، یہاں ایک مدرسہ اور کتب خانہ بھی تھا، جس میں ایک وقت میں 40,000 مخطوطات خوبصورت جلد بندی کے ساتھ موجود رہتے تھے۔

8.8.5 مینار

مینار کی تعمیر اگرچہ اسلام سے پہلے بھی پائی جاتی ہے، لیکن مساجد میں ان کے استعمال کے بعد سے یہ اسلامی فن تعمیر کا لازمی جز بن گئے، اور ان کی پہچان مسلم فن تعمیر کے رمز کے طور پر ہونے لگی۔ دور اول میں مسجد میں مینار کا استعمال خلفائے راشدین کے دور میں شروع ہوا، جس کا استعمال آبادی کی وسعت کی وجہ سے اذان کی آواز دور تک پہونچانے کے لئے کیا جاتا تھا، اس لئے اس کو مئذنہ (اذان دینے کی جگہ) کہا جاتا تھا۔ اولین مینار بصرہ میں زیاد بن ابیہ نے 45ھ میں بنوایا تھا۔ مینار اسلامی فن تعمیر کا اہم عنصر ہے، جس کی تعمیر میں مسلم معماروں نے اپنے فن اور مہارت کا استعمال کیا، اور جن میں سے کئی میناروں کو تاریخی شہرت حاصل ہوئی۔

8.8.6 مسجد قیروان کا مینار

مسجد قیروان (تونس) کی بنیاد صحابی رسول عقبہ بن نافع نے 50ھ/670ء میں ڈالی تھی، پانچ سال میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی، اس مسجد کا مینار بشر بن صفوان والی قیروان نے 105ھ میں تعمیر کرایا، جو 109ھ میں مکمل ہوا، یہ مینار جس کو صومعہ کہا جاتا ہے، تین منزلہ ہے، سب سے طویل پہلی منزل ہے، جو ایک چوکور عمارت ہے، اس کی لمبائی 19 میٹر ہے، مینار میں داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ ہے، جس کے اندر بڑی بڑی پتھر کی سیڑھیاں ہیں، جو دیواروں کے ساتھ گھومتی ہوئی اوپر کو جاتی ہیں، روشنی کے لئے دیوار میں محرابی روشن دان بنے ہوئے ہیں، پہلی منزل کی چھت پر چاروں طرف منڈیر ہے، جو اذان کے لئے خوبصورتی سے بنائی گئی ہے، اس کے بیچ سے دوسری منزل شروع ہوتی ہے، جس کے چاروں طرف تین تین کمانیں بنی ہوئی ہیں، اور چھت پر خوبصورت منڈیر بنی ہوئی ہے، تیسری منزل پر ایک خوبصورت گنبد ہے، جو بنو حفص کے دور میں تعمیر کیا گیا ہے۔

اس مینار سے اذان کے علاوہ نگرانی کا بھی کام لیا جاتا تھا، یہ سب سے قدیم ترین مینار ہے، جو تیرہ سو سال سے اپنی اصلی حالت پر برقرار ہے۔ اس کی لمبائی 31.5 میٹر ہے۔ اس کا امتیاز یہ ہے کہ یہ چوکور مینار ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں اسی طرز کے مینار بنائے جاتے ہوں گے۔

8.8.7 مئذنہ ملویہ (گھومتا ہوا مینار)

معتصم باللہ کے بسائے ہوئے شہر سامرا کی جامع مسجد کے لئے متوکل نے 237ھ میں ایک مینار تعمیر کرایا تھا، جو عباسی طرز تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس جیسا دوسرا مینار اس سے پہلے تعمیر نہیں ہوا۔ حلزونی شکل کا یہ مینار اپنے وقت کی سب سے بڑی مسجد کے لئے بنایا گیا تھا، مسجد کا رقبہ 200x156 مربع میٹر ہے، یہ مینار مسجد سے 27.25 میٹر دور ہے، جس کی بلندی 52 میٹر ہے، جو دو چوکور چبوتروں پر قائم ہے، پہلے چبوترہ کی بلندی 4.20 میٹر ہے، اور ہر ضلع کی چوڑائی 31.5 میٹر ہے، دوسرے چبوترہ کی لمبائی 120 سنٹی میٹر ہے۔

اس پر اسطوانی شکل کی پانچ منزلہ مینار کی عمارت قائم ہے، جس کی چوڑائی بلندی کے ساتھ بتدریج کم ہوتی جاتی ہے، مینار کے اطراف دو میٹر چوڑی سیڑھیاں ہیں، جو گھڑی کی سوئیوں کے برعکس سمت میں گھومتی ہوئی اوپر کو چلی گئی ہیں۔ سیڑھیوں کی تعداد 399 ہے، مینار کی بلندی پر ایک منزل دائرہ کی شکل میں بنی ہوئی ہے، جس میں سات کھڑکیاں ہیں، یہاں سے مؤذن اذان دیتا ہے۔ اس کے اوپر لکڑی سے بنا ہوا سائبان تھا، جس سے مؤذن سایہ حاصل کر سکے۔

شہر سامرا تو ڈیڑھ صدی سے زیادہ آباد نہیں رہ سکا، اور معتمد نے دوبارہ بغداد کو دارالخلافہ بنالیا، لیکن جامع مسجد کا یہ مینار آج بھی قائم ہے، اور اپنے معماروں کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ بعد میں اسی طرز کا مینار مصر میں احمد بن طولون کی مسجد میں بنایا گیا۔

8.8.8 قطب مینار

ہندوستان میں اسلامی فن تعمیر کی عظمت کا نشان، مسجد قوت الاسلام کا مینار، جس کی تعمیر قطب الدین ایبک نے 589ھ/1193ء میں شروع کی تھی، اس کے جانشین شمس الدین التمش نے اس کی دوسری اور تیسری منزل تعمیر کی، تغلق دور حکومت میں فیروز شاہ تغلق نے چوتھی اور پانچویں منزل تعمیر کی۔ ہر منزل پر خوبصورت جھروکے بنائے گئے ہیں، تاکہ مؤذن کسی بھی جگہ سے اذان کہہ سکے۔ سب سے اوپر کی منزل پر پر ایک چھتری تھی جو سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھی۔

مخروطی شکل کی یہ عمارت 73 میٹر بلند ہے، اس کا قطر زمین پر 14.32 میٹر ہے، جبکہ چوٹی پر اس کا قطر صرف 2.75 میٹر ہے۔ مینار کے اندر 379 سیڑھیاں ہیں، جو گھومتی ہوئی اوپر کو چلی گئی ہیں۔ قطب مینار کی دیواروں پر خط کوفی میں قرآنی آیات کندہ ہیں، جگہ جگہ گلکاری اور سنگ مرمر سے اس کو مزین کیا گیا ہے۔ پورا مینار سرخ اینٹوں اور پتھروں کا بنا ہوا ہے، یہ بغیر سہارے کے بنا ہوا دنیا کا سب سے اونچا مینار ہے، یعنی کسی عمارت کے سہارے کے بغیر یہ قائم ہے۔ یونیسکو نے اس کو عالمی ثقافتی ورثہ میں شامل کیا ہے۔

ہند اسلامی طرز تعمیر کا یہ شاہ کار حوادث زمانہ سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ہزار سال سے قائم ہے، اور اپنے معماروں کی عظمت کے گن گا رہا ہے۔

8.8.9 بیمارستان

فن تعمیر کے مظاہر میں بیمارستان کی عمارتیں بھی داخل ہیں، جن پر مسلمان سلاطین اور اہل ثروت نے توجہ دی، مسلم دور حکومت میں رفاہ عامہ کے کئی شفاخانے تعمیر ہوئے، مشہور شفاخانوں میں دمشق، مصر، مراکش اور بغداد کے شفاخانے شمار ہوتے ہیں۔

8.8.10 بیمارستان نوری، دمشق

یہ اسپتال نورالدین زنگی نے 549ھ/1154ء میں تعمیر کروایا تھا، جو فن تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے، اس اسپتال کا ایک خوبصورت صدر دروازہ ہے، جس میں داخل ہونے کے بعد 15x20 میٹر کا ایک وسیع صحن ہے، صحن کے درمیان حوض میں فوارہ ہے، صحن کے اطراف میں عمارتیں بنی ہیں، ہر عمارت کے درمیان ایوان ہے، جس کے دونوں جانب دو کمرے بنے ہوئے ہیں، باب الداخلہ کی دیوار پر جو مغربی سمت ہے،

خوبصورت نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، لکڑی سے بنے ہوئے دروازہ کے دوکواڑ ہیں، جن پر تانبہ منڈھا ہوا ہے، اور مناسب دوریوں پر تانبہ کی بڑی بڑی کیلیں لگی ہوئی ہیں۔ دروازہ کے اوپر گچ سے بنی ہوئی گل کاری ہے۔ دروازہ کے اندر 5x5 میٹر کی ڈیوڑھی ہے، جس کے شمالی اور جنوبی جانب دو چھوٹے ایوان ہیں، ڈیوڑھی پر بلند گنبد قائم ہے۔

عمارت میں سب سے اہم اس کے تین ایوان ہیں، مغربی ایوان میں دو وسیع ہال ہیں، جو بیمارستان کے سب سے خوبصورت ہال ہیں، جنوبی ایوان میں نور الدین زنگی کی سلطنت کا شعار بنا ہوا ہے، جس کے اوپر محراب ہے، اور مشرقی ایوان سب سے وسیع ہے، یہاں اطباء لکچر دیا کرتے تھے، ایوان کے بیچ کی دیوار میں الماریاں بنی ہوئی ہیں، جن میں کتابیں رکھی جاتی تھیں۔

8.8.11 بیمارستان منصوری، مصر

اس بیمارستان کی تعمیر منصور قلاؤن نے دمشق کا بیمارستان نوری دیکھنے کے بعد کرائی تھی، قصہ یوں ہوا کہ جب منصور قلاؤن رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے دمشق کے قریب مقیم تھا تو اس کو قولنج کا مرض لاحق ہوا، اطبا نے بیمارستان نوری کی دوا سے اس کا علاج کیا، جب وہ شفا یاب ہوا تو آ کر بیمارستان نوری کا مشاہدہ کیا، اور نذر مانی کہ اگر خدا نے اس کو سلطنت عطا کی تو ایک بیمارستان بنائے گا۔

جب اس کو حکومت حاصل ہوئی تو نذر پوری کرنے کا ارادہ کیا، اور اس کی تعمیر کے لئے ایوبی خاندان کی مونسہ خاتون سے محل لیا گیا، اور اس کے بدلہ میں ان کو قصر زمرد عطا کیا۔ منصور نے اس کی تعمیر کی ذمہ داری امیر علم الدین سنجر کو دی، جس نے اس کی عمارت، گنبد اور مدرسہ کا نقشہ بنایا، اور اس کی تعمیر میں نہایت اہتمام کا مظاہرہ کیا، بیمارستان کی تعمیر 1284 /683 میں شروع ہوئی، گیارہ ماہ کی قلیل مدت میں کام مکمل ہوا، محل کے ہال کو اسی حالت میں رکھا گیا، جس میں چار ایوان تھے۔ بیمارستان کی تعمیر کے لئے قلعہ الروضہ سے ستون اور سنگ مرمر لایا گیا، جب تعمیر مکمل ہوئی تو ایک بہت بڑی مجلس منعقد کی، اور علما و وزرا کو بلایا، اور اس بیمارستان کو عوام وخواص کے لئے وقف کیا، اطبا، کحالین، جراح، ہڈیوں کے ڈاکٹر، آنکھوں کے علاج کے ماہرین مقرر کیے، مریضوں کی خدمت کے لئے فراش، خدمت گذار، صفائی کا عملہ، دھوبی وغیرہ رکھے، ہر مریض کے لئے تکیہ، بستر، لحاف، گدے، فرش وفروش کا انتظام کیا، ہر مرض کے لئے مخصوص کمرے تھے، چار ایوان بخار وغیرہ کے مریضوں کے لئے، ایک ہال آنکھوں کے امراض کا، ایک زخمیوں کا، ایک اسہال کے شکار مریضوں کا تھا، خواتین کے لئے الگ انتظام تھا۔ کھانا پکانے، دوا تیار کرنے، مرہم، سفوف اور تیل وغیرہ تیار کرنے کے لئے علیحدہ عمارتیں تھیں۔ اسپتال میں ایک مقام طب کی تعلیم کے لئے تھا، جہاں رئیس الاطبا بیٹھ کر درس دیتے۔

منصور نے اس بیمارستان پر مصر میں کئی جائدادیں، دکانیں، حمامات، سرائیں وقف کی تھیں، جن کی سالانہ آمدنی دس لاکھ درہم تھی، بیمارستان کے ساتھ مدرسہ اور یتیم خانہ بھی قائم کیا تھا۔ یہاں جو مریض داخل ہوتا شفایاب ہونے تک اس کے دوا علاج اسپتال کی جانب سے ہوتا، اور جاتے وقت ایک جوڑا اس کو عطا کیا جاتا، اور اگر شفایاب ہونے سے پہلے قید حیات سے چھٹکارا پا لیتا تو کفن دفن کا انتظام بھی اسپتال کی طرف سے کیا جاتا۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک وقت میں یہاں چار ہزار افراد کا علاج کیا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ اس جیسا بیمارستان روئے زمین پر موجود نہیں ہے، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اس کے محاسن بیان کرنے سے انسان عاجز ہے۔

8.8.12 مقبرے

عالم اسلام میں انبیا، صحابہ، اولیا، علما دین، بادشاہ، وزرا اور دیگر مشاہیر کی عالیشان قبریں تعمیر کرنے کا بھی رواج رہا، ان قبروں پر اونچے گنبد تعمیر کئے گئے، اور ان کے ساتھ خانقاہیں، مدرسے یا مساجد کی عمارتیں بھی ملحق کی گئیں۔ مسلم فن تعمیر کے نمونوں میں سمرقند میں تعمیر کردہ امیر تیمور کا مقبرہ گور امیر، ہرات میں شاہ رخ اور گوہر شاد کا مقبرہ، دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ، سمرقند میں ضریح قثم بن عباس وغیرہ اہم مقابر ہیں، ان تمام میں سب سے خوبصورت، جاذب نظر اور دلکش تاج محل ہے۔

8.8.13 تاج محل

فن تعمیر کی پیشانی کا جھومر، مغلیہ طرز تعمیر کا شاہکار، محبت کی لازوال نشانی تاج محل، جو شاہ جہاں نے اپنی چہیتی بیوی ممتاز محل (ارجمند بانو بیگم) کی وفات کے بعد تعمیر کرایا، اس کی تعمیر 1632 میں شروع ہوئی، اور 1653 میں اختتام کو پہونچی، بیس سال تک کام جاری رہا، سولہ ہزار مزدور روز آنہ کام کرتے، جن کے لئے ایک چھوٹا سا شہر بسایا گیا تھا، جس کا نام ممتاز آباد تھا۔ تاج محل آگرہ میں جمنا ندی کے کنارے ایک بہت بڑے احاطہ کے اندر واقع ہے، جس میں باب الداخلہ، مسجد اور مہمان خانہ شامل ہے، تاج محل کے سامنے باغات ہیں، بیچ میں صدر دروازہ سے تاج تک نہر چلی گئی ہے، جس میں تاج کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

تاج محل کی عمارت سفید سنگ مرمر سے بنے ہوئے مربع چبوترے پر قائم ہے، جس کے ہر ضلع کی چوڑائی 186 فٹ اور لمبائی 23 فٹ ہے، عمارت کے چاروں رخوں پر کمانیں بنی ہوئی ہیں، مرکزی کمان کی اونچائی 108 فٹ ہے، کناروں پر چھوٹی چھوٹی کمانیں بنی ہوئی ہیں، مرکزی گنبد کا قطر 58 فٹ ہے، اور بلندی 240 فٹ ہے، اطراف کے چار گنبدوں کی لمبائی 162.5 میٹر ہے، چبوترہ کے چاروں کونوں پر چار نازک مینار ایستادہ ہیں، تاج محل کے اندر سنگ مرمر پر جالیوں کا نازک کام ہے، جس کے اندر ممتاز محل اور شاہ جہاں کی قبریں ہیں۔ تاج محل کی دیوروں پر نفیس گلکاری کی گئی ہے، مینا کاری اور پچی کاری سے عمارت کی تزئین میں اضافہ کیا گیا ہے۔

تاج محل کا نقشہ استاد عیسی خاں نے تیار کیا تھا، خطاط کا نام امانت خاں شیرازی تھا، اور گنبد ساز اسماعیل خاں آفریدی تھے جن کا تعلق ترکی سے تھا، محمد حنیف راج مستریوں کے ذمہ دار تھے، شاعر غیاث الدین نے گنبد پر آیات کو کندہ کیا تھا، تاج کی تعمیر کے لئے خام مال چین، سری لنکا، تبت، وسط ایشا، اور ہندوستان کے مختلف شہروں راجستھان، فتح پور سیکری سے لایا گیا تھا، ایک ہزار ہاتھی خام مواد کو آگرہ تک پہونچانے کے لئے استعمال ہوئے تھے، لال پتھر فتح پور سیکری سے اور سفید سنگ مرمر راجستھان کے ضلع مکرانہ سے لایا گیا تھا، لاجورد، نیلم، فیروزہ، یشب، کرسٹل اور دیگر 28 قسم کے نایاب اور قیمتی پتھروں کو اس کی تزئین میں استعمال کیا گیا، تاج محل کی تعمیر میں 32 کروڑ روپئے خرچ ہوئے۔

چاندنی رات، صبح کا سہانا وقت یا شام کے دھندلکے میں تاج کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ بے مثال خوبصورتی فنکاری کی وجہ سے تاج محل کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔

8.8.14 معمار

اسلامی فن تعمیر کے شاہکاروں کو جریدہ عالم پر ثبت کرنے والوں کی عظمت خود ان نقوش سے ظاہر ہوتی ہے، کہ ان کے معمار اور فن کار کتنے ماہر ہوں گے، لیکن ان میں سے اکثر کے حالات دستیاب نہیں، انہی معماروں میں سلطنت عثمانیہ کے معمار خواجہ سنان پاشا بھی ہیں، جن کے بنائے ہوئے فن پارے عالم اسلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

8.8.15 سنان پاشا

سنان پاشا کا نام یوسف بن خضر بک تھا، اناطولیہ کے ضلع قیصریہ کے ایک گاں میں 895ھ/1489ء میں پیدا ہوئے، بچپن ہی سے باغوں میں پانی کی کیاریاں کھودنے، جانوروں کے گھر اور گھانس پھوس کے جھونپڑے تیار کرنے کا شوق تھا، طائر ہمت بلند تھا، اعلی تعلیم کے شوق اور مملکت میں اعلی منصب حاصل کرنے کے لئے فوج میں بھرتی ہوگئے، قسطنطنیہ منتقل ہوکر تعلیم حاصل کی، اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لئے فن معماری کے مدرسہ اوجاق میں داخلہ لیا، سلطان بایزید کے دور میں فوجی کاروائیوں میں حصہ لیا، عثمانی لشکر کے مراکز اور چھانیاں تعمیر کیں، پل، قلعے بنائے، جس کی وجہ سے سلیم اول کے دور میں اہم فوجی مناصب پر فائز ہوئے۔ سلیمان قانونی کے دور میں انہوں نے نہر بروت اور ڈینوب پر انتہائی کم مدت میں پل تعمیر کئے، ان میں سے پہلا پل صرف تیرہ دن کی قلیل مدت میں مکمل کیا۔ انجینئرنگ میں ان کی خدمات سے متاثر ہوکر سلیمان قانونی نے ان کو سلطنت عثمانیہ کا چیف انجینئر مقرر کیا تھا۔

سنان پاشا کی عبقریت اور صلاحیتیں ان کی تعمیر کردہ عمارتوں میں ابھر کر سامنے آتی ہیں، ان کی عمارتوں میں سلجوقی، یوروپی اور بیزنطینی طرز تعمیر کے اثرات ہیں، انہوں نے اناطولیہ میں سلجوقی طرز کی بے شمار عمارتوں کا مشاہدہ کیا، جب ینی چری افواج کے ساتھ یوروپ میں فوج کشی کی تو وہاں کی بلند و بالا اور ضخیم عمارتوں کا مطالعہ کیا، قسطنطنیہ میں بیزنطینی دور کی کئی عمارتیں قائم ہیں جن میں کنیسہ آیا صوفیہ بہت خوبصورت اور فن تعمیر کا نمونہ ہے، یہاں سے سنان پاشا نے بیزنطینی طرز تعمیر پر غور کیا۔ ان کے سب کے نتیجہ میں سنان پاشا نے ایک نئے طرز کی بنیاد رکھی، اور فن تعمیر کا نیا اسکول قائم کیا۔ انہوں نے ترکی، عالم اسلام اور سلطنت عثمانیہ کے دور دراز گوشوں میں 441 عمارتیں تعمیر کیں ہیں، جو ان کی عظمت اور مہارت کی شہادت دے رہی ہیں، ان میں 80 شاہی مساجد، 50 عام مساجد، کئی اسپتال، مدارس، حمامات، پل، قلعے، محلات، مقبرے شامل ہیں، جو اپنی مضبوطی، پائنداری، خوبصورت نقش ونگار، گلکاری، اور ڈیزائن کی وجہ سے نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ حلب میں مجمع خسرویہ، دمشق میں تکیہ سلیمانیہ، مسجد سنان باشا، حرم مکی کے گنبد، مدینہ اور بیت المقدس، بصرہ میں ان کی تعمیرات اسلامی اور ترکی طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔

سنان پاشا نے اپنی تعمیراتی زندگی کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا مرحلہ طالب علمی کا جس میں وہ سیکھ رہے تھے، دوسرا مرحلہ جس میں وہ پختہ کار ہو چکے تھے تیسرا مرحلہ جس میں وہ اس فن میں استاذی کے مرتبہ کو پہونچ چکے تھے، پہلے مرحلہ کی عمارتوں میں مسجد شاہ زادہ ہے، جو سلیمان قانونی نے بنوائی تھی، اس کی تعمیر 955ھ/1548ء میں چار سال میں مکمل ہوئی، اس مسجد کی عمارت اہرامی شکل کی ہے، جس میں مسجد کے ساتھ مدرسہ اور مہمان خانہ بھی شامل ہے، اس عمارت میں ہم کو گنبد کی تعمیر میں سنان پاشا کی اولین کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے، انہوں نے مرکزی گنبد کی تعمیر میں جدت اختیار کی، اور اس کو چار نصف گنبدوں سے چاروں طرف سے گھیر دیا، تاکہ مرکزی گنبد کی درمیانی وسعت مزید مرتکز ہوجائے۔ اس طرح انہوں نے گنبدوں کی تعمیر کی مشکلوں کو حل کیا۔ اس مسجد کے مرکزی گنبد کا قطر 19 میٹر اور بلندی 37 میٹر ہے۔

دوسرے مرحلہ کی عمارتوں میں جامع سلیمانیہ ہے، جو سنان پاشا کے مشہور فن پاروں میں سے ایک ہے، اس عمارت میں انہوں نے

جرت کے ساتھ نئی تکنیک استعمال کی، جس نے عثمانی اور اسلامی طرز تعمیر میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں، عمر کی سترویں دہائی میں انہوں نے اس مسجد کو ڈیزائن کیا، اور 964-957ھ/1557-1550ء کے درمیان سات سال میں یہ فن پارہ تیار ہو کر سامنے آیا۔ یہ مسجد بحر اسود کی شاخ زریں (Golden Horn) کے کنارے بلند ٹیلے پر قائم ہے، مسجد کے ساتھ فقرا کو کھانا کھلانے کی عمارت، اسپتال، طبیہ کالج، کتب خانہ، اعلیٰ تعلیم کے چار مدارس اور کئی دکانیں ہیں۔ مسجد کی پشت پر مقبرے میں سلطان سلیمان اور ان کی زوجہ کی قبر ہے، قریب ہی سنان پاشا کی قبر بھی موجود ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں خواجہ سنان نے متوسط سائز کے مرکزی گنبد کا نظام رکھا، جس کی بلندی 53 میٹر اور قطر 27 میٹر ہے، اس کے دونوں جانب اضافی گنبد ہیں، جن کو نصف گنبدوں کے ذریعہ مزید وسعت دی گئی ہے۔ مسجد کے چار طرف چار مینارے ہیں، اگلے دو میناروں کی لمبائی نسبتاً کم ہے، ان میں دو جھروکے ہیں، پچھلے دو مینار زیادہ لمبے ہیں، ان میں تین جھروکے ہیں۔ مسجد کا عظیم گنبد آواز کو پھیلانے اور گونج پیدا کرنے کا کام بھی کرتا ہے، اور چھوٹے گنبد بڑی آواز کو جذب کر کے مائک کا کام کرتے ہیں۔ مسجد کی کھڑکیوں میں رنگین شیشہ سے تزئین کاری کی گئی ہے۔

تیسرے مرحلہ کی عمارتوں میں سے جامع سلیمیہ ہے، جو سنان پاشا کے تمام کارناموں کا درشاہوار ہے، سلیمان قانونی کے فرزند سلطان سلیم ثانی نے اس کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ سنان پاشا نے ادرنہ شہر کے سب سے اونچے ٹیلہ کا انتخاب کیا، تاکہ مسجد پورے شہر سے نظر آسکے، اس کی تعمیر 976ھ/1568ء میں شروع ہوئی، اور چھ سال بعد 975ھ/1574 میں تکمیل کو پہونچی، اس وقت سنان پاشا عمر کی آٹھویں دہائی کو پہونچ چکے تھے۔ سنان پاشا اس کی تعمیر کے اسباب ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: عالم اسلام میں آیا صوفیا کی طرح کا بڑا گنبد نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے معمار مسلمانوں کو طعنہ دیتے تھے کہ وہ مسلمانوں سے کہیں فائق ہیں، کیوں کہ آیا صوفیا کے گرجا گھر کی طرح کا عظیم الشان گنبد بنانا بہت مشکل کام ہے، اس بات سے دل کو تکلیف ہوتی تھی، اسی وجہ سے میں نے ارادہ بنایا کہ سلطان سلیم خاں کی مسجد میں اپنی صلاحیت لگادوں، اللہ کی مدد اور سلطان کی ہمت افزائی سے میں نے اس مسجد کا گنبد آیا صوفیا کی مسجد سے چھ گز بلند اور چار گز گہرا تعمیر اکیا ہے۔

سنان پاشا نے اس پوری مسجد کو ایک گنبد کی چھت سے مسقف کیا ہے، جس میں نصف گنبدوں سے بھی مدد نہیں لی، اس گنبد کا قطر 31.25 میٹر ہے۔ مسجد کے چار نازک مینارے ہیں، جن کی بلندی 70 میٹر ہے، ان کا شمار دنیا کے بلند ترین میناروں میں ہوتا ہے، ہر مینار پر تین جھروکے ہیں، صدر دروازہ کی جانب جو دو مینار ہیں ان میں ہر جھروکے کے لئے علیحدہ سیڑھیاں ہیں۔ پچھلے میناروں کی تمام منزلوں کے لئے ایک ہی سیڑھی ہے، مسجد کا منبر سنگ مرمر سے تراشا گیا ہے۔

ان عظیم الشان اور زندہ جاوید کارناموں کے ساتھ سنان پاشا نے تذکرہ البنیان کے نام سے ایک کتاب بھی املا کرائی ہے، اور کئی شاگرد تیار کئے، جن میں احمد آغا، داود آغا، سنان صغیر، اور یوسف قابل ذکر ہیں۔ سنان پاشا نے طویل عمر پائی، اور زندگی کی سو بہاریں دیکھنے کے بعد 996ھ/1588ء میں وفات پائی۔

8.9 خلاصہ

اس اکائی کے مطالعہ سے ہم نے جانا کہ:

☆ فنون لطیفہ انسان کی تخلیقی مہارتوں کا نام ہے فن اور اخلاقیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

☆ مسلم فنکاروں نے نقاشی میں اہم خدمات انجام دیں، نباتی نقش نگاری اور ہندسی نقش نگاری کو اپنے فن پاروں میں برتا ہے۔ اس فن کی خصوصیت حرکیت اور امتداد ہے۔

☆ مسلمانوں نے خطاطی پر خصوصی توجہ دی، اور کئی خطوط ایجاد کئے۔ ابن مقلہ، ابن البواب اور یاقوت مستعصمی مشہور خطاط اور ماہرین فن تھے۔

☆ مصوری کی طرف بھی مسلمانوں نے توجہ دی، اور تیموری دور میں مصوری کو بہت فروغ ہوا، مشہور مصور کمال الدین بہزاد نے تیموری اور صفوی دور میں اپنا کمال دکھایا، اور نادر نمونہ تیار کئے۔

☆ ہندوستان میں مصوری کی سرپرستی مغل بادشاہوں نے کی، جہاں گیر کو اس فن کا نہایت عمدہ ذوق تھا۔

☆ موسیقی کے میدان میں مسلمانوں نے اہم کارنامے انجام دیے۔ کئی آلات اور راگ راگنیاں ایجاد کیں۔

☆ اہم موسیقاروں میں زریاب، کندی، فارابی اور امیر خسرو کا نام آتا ہے۔

☆ فن تعمیر مسلمانوں کا خاص فن رہا ہے، جس کے نمونوں میں مسجد، مینار، گنبد، حمام، بیمارستان، مقبرے اور شہر ہیں۔

☆ سنان پاشا عہد عثمانی کے باکمال معمار تھے، جن کے شاہکاروں میں ادرنہ کی مسجد جامع سلیمیہ ہے۔

8.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں تحریر کیجئے:

1۔ نقاشی کے میدان میں مسلمانوں کی حصہ داری کا جائزہ لیجئے۔

2۔ کمال الدین بہزاد کی شخصیت پر فن کے حوالہ سے روشنی ڈالئے۔

3۔ مسلمانوں میں موسیقی کے رواج سے گفتگو کرتے ہوئے زریاب کا تعارف کرائیے۔

4۔ مسلم فن تعمیر پر مساجد کے حوالہ سے روشنی ڈالئے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں تحریر کیجئے:

1۔ فن خطاطی میں ابن البواب اور یاقوت مستعصمی کی فنکاری پر تبصرہ کیجئے۔

2۔ ہندوستانی مصوری میں مسلمانوں کی حصہ داری پر گفتگو کیجئے۔

3۔ موسیقی میں امیر خسرو کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

4۔ فن تعمیر کے حوالہ سے سنان پاشا کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

8.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

الفن الاسلامی -التزام وابتداع	صالح احمد شامی	دارالقلم، دمشق، 1990
تاریخ الفنون واشہر الصور	سلامہ موسی	مسس ہنداوی للتعلیم والثقافہ،
الاسلام والفنون الجمیل	ڈاکٹر محمد عمارہ	دارالشروق، بیروت، 1991
التصویر وتجلیاتہ فی التراث الاسلامی	کلود عبید	المس الجامعیہ للدراسات والنشر والتوزیع، 2008
رحل الخط العربی من المسند لی الحدیث	احمد شوحان	اتحاد کتاب العرب، دمشق، 2001
الآثار والفنون الاسلامیہ	ڈاکٹر عبداللہ عطیہ	قاہرہ، 2005
العمارہ الاسلامیہ فی مصر	علیا عکاشہ	بردی للنشر، جیزہ، مصر۔2008
موسوعۃ عناصر العمار الاسلامیہ	مہندس یحیی وزیری	مکتب مدبولی، 1999
اسلام اور عربی تمدن	محمد کرد علی، ترجمہ: شاہ معین الدین ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، 2010
ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے	صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، 2009
ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	ثروت صولت	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی، 2012
عہد عباسیہ میں فن تعمیر کا ارتقا	ڈاکٹر غلام معین الدین	الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنو، 2007
عربوں کا فن تعمیر	ڈاکٹر غلام معین الدین	نظامی پریس، لکھنو، 1995
مختصر تاریخ ثقافت اسلامی	مولانا سید واضح رشید حسنی، ترجمہ: ڈاکٹر طارق ایوبی	علامہ ابوالحسن ندوی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن علی گڑھ، 2012

بلاک : 3 استشراق اور مستشرقین

فہرست

اکائی 9 : تحریک استشراق: آغاز وارتقاء، اغراض ومقاصد

اکائی کے اجزاء

9.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ استشراق کے لغوی اور اصطلاحی معنی سے واقف ہو جائینگے، اور استشراق کا مفہوم اور اس کی معنوی دلالت ان پر اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ وہ استشراق کی اجمالی تاریخ سے باخبر ہو جائیں گے اور انھیں استشراق کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات کا بھی علم ہو جائے گا۔ یہ اکائی انھیں استشراق کے محرکات ومقاصد سے بھی باخبر کرے گی۔

9.2 تمہید

لفظ استشراق علمی اور تعلیمی حلقوں میں ایک مانوس اور متداول لفظ ہے لیکن اس کے مفہوم کی حقیقی دلالت اور لفظ کے معنوی ابعاد سے کم لوگ ہی واقف ہے۔ استشراقی مطالعات نے اپنے وسیع وعمیق اثرات سے اہل مشرق کے زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کیا ہے۔ استشراق اجمالی طور پر مشرق کو سمجھنے کی مغرب کی کوشش کا نام ہے، استشراق مشرق کے علوم فنون، زبان ادب اور تہذیب وتمدن کے بارے میں مغربی مطالعات کا نام ہے، جو مختلف اغراض ومقاصد اور محرکات کے ساتھ کیے گئے ہیں، جن میں دینی سیاسی علمی اقتصادی اور استعماری مقاصد شامل ہیں، کچھ مطالعات حسن نیت کے ساتھ کیئے گئے، خواہ درست رہے ہوں یا غیر درست، لیکن کچھ پوری طرح سے بدنیتی پر مبنی تھے۔ ان مقاصد و

محرکات کے اختلاف کے پیش نظر استشراقی مطالعات اپنے آثارونتائج کے اعتبار سے بھی مختلف ہے۔

اگر استشراق نے ایک طرف اسلامی مطالعات کو نئی جہتیں، نئے اسالیب اور نئے مناہج سے روشناس کرایا ہے تو دوسری طرف تحریفات اور دسیسہ کاریوں کا ایک طویل سلسلہ بھی دیا ہے، اگر اس نے ایک طرف اسلامی میراث کی حفاظت وصیانت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے تو دوسری طرف اسی میراث سے مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔لہذا استشراقی مطالعات سے پہلے خود استشراق کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔اس میں ایجابیات بھی ہیں اور سلبیات بھی، نہ ایجابیات کی وجہ سے سلبیات کو قبول کرنا چاہئے اور نہ سلبیات کے سبب ایجابیات کورد کرنا چاہئے۔اور ہمیں ان مطالعات میں ''خذ ماصفاودع ماکدر'' کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

9.3 استشراق کا لغوی معنی اور مفہوم

استشراق عربی زبان کے لفظ''شرق'' سے مشتق اور ماخوذ ہے اور شرق کا مطلب ہے''مشرق الشمس''یعنی وہ سمت جدھر سے سورج نکلتا ہے۔لفظ''استشراق'' مصدر ہے اور''استفعال'' کے وزن پر ہے'اور اس کی اصل ش رق ہے۔جس میں الف سین اور تاء کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو عربی زبان میں طلب کرنے اور حالت کے تبدیل ہونے کا معنی دیتا ہے۔مثلاً استغفر اللہ کا معنی ہوا میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور استحجر الطین کا مطلب ہے کہ مٹی پتھر میں تبدیل ہوگئی۔ استشراق کا معنی ہوا''مشرق کی طلب''اور مشرق کی طلب اس کے علوم ومعارف، افکار و نظریات، مذاہب وادیانات، تہذیب وثقافت اور زبانوں وبولیوں کی طلب کی صورت ہی میں ہوگی۔لہذا اس اعتبار سے استشراق کا لغوی معنی ہوا مشرق یا عالم مشرق کا علم۔اس مادے (ش رق) سے شروق'اشراق اور تشریق وغیرہ بھی بنتے ہیں جن میں طلوع، ظہور، روشن ہونے اور روشن کرنے وغیرہ کے معانی بھی پوشیدہ ہیں۔

استشراق کے مقابلے میں انگریزی اور یوروپین زبانوں میں Orientalism کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس لفظ کی تفہیم بھی استشراق کے معنی کی تعیین میں مددگار رہوتی ہے'Orient کا معنی ہے مشرق اور یہ لفظ لاطینی زبان کے لفظ "Oriens" سے بنا ہے جو شروق (Rising) کے معنی پر مشتمل ہے۔لاطینی زبان کے اس لفظ کا استعمال کسی چیز کے علم اور اس کی طلب کے لیے بھی ہوتا ہے۔فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں Orientation کا لفظ رہنمائی وتربیت اور ہدایت وارشاد کے لیے بھی ہوتا ہے۔بالخصوص فکری اور روحانی تربیت کے لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ مشرق ہمیشہ سے روحانی واخلاقی علوم وافکار کا سرچشمہ رہا ہے۔اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہی یوروپین زبانوں میں مشرق کے لیے Morgeland کا استعمال ہوتا ہے کہ جس کا معنی ہے صبح'نور اور بیداری کی زمین اور اس کے مقابلے میں مغرب کے لیے Abend Land کا استعمال کیا جاتا ہے۔جس کے معنی ہین تاریکی اور راحت کی زمین۔

لفظ Orient اور Morgeland کے ساتھ ساتھ مشرق کے لیے مغربی زبانوں میں ایک اور لفظ ملتا ہے وہ ہے "Levant" یہ لفظ بھی لاطینی اصل ہے اور اس کا معنی ہے اٹھانا(Lift) اور بلند کرنا(Raise) یہ لفظ بحیرہ روم (Mediterranean Sea) سے مشرق میں واقع خطہ زمین کے لیے بولا جاتا تھا جہاں سورج نکلتا ہے اور جدھر سے صبح آتی ہے۔

اہل مغرب نے مشرق یا شرق کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔(1) شرق قریب (2) شرق اوسط (3) شرق بعید۔

1. شرق قریب یا شرق ادنی (The Near East) اس میں مراقش الجزائر تیونیشیا اور لیبیا وغیرہ شامل ہیں۔

2. شرق اوسط (The Middle East) اس میں مصر، شام جزیرۂ عرب، ترکی، ایران اور عراق وغیرہ شامل ہیں۔

3. شرق بعید (The Far East) اس میں برصغیر سے لے کر بحرالکاہل تک کے مشرقی ممالک آتے ہیں۔

9.4 مشرق کا جغرافیائی مفہوم

استشراق کے لغوی و مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مشرق کے جغرافیائی اور تہذیبی مفہوم کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اگر ہم مشرق کی مندرجہ بالا تقسیم میں غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ مطالعہ استشراق میں مشرق سے مراد پوری طرح سے جغرافیائی مشرق نہیں ہے، کیونکہ شرق ادنی کے بعض ملک بیشتر مغربی ملکوں سے بھی زیادہ مغرب میں واقع ہیں اور شرق ادنی واوسط کے اکثر ملک یوروپ کے مقابلے میں مشرق میں نہیں بلکہ جنوب میں واقع ہیں۔ اور آسٹریلیا کے مقابلے میں پورا وطن عربی اور عالم اسلام شمال مغرب میں واقع ہے۔ علاوہ ازیں مشرق کا جغرافیائی مفہوم ایک اضافی امر ہے جو مختلف ملکوں کے محل وقوع کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً عراق ایران کے مقابلے میں مغرب میں اور شام کے مقابلے میں مشرق میں واقع ہے۔

9.5 مشرق کا تاریخی وتہذیبی مفہوم

مطالعہ استشراق میں لفظ مشرق کے لغوی اور جغرافیائی مفہوم سے زیادہ اس کا تاریخی اور تہذیبی مفہوم غالب ہے اور اسی تاریخی اور تہذیبی مفہوم کی رعایت کے ساتھ اہل مغرب نے استشراق کا استعمال کیا ہے۔ مشرق کے تاریخی مفہوم میں ایشیا اور شمالی افریقہ کے وہ ممالک شامل ہیں جو بحیرۂ روم کے مشرق اور جنوب میں واقع ہیں پھر مختلف ادوار میں مشرق کے معنی میں توسع پیدا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ایشیا اور افریقہ کے تمام ممالک اس میں داخل ہو گئے۔ نو آبادیاتی عہد میں اہل یورپ مغرب سے خود کو مراد لیتے تھے اور مشرق سے ان کی مراد وہ نو آبادیات تھیں جو ایشیاء و افریقہ میں واقع تھیں، مشرق و مغرب کی تقسیم میں رنگ و نسل بھی ایک اہم عامل تھے۔ آرین نسل اور سفید فام لوگ مغرب کے نمائندے بن گئے جب کہ رنگ دار اور سیاہ فام نسلیں مشرق کی نمائندہ قرار پائیں۔ مغرب و مشرق کے تعین میں مذہب، زبان اور تہذیب کا بھی نمایاں رول رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نو آبادیاتی قوتیں یا ان میں سے اکثر و بیشتر مذہب، زبان اور تہذیب سب میں مشترک یا باہم قریب تھیں جب کہ ایشیا اور افریقہ کے رہنے والے باہم تہذیبی اور ثقافتی طور پر قریب تھے۔

مشرق و مغرب کے اس قریب العہد مفہوم سے قطع نظر مشرق و مغرب کی اس تقسیم کی جڑیں عہد استعمار سے بہت پہلے کے تاریخی وتہذیبی تصادم تک پہنچتی ہیں۔ ماضی قدیم سے دنیا میں دو بڑی قوتیں رہی ہیں اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں صدیوں تک مصروف رہی ہیں۔ ان میں سے ایک مشرق کی نمائندگی کرتی تھی اور دوسری مغرب کی۔ جیسے فارس اور روم، اول الذکر مشرق کی نمائندہ تھی جبکہ مؤخر الذکر مغرب کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں اور رومیوں کا تصادم پیش آیا۔ صلیبی جنگوں کے وقت یہ تصادم اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ جس میں مسلمان مشرق کی اور رومی یا صلیبی جنگجو مغرب کی نمائندگی کرتے تھے۔ پھر خلافت عثمانیہ اور یوروپ کا باہمی ٹکراؤ اور اخیر میں

استعماری قوتوں اور ان کی نو آبادیوں میں رہنے والوں کے درمیان کی کشمکش' یہ سب مشرق کے تہذیبی مفہوم کو متعین کرنے میں مددگار ہوتے ہیں ۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق کا صرف جغرافیائی مفہوم اس سلسلے میں ہماری مدد نہیں کرتا۔ آسٹریلیا اپنے محل وقوع کے اعتبار سے مشرق بعید میں واقع ہونے کے بعد بھی صرف نسلی اور تہذیبی اشتراک کی وجہ سے مغرب کا حصہ مانا جاتا ہے۔ البتہ اگر مشرق کے جغرافیائی مفہوم کی رعایت کے ساتھ ساتھ ہم عادات ورسوم، بود وباش کے طریقے اور دینی وتہذیبی ولسانی قربتوں کا بھی لحاظ رکھیں تو استشراقی مطالعے میں مشرق کا مفہوم بڑی حد تک متعین ہو جاتا ہے۔

9.6 استشراق کا اصطلاحی معنی اور تعریف

استشراق کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں جو عموماً تعریف کرنے والے کے ذوق ومشرب اور علمی وفکری رجحان کی ترجمانی کرتی ہیں۔ استشراق ومستشرق کی چند تعریفات حسب ذیل ہیں:

9.6.1 میکسم روڈنسن (Maxime Rodenson)

''مطالعہ مشرق کے لیے علم کی مخصوص قسم کا نام استشراق ہے۔'' (میکسم روڈنسن Maxime Rodenson)

9.6.2 (میکلانجلو جویدی Michelongelo Guedi)

''استشراق مشرق کی اس روحانی اور ادبی قوت کے مطالعے کا نام ہے جس نے انسانی تہذیب کی تشکیل اور تعمیر میں زبردست اثر ڈالا ہے۔ مشرق کے بعض علاقوں اور مشرق وسطیٰ کی قدیم تہذیبوں کا مطالعہ بھی استشراق کہلاتا ہے۔''

(میکلانجلو جویدی(Michelongelo Guedi)

9.6.3 مالک بن نبی

''ہمارے نزدیک مستشرقین سے مراد وہ مغربی مصنفین ہیں جو اسلامی فکر وتہذیب کے بارے میں لکھتے ہیں۔'' (مالک بن نبی)

9.6.4 منیر بعلبکی

''مشرقی زبانوں، فنون اور تہذیبوں کا مطالعہ کرنے والا مستشرق کہلاتا ہے۔'' (منیر بعلبکی)

9.6.5 ایڈورڈ سعید (Edward W. Said)

''استشراق' مشرق پر تسلط پانے اور اس پر اقتدار حاصل کرنے کے مغربی اسلوب کا نام ہے۔''

ایڈورڈ سعید (Edward W. Said)

9.6.6 محمود زقزوق

''عالم مشرق کے علم کو استشراق کہتے ہیں۔ اس کے دو معنی ہیں' عام اور خاص۔ عام معنی میں استشراق کا اطلاق مشرق سے متعلق ان تمام مطالعوں پر ہوتا ہے جو کسی مغربی عالم کے ذریعے ہو' خواہ وہ مطالعہ مشرق بعید کا ہو' مشرق اوسط کا ہو یا مشرق قریب کا' خواہ وہ مطالعہ مشرق کی

زبان وعادات سے متعلق ہو، یا تہذیب و ادیان سے متعلق ہو۔ اور خاص معنوں میں استشراق کسی بھی مغربی اسکالر کے ان مطالعوں کو کہتے ہیں جو مشرق اسلامی کی زبانوں، عادتوں، تاریخ اور عقیدے سے متعلق ہو۔" (محمود زقزوق)

9.6.7 احمد عبدالحمید غراب

"استشراق ان اکیڈمک مطالعات کو کہتے ہیں۔ جو غیر مسلم مغربی بالخصوص اہل کتاب اسکالرز کرتے ہیں اور جن کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے ہوتا ہے۔ جیسے: عقیدہ، شریعت، تہذیب وتمدن، تاریخ ونظام حکومت، دولت وثروت اور مستقبل کے امکانات وغیرہ، اور ان کا مقصد اسلام کی صورت کو مسخ کرنا، اسلام کے تئیں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنا اور انہیں مغربی افکار ونظریات کا تابع بنانا ہے۔ اور اس تبعیت کو ان نظریات اور افکار کے حوالے سے جائز قرار دینا جو مشرق اسلامی پر مسیحی مغرب کی نسلی اور تہذیبی برتری کے قائل ہیں۔

(احمد عبدالحمید غراب)

9.6.8 مستشرق آربری

"مستشرق وہ ہے جو مشرقی زبانوں اور آداب کا ماہر ہو۔" (مستشرق آربری)

9.6.9 عبدالوہاب حمودہ

"مستشرق"، ہر وہ مغربی شخص ہے جو مشرق کی کسی زبان کے مطالعے کے لیے خود کو وقف کردے، جیسے فارسی، ترکی، ہندی یا عربی وغیرہ اور اس کے ادب کی گہرائی سے جانچ کرے، تاکہ اس کے ذریعہ وہ اس مشرقی قوم یا اقوام کے اخلاق وعادات، علوم وآداب اور تاریخ ومذاہب کی معرفت حاصل کرسکے۔" (عبدالوہاب حمودہ)

9.6.10 مرکز مدینہ برائے استشراقی مطالعات

"استشراق اہل مغرب اور امریکہ کے ذریعہ صادر ہونے والے تمام فکری اور نشریاتی اعمال اور وہ سیاسی اور جاسوسی رپورٹیں ہیں جن کا تعلق اسلام اور مسلمانوں کے امور سے ہے۔ جیسے عقیدہ وشریعت، سماج وسیاست اور فکر وفن وغیرہ۔ ہم استشراق سے ان تحریروں کو بھی ملحق کرسکتے ہیں جو عرب کے وہ قبطی اور مارونی عیسائی وغیرہ لکھتے ہیں جو اسلام کو مغربی چشمے سے دیکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مسلم اسکالرز اور مصنفین کی کتابوں اور مقالات کو بھی استشراق سے ملحق کرسکتے ہیں جنہوں نے مستشرقین سے تعلیم پائی ہے اور ان کے افکار کے حامل ہیں۔"

ان تعریفات کا تجزیہ کرنے سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں: پہلی بات تو یہی ہے کہ مشرق کی جغرافیائی تحدید میں ہونے والے اختلاف کا ان تعریفات پر اثر پڑا ہے۔ کئی تعریفات میں استشراق کو صرف زبانوں اور آداب کے مطالعوں میں منحصر کیا گیا ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ استشراق کے غالب رنگ کی ترجمانی کرتی ہیں حقیقت کی نہیں۔ علاوہ ازیں جن حضرات نے استشراق کو عرب اور اسلام سے متعلق مطالعوں تک محدود کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے استشراق کے دائرے میں مشرق ومغرب کا خیال کیے بغیر غیر مسلموں کے ذریعے کیے گئے تمام مطالعوں کو استشراق قرار دے دیا ہے حتی کہ عام استشراق کی نہج پر کام کرنے والے مسلمانوں کو بھی اسی زمرے میں رکھ دیا ہے۔ ان تعریفات

میں نہ تو لفظ استشراق کے مادے کی رعایت ملتی ہے اور نہ ان مطالعات کی طرف التفات نظر آتا ہے جن کا تعلق اسلام، مسلمانوں اور عرب سے نہیں ہے جیسے انگریز مستشرقین کا ہندوستانی زبانوں اور قوموں کا مطالعہ یا جرمن مستشرقین کا سنسکرت زبان اور قدیم ہندوستانی افکار ونظریات کا مطالعہ۔ لہذا ان تعریفوں کو خالص علمی تعریفات نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس طبقے کی بیشتر تحقیقات اور مطالعوں کا تعلق عرب اور اسلام سے ہے اور ایک عرصے تک تحریک استشراق کی ترکیز وتوجہ کا مرکز عرب اور اسلام رہے ہیں اور زمانے تک یہ تحریک صلیبی دراندازوں کے شانہ بشانہ رہی ہے۔ مستشرقین کی تحریروں کی کاٹ صلیبی حملہ آوروں کی تلوار کی کاٹ سے کم نہ تھی۔ اس تحریک کا دائرہ صلیبی جنگوں کے بعد ہی وسیع ہوا ہے۔ بلکہ بعض آراء کے مطابق صلیبی حملوں کی ہزیمت کے بطن سے ہی اس تحریک کی پیدائش ہوئی ہے۔ اور اس کا بنیادی مقصد مغرب میں اسلام کے خلاف نفرت اور خود مسلمانوں میں اس کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے۔

استشراق کی تعیین اور تحدید میں یہ امر بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں نسلی عنصر بے حد قوی ہے۔ چنانچہ سفید فام آسٹریلیا، جغرافیائی اعتبار سے مشرق بعید میں واقع ہونے کے باوصف استشراقی مطالعے میں اسے مغرب میں شمار کیا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا تعریفات کی روشنی میں تحریک استشراق پر متعدد الزامات عائد کیے جاتے ہیں جیسے: عالم مشرق پر غلبہ واقتدار حاصل کرنے کی کوشش، استعماری قوتوں اور مشنریز کی مہمات کی حمایت اور نسل پرستی وغیرہ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ استشراق سے ان الزامات کی مکمل نفی ممکن نہیں ہے اور نہ ہی یہ سارے الزامات تمام مستشرقین پر عائد ہوتے ہیں۔

لہذا استشراق کی ایک ایسی علمی اور اکیڈمک تعریف کی ضرورت ہے جو پوری طرح سے جامع ومانع ہو اور استشراق ومستشرقین کی تمام انواع اور اقسام کو شامل ہو۔

جامع تعریف: غیر سفید فام مشرق کے بارے میں اہل مغرب کے مطالعات، خواہ ان کا تعلق کسی بھی موضوع سے ہو اور چاہے وہ کسی بھی مقصد کے تحت کیے گئے ہوں۔

9.7 تاریخ استشراق

استشراق کے آغاز وابتدا کے بارے میں کوئی بھی قطعی اور حتمی دلیل موجود نہیں ہے۔ جن حضرات نے استشراق کی تاریخ رقم کی ہے وہ سب اس کی ابتدا کے موضوع پر باہم مختلف ہیں۔ بعض اہم آراء حسب ذیل ہیں:

1. استشراق کا آغاز قبل میلاد ہوا۔
2. استشراق کی ابتدا مسلمانوں اور نجران کے نصاریٰ کے باہمی ربط وملاقات سے ہوئی۔
3. نبی اسلام ﷺ کے ان خطوط سے استشراق کا آغاز ہوا جو معاصر بادشاہوں کو بھیجے گئے تھے۔
4. بعض حضرات کی رائے میں استشراق کا نقطۂ آغاز پادری یوحنا دمشقی (676-749ء) کی اسلام دشمن کتاب ہے۔
5. ایک رائے کے مطابق جب اہل مغرب نے اندلس میں مسلمانوں سے اخذ واستفادہ شروع کیا تو وہیں سے استشراق کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر

مصطفیٰ سباعی سمیت متعدد ماہرین کا یہی نقطہ نظر ہے۔

6. ایک قوی موقف یہ ہے کہ استشراق کا آغاز صلیبی جنگوں میں اہل مغرب کی ہزیمت سے ہوا۔ یہ جنگیں تقریباً دو صدیوں (1291-1095ء) تک چلتی رہیں۔ اس ہزیمت نے مغرب کو اسلام کے مطالعے کی طرف متوجہ کیا تا کہ ان مقاصد کو قرطاس وقلم کے ذریعہ حاصل کیا جا سکے جنہیں تلوار و ڈھال سے حاصل نہیں کیا جا سکا۔ اس رائے کی تائید اس وثیقے و دستاویز سے بھی ہوتی ہے جس میں فرانسیسی بادشاہ لوئس کی وصیت بھی شامل ہے۔ اس وصیت میں مسلمانوں کے خلاف فکری جنگ برپا کرنے کو کہا گیا ہے۔ یہ بادشاہ آٹھویں صلیبی حملے کا قائد تھا۔

7. کچھ ماہرین کے خیال میں استشراق کی ابتدا ویانا کی کلیسائی اکیڈمی کے اس حکم سے ہوئی جس میں پیرس، آکسفورڈ وغیرہ مغربی تعلیمی اداروں میں عربی، عبرانی اور سریانی وغیرہ زبانوں کی تعلیم کے لیے باضابطہ چیئر قائم کرنے کو کہا گیا۔ لیکن پی۔ ایم۔ ہالٹ (P.M. Holt) کے مطابق یہ پاپائی حکم استشراق کا آغاز نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

8. بعض حضرات استشراق کا آغاز بارہویں صدی میں مانتے ہیں جب کہ استشراقی عمل کا باضابطہ ظہور ہوا، قرآن کا ترجمہ ہوا اور عربی کی ڈکشنری تیار کی گئی۔

9. استشراق کے آغاز سے متعلق ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ مصر پر نپولین کے حملے (۱۷۹۸-۱۸۰۱ء) ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نو آبادی اور سیاسی استشراق کی عملی ابتداء ہے۔

استشراق کے آغاز کے حوالے سے ان تمام اختلافات کے باوجود ہم اس کے ظہور و ارتقاء کو مندرجہ ذیل چند مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

9.7.1 پہلا مرحلہ:

اس مرحلے کو ہم مشرق سے مغرب کے تلمذ اور شاگردی کا مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ مرحلہ صلیبی جنگوں تک جاری رہا۔ اس کی بعض نمایاں خصوصیات اور امتیازات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ اسلامی اندلس کی طرف اہل مغرب کے علمی اسفار۔ یہ علمی اسفار دو قسم کے تھے انفرادی اور اجتماعی:

اول: انفرادی اسفار:

حصول علم کے یہ اسفار انفرادی نوعیت کے تھے اور انہیں مجموعی طور پر زمانی سبقت بھی ہے۔ انفرادی حیثیت سے علمی سفر کرنے والوں میں زیادہ تر عیسائی پادری ہوا کرتے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں نام جربرٹ آف آری لیک (Gerbert of Aurillac 916-1003) کا ہے۔ جنہوں نے قرطبہ اور جامعہ قرویین (فاس، مراکش) سے عربی زبان، ریاضیات اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور پھر یوروپ میں ان علوم کے فروغ میں حصہ لیا، اور 999ء میں سلوسٹر دوم (Sylvester II) کے نام سے پاپائے روم کے منصب کے لیے منتخب ہوئے انہیں کے ذریعہ اہل یوروپ ارسطو اور اس کے افکار سے واقف ہوئے۔ انفرادی علمی سفر کرنے والوں میں ایک اہم نام پیٹر محترم (Peter the

(Venerable 1092-1156 کا بھی ہے۔اسلام اور اسلامی عقیدے سے متعلق تفصیلی کتابیں انہوں نے ہی لکھیں جس سے یوروپ اسلام سے واقف ہوا۔اس ضمن میں ایک بڑی شخصیت جیرارڈ ڈے کریمونا (Gerard de Cremona 1114-1187) کی بھی ہے۔انہوں نے بھی اندلس میں تعلیم حاصل کی۔جیرارڈ نے متعدد عربی کتابوں کو اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ان میں بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جو بنیادی طور پر یونانی میں لکھی گئی تھیں لیکن نہ تو یونانی میں باقی رہ گئی تھیں اور نہ ہی لاطینی زبان میں ان کا کوئی ترجمہ دستیاب تھا۔اندلس اور عالم اسلام کے دیگر مراکز کی طرف انفرادی نوعیت کے تعلیمی سفر کرنے والوں کی یہ فہرست بہت طویل ہے اور انہیں لوگوں کے ذریعے درحقیقت یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی گئی۔

دوم: علمی وفود:

یہ انفرادی کوششوں کے مقابلے میں زیادہ منظم اور نتیجہ خیز تھے یہ وفود یوروپ کی حکومتوں اور وہاں کے مختلف اداروں کے زیر اہتمام اندلس کی جامعات اور تعلیم گاہوں کو روانہ کیے جاتے تھے تاکہ ان وفود کے افراد وہاں عربی زبان اور مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کر کے یوروپ میں علم کی روشنی پھیلائیں۔ان میں کچھ وفود ایسے بھی تھے جن میں یوروپ کے شاہی خاندانوں کے افراد بھی شریک تھے ایسے وفود میں سے ایک وفد کی قیادت شہنشاہ فرانس لوئیس ششم کی خالہ زادہ شہزادی الزابیتھ نے کی تھی۔ایک دوسرے وفد میں پرنس آف ویلز کی بیٹی شہزادی ڈوبان بطور سربراہ کے شریک تھیں۔ان وفود میں طلبہ کی تعداد الگ الگ ہوتی تھی بعض وفد سینکڑوں طلبہ پر مشتمل ہوتے تھے۔

ب۔ اسلامی اور مغربی ممالک کے درمیان سفارتیں:

یوروپین ملکوں نے ان سفارتوں کے ذریعے عالم اسلامی سے کافی استفادہ کیا۔ان سفارتوں کا آغاز ابوجعفر منصور عباسی (متوفی 755ء) کے عہد سے ہو گیا تھا۔ہارون رشید (۷۶۳-۸۰۹ء) اور چارلی مین (Charlemagne 742-814) کے درمیان قائم سفارت کو تاریخ میں بڑی شہرت ملی ہے ایک بار ہارون نے اپنے سفیر کے ذریعے چارلی مین کو ایک گھڑی تحفے میں بھیجی جس میں سے ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔چارلی مین نے سمجھا کہ اس میں کوئی عفریت یا جن پوشیدہ ہے۔

اندلسی خلیفہ عبدالرحمٰن سوم (891-961ء) اور یوروپ کے حکمرانوں کے درمیان ہونے والی سفارتوں کو بھی تاریخی طور پر بڑی شہرت حاصل ہے۔یوروپ نے ان سفارتوں سے بہت کچھ سیکھا اور ان کے ذریعہ ہر دو علمی اور تہذیبی سطح پر عرب اور مسلمانوں سے کافی کچھ اکتساب کیا۔

ج: تحریک ترجمہ:

اس مرحلے کی ایک اہم اور نمایاں خصوصیت ترجمے کی تحریک بھی ہے۔اس تحریک کے ذریعے عربی اسلامی علوم کو یوروپ کی مختلف زبانوں بالخصوص لاطینی اور اسپینی زبانوں میں بڑے پیمانے پر منتقل کیا گیا۔اس کے لیے مدرسے قائم کیے گئے۔دفتروں کا قیام عمل میں آیا اور مترجمین کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔اس تحریک کو عیسائی حکمرانوں اور کلیسا کی سرپرستی حاصل تھی۔صقلیہ (سسلی) اور اندلس اس تحریک کے دو اہم مرکز تھے۔ترجمے کی یہ تحریک الفانسو ششم کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔اس نے پادری ریمونڈ کی نگرانی میں ترجمہ کا ایک بڑا دفتر طلیطلہ میں

قائم کیا۔ جس میں مترجمین کی کئی کمیٹیاں کام کرتی تھیں۔ یہ کمیٹیاں مختلف علوم وفنون سے متعلق ہوتی تھیں۔ طلیطلہ کے اس دفتر ترجمہ نے سینکڑوں عربی کتابوں کو اسپینی اور لاطینی میں منتقل کیا' ان کتابوں میں یونانی سے ترجمہ شدہ کتابیں بھی تھیں اور عربی کی طبع زاد کتابیں بھی۔ چونکہ طلیطلہ ایک طویل عرصے تک مسلمانوں کے زیر اقتدار رہ چکا تھا لہذا یہاں کے کتب خانوں میں بے حد نایاب علمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ سسلی میں بھی ترجمے کے مراکز و مدارس قائم تھے جہاں اسلامی عہد کے علمی کاموں کا لاطینی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ زیادہ اہتمام ریاضیات' فلکیات' طبعیات' طب اور فلسفہ کی کتابوں کے ترجمے کا ہوتا تھا۔ بعد میں یہی ترجمہ کردہ کتابیں یوروپ کی جامعات اور مدارس میں تعلیمی نصاب کا حصہ نبیں جہاں سولہویں بلکہ سترہویں صدی تک ان کی تدریس ہوتی رہی۔ ترجمے کی یہ تحریک گیارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی اور تیرہویں صدی کے آخر تک جاری رہی۔ اس تحریک کے زیر اثر قرآن کریم کا بھی پہلا ترجمہ ہوا۔ یہ ترجمہ انگریز پادری ہرمین نے 1143ء میں کیا تھا' لیکن کلیسا کے خوف سے وہ اپنے اس کام کو ظاہر نہیں کر سکا اور یہ ترجمہ پہلی بار 1543ء میں منصۂ شہود پر آیا۔

اہالیان اسپین:

اسپین کے اصل باشندے اسلامی تہذیب وثقافت اور علوم وفنون سے مستفید ہونے والے تمام اہل یوروپ کے پیشرو تھے۔ کیونکہ ان کی نظروں کے سامنے ہی اسلامی اندلس کی تہذیب کی ابتدا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تہذیب دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب بن گئی تھی، اندلس کے قدیم باشندوں پر اس نو ساختہ و پرداختہ تہذیب کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد مسلم تہذیب میں رچ بس گئی۔ انہوں نے عربی زبان سیکھی اور عربی علوم وفنون سے استفادہ کیا۔ بلکہ ان میں سے ایک بڑی تعداد بالخصوص نوجوان اپنی بودو باش اور نشست و برخاست میں پوری طرح سے عربوں کے رنگ میں رنگ گئے۔ عربی زبان وادب میں دلچسپی لینے لگے اور عربی شاعری کے دلدادہ ہو گئے۔ کئی پادریوں اور راہبوں نے اسپین کے عیسائی نوجوانوں کے اس طرز عمل کی تنقید و مذمت بھی کی ہے۔ یہ مستعرب طبقہ استشراقی تاریخ کے اس مرحلے کا ایک اہم حصہ ہے۔

9.7.2 دوسرا مرحلہ:

یہ مرحلہ اپنے نتائج وآثار کے اعتبار سے سب سے اہم مرحلہ ہے۔ جس کا آغاز صلیبی جنگوں کے بعد ہوتا ہے۔ استشراق کے اس مرحلے پر صلیبی جنگوں کی ہزیمت نے گہرا اثر ڈالا۔ مغرب نے اس عسکری ہزیمت کے بعد فکری حملوں کی تیاری شروع کردی۔ لہذا استشراق کا کردار بے حد اہم ہو گیا اور اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی۔ مغرب اپنے جن مقاصد کو اسلحوں اور جانبازوں کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکا اسے حاصل کرنے کے لیے استشراق کا استعمال کیا اور اس امر کی تائید آٹھویں صلیبی حملے کے قائد شہنشاہ فرانس کی اس وصیت سے ہوتی ہے جس میں اس نے اپنی قوم اور تمام اہل مغرب کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ فکر ونظر کے میدان میں مسلمانوں کو شکست دیے بغیر انہیں جنگ وجدل کے میدانوں میں شکست نہیں دی جا سکتی ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا۔

استشراقی تاریخ کے اس مرحلے کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یوروپ کے اکثر ملکوں میں عربی تعلیم کے مراکز کھولے گئے۔ چنانچہ 1311ء پوپ کلیمنٹ پنجم (Clement V) کی قیادت میں ویانا میں ہونے والی کانفرنس میں یہ قرارداد پاس ہوئی کہ پیرس'

آکسفورڈ اور دوسرے یوروپین شہروں میں عربی زبان کی تدریس کا انتظام کیا جائے چنانچہ اس کے بموجب یوروپ کے کئی تعلیمی اداروں میں عربی زبان کی چیئرز قائم کی گئیں۔اس مرحلے میں ان لاطینی کتابوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا جو پچھلے مرحلے میں عربی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ اورعربی زبان سے ترجے کی تحریک نے مزیدزور پکڑا۔اسلام اورعرب کی مخالفت میں مزید شدت پیدا ہوئی۔

اس مرحلے میں عربی سے ترجمہ کی گئی کتابیں یوروپی جامعات میں مصادرومراجع کی حیثیت سے داخل ہوئیں۔اس مرحلے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اہل مغرب نے اس مرحلے میں مسلمانوں کی علمی اور ثقافتی میراث میں دلچسپی لینا شروع کیا۔

9.7.3 تیسرامرحلہ:

یہ مرحلہ اٹھارویں صدی سے شروع ہوا۔اور یہ مرحلہ عملی تنظیم سے عبارت ہے۔گزشتہ دومرحلوں میں استشراق پوری طرح سے کلیسا کی گود میں تھا لیکن اس مرحلے میں یہ کلیسا سے نکل کر نوآبادیاتی طاقتوں کے زیرسرپرستی آگیا۔اوراس مرحلے کے استشراق کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے۔اس مرحلے کی ابتداء میں مغرب نے مشرق پر اپنے قبضہ واقتدار کا پروگرام بنایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے استشراقی مطالعات سے خوب خوب استفادہ کیا۔اس مرحلے میں نسل پرستی پر مبنی نظریات وافکار نے بھی عروج پایا۔اوران میں سب سے مشہور نظریہ مستشرق رینان(Renan) کا تھا۔رینان کا پورانام (Joseph Ernest Renan) تھا۔یہ فرانسیسی نژاد مستشرق 1823ء میں پیدا ہوا۔اور 1892ء میں اس کی وفات ہوئی۔اس کے اس نسل پرستانہ نظریہ کا خلاصہ یہ تھا کہ نسلی خصوصیات طبعی اور حتمی ہوتی ہیں اور آرین نسل سب سے برتر نسل ہے۔سفید فام کو سیاہ فام اور رنگ دار نسلوں پر فطری تفوق و برتری حاصل ہے۔اس نظریے کے لیے اس کی تنقید بھی ہوئی اور نوآبادیاتی نظام کو اس سے تقویت بھی حاصل ہوئی۔

اس مرحلے کی ایک نمایاں بات یہ بھی ہے کہ اس میں استشراق منظم ہوا۔چنانچہ مختلف استشراقی اداروں اور تعلیمی مراکز سے استشراقی جرنل اور میگزین نکلنے لگے۔اس مرحلے میں مشرق کے علمی خزانوں اور تہذیبی سرمایوں کی یوروپ منتقلی بھی عمل میں آئی۔یہ سرمایہ بیش قیمتی مخطوطات' دستاویزات' اور دستکاری اور ہنرمندی کے نمونوں کی شکل میں تھا یہ سرمایہ مختلف طریقوں اور وسیلوں سے مغرب کے عوامی اور ذاتی کتب خانوں اور عجائب گھروں کی زینت بن گیا۔اس کے وسائل میں تحفہ' خریداری' چوری' لوٹ کھسوٹ' رشوت اور بلیک میلنگ بھی شامل تھے۔ مشرق کی یہ علمی وفکری میراث جس بھی صورت میں یوروپ منتقل ہوئی اس نے استشراقی حرکت ونشاط میں غیر معمولی اضافہ کردیا۔اوراس سرمائے کی منتقلی کے بعد یوروپ میں مشرق کے ماہرین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

اس مرحلے کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس میں پہلی بار استشراقی کانفرنس منعقد ہوئی۔یہ کانفرنس پیرس میں 1783ء میں ہوئی جس کے بعد استشراقی کانفرنسوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔

اس مرحلے میں استشراق کی تاریخ میں پہلی بار دائرۃ المعارف اور موسوعی نوعیت کی کتابیں ظہور میں آئیں جن میں مشرقی تہذیب و ثقافت کا مختلف گوشوں سے تفصیلی جائزہ لیا گیا۔اس مرحلے میں استشراقی ادب میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ اس میں راست حملوں کا طریقہ چھوڑ کر خفیہ اور غیر ظاہر راستے اختیار کیے گئے جس سے بعض لوگوں کو یہ گماں ہوا کہ استشراق اس مرحلے میں موضوعی اور غیر جانبدار ہوگیا۔البتہ یہ

صحیح ہے کہ کلیسا کے اقتدار سے نکلنے کے بعد اس میں کسی قدر توازن پیدا ہوگیا لیکن صدیوں کی تعلیمات مشرق کے بارے میں بالواسطہ معلومات اور نسل پرستی کے نظریات و مذہبی جذبات سے متاثر استشراقی ذہن پوری طرح سے غیر جانبدار ہرگز نہیں رہا، البتہ مستثنیات ضرور ہیں اور ان مستثنیات کو بھی اس مرحلے کی خصوصیت قرار دیا جاسکتا ہے۔

9.7.4 چوتھا مرحلہ:

یہ مرحلہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے سے (1918ء) سوویت یونین کے سقوط 1991ء تک پر مشتمل ہے۔ اس مرحلے کی دو عظیم جنگوں کے اثرات نے یوروپ کے سیاسی و اقتصادی ڈھانچے کو یکسر بدل ڈالا اور مغربی نوآبادیات کا خاتمہ بھی اسی مرحلے میں ہوا جس کے سبب استشراق میں بھی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ اس مرحلے میں استشراق استعماری ایوانوں سے نکل کر مشرقی ملکوں میں قائم مغربی سفارت خانوں میں منتقل ہوگیا۔ بعض ملکوں میں یہ سفارت خانے اس قدر طاقتور تھے جو عصر استعمار کی ریزیڈنسیوں کی یاد دلاتے تھے اور ان ملکوں میں ہونے والی دہشت گردیوں، خونریزیوں اور انقلابات میں شامل رہتے تھے۔

اس مرحلے میں گزشتہ مرحلے کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا، کانفرنسوں اور جرنلز کی تعداد میں اضافہ ہوا، البتہ موسوعاتی نوعیت کے ضخیم اعمال میں گراوٹ آئی۔ اس مرحلے میں ہمیں مستشرقین کی صفوں میں وہ افراد نہیں ملتے ہیں جنہوں نے بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے لیے اپنی عمریں وقف کردیں۔ اور غالباً یہ تبدیلی زندگی کا طور طریقہ بدلنے کے سبب ہوئی نہ کہ کسی بے توجہی کے سبب۔ اس مرحلے کی ایک بڑی خاص بات یہ ہے کہ اس مرحلے میں استشراقی سرگرمیوں میں صیہونیت کی شمولیت ہوئی۔ اس ضمن میں برنارڈ لویس (Bernard Lewis) اور مرد خای کیدار (Mordecchai Kedar) وغیرہ کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے استشراق کی ایک اور بڑی خصوصیت امریکی استشراق کا ظہور ہے بلکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد استشراقی محور یورپ سے امریکہ منتقل ہوگیا اور ہارورڈ یونیورسٹی استشراقی عمل کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔ امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں جیسے پرنسٹن، کولمبیا، پنسلوانیا، بوسٹن اور شکاگو وغیرہ میں استشراقی مطالعات کے سینٹرز قائم ہیں۔

اس مرحلے کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ 1973ء میں پیرس میں منعقد استشراقی کانفرنس میں استشراق کے خاتمے کا اعلان کردیا گیا، اور استشراقی مطالعات کو انسانی علوم و معارف کے زمرے میں داخل کردیا گیا۔ جب کہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس اعلان کے ذریعہ لفظ استشراق کے ساتھ وابستہ ظلم و زیادتی، مکر و فریب اور نسل پرستی و فرقہ واریت کے تصورات سے پیچھا چھڑانے کی ایک کوشش تھی تاکہ مستشرقین کے اعمال کی مصداقیت اور اعتباریت کو بحال کیا جاسکے۔ چنانچہ اب استشراقی کانفرنس ایشیا و افریقہ سے متعلق انسانی مطالعاتی عالمی کانفرنس کے نام سے منعقد ہورہی ہے۔ 1998ء میں یہ کانفرنس ہنگری کی دارالحکومت بوڈاپسٹ اور 2000ء میں کینڈا کے شہر مونٹریال میں منعقد ہوئی۔

اس مرحلے کے اہم مستشرقین میں بعض نام مندرجہ ذیل ہیں: لوئیس ماسینیون متوفی 1962 (Massignon L.)، لیوی پروونسل متوفی (Levi Provencal)، ریجس بلاشیر متوفی 1973 (Blachere R.)، کلود ھین متوفی 1991 (Cahen Cl)، وغیرہ فرانسیسی

مستشرقین، موٹگومری واٹ متوفی 2006 (Montegomerry Watt)' مرگلیوتھ متوفی 1940 (Margoleonth D.S)' رینالڈ نکولسن متوفی 1945 (Nicholson R.A)' کرنکوف متوفی 1953 (Krenkow Fr.)' آرتھر آربری متوفی (Arther Arberry) 1969 'ہملٹن جب متوفی 1971 اور برنارڈ لیس متولد (Bernard Lewis) وغیرہ برطانوی مستشرقین، کارل بروکلمان متوفی (Carl Brockelmann) 1956 اور جوزف شاخت متوفی 1969 وغیرہ جرمن مستشرقین۔ جویدی میکلانجلو متوفی (Geudi Michelangelo) 1956 اور فرانسیسکو جابریلی متوفی 1997 (Gabrieli Francesco) وغیرہ اطالوی مستشرقین، روس کے مستشرق کراچکوسکی متوفی 1951 (Kratchkoviski)، ہنگری کے عبدالکریم جرمانوس متوفی ۱۹۷۹ء (Germanus J.)، اور ہالینڈ کے ارنٹ ونسنک متوفی 1939 (Arnet Wensink)۔

9.7.5 پانچواں مرحلہ

اس مرحلہ کا آغاز سوویت یونین کے سقوط سے ہوتا ہے اور تادم تحریر جاری ہے۔ اس مرحلے کی سب سے نمایاں خصوصیت دنیا کا ایک قطبی ہونا ہے۔ استشراق بھی اس تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ہے۔ اور اس کا مرکز ثقل پوری طرح سے امریکہ منتقل ہو گیا۔ فکری طور پر اس مرحلے کی ابتداء تہذیبوں کے تصادم کے نظریے سے ہوئی جسے صمویل ہنٹگٹن (Samuel Hungtington) نے 1992ء میں پیش کیا اور 1996ء میں اسے ''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو'' (The Clash of Civilization and the Remaking of New World order) کے نام سے پیش کیا، جس کا خلاصہ ہے کہ مستقبل میں انسانی ٹکراؤ آئیڈیالوجی پر مبنی یا اقتصادی نوعیت کے نہیں ہوں گے بلکہ تہذیبی بنیادوں پر ہوں گے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان تہذیبی ٹکراؤ شروع ہو چکا ہے۔ جو مشترک دشمن ''اشتراکیت'' کے خاتمے کے بعد باہمی ٹکراؤ کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ اس نظریہ کا بنیادی مقصد مغرب کی بالا دستی کو برقرار رکھنا ہے اور 'اسلامی خطرہ' کے حوالے سے بے محابا فوجی خرچ اور تجربات کو جواز فراہم کرنا ہے۔ بلاشبہ اس نظریہ نے دنیا میں عداوت کی فضا سازگار کی اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان خلیج کو وسیع کیا۔ صمویل کو بطور مستشرق نہیں جانا جاتا لیکن چونکہ اس کا اصلی ہدف اسلام اور مسلمان ہیں اور اس کا تمام فکری و علمی مواد استشراق کا فراہم کردہ ہے لہذا اس عمل کو بھی استشراق کی توسیع ہی مانا جا رہا ہے۔

استشراق کا یہ مرحلہ عالمگیریت (Globalization) کا ہے اور مادیت کے ساتھ ساتھ عالم فکر و نظر بھی اس کی زد پر ہے۔ اب استشراق اصرافیت (Consumerism)' تغریب (Westernization) کے لیے کام کرتا ہے اور فکری و اقتصادی استعمار کی خدمت میں مصروف عمل ہے جسے نو استعماریت (New Colonialism) کہا جاتا ہے۔ سوئس مستشرق پادری ہانس کنج (Hans Kung) نے عالمگیریت کے اس عہد کے لیے ایک عالمگیر ضابطہ اخلاق کی فکر پیش کی ہے جس کے ذریعہ تہذیبوں کے اس نام نہاد تصادم سے بچا جا سکتا ہے اور دنیا میں امن قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس عالمگیری ضابطہ اخلاق کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت تک امن ممکن نہیں ہے جب تک کہ مذاہب کے درمیان امن قائم نہ ہو اور مذاہب کے درمیان گفت وشنید کے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا ہے اور کوئی گفت وشنید نتیجہ خیز اور ثمر بار نہیں ہو سکتی جب تک مشترکہ اخلاقی معیار اور ضابطے قائم نہ کیے جائیں۔ اس ضمن میں ہانس نے دنیا کے تمام مذاہب سے مشترکہ اخلاقی قدریں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مرحلے میں یورپ و امریکہ میں بسنے والی مسلم اقلیات کا مطالعہ استشراقی مطالعے کے جدید محور کے طور پر ابھر کر آیا ہے۔ اور اس کا چلن تیزی سے سامنے آیا ہے۔ اس مرحلے کی ایک نمایاں بات یہ ہے کہ اس میں علاقائیت پر مبنی استشراقی (اجتماعی) مطالعات کا ظہور ہوا ہے۔ مثلاً کوئی ایک مستشرق اسلامی یا مشرقی ملکوں میں کسی ایک ملک کا ہمہ جہتی مطالعہ کرتا ہے۔

عالمگیریت اور اصرافیت کے عہد میں بین الاقوامی کمپنیاں استشراقی مطالعات اور خود مستشرقین کا استعمال کر رہی ہیں جیسا کہ سو سال پہلے استعماری قوتوں نے کیا تھا۔ اس مرحلے میں استشراق الکٹرانک میڈیا کی طرف متوجہ ہوا ہے چنانچہ بہت سے مستشرقین اب یورپ اور امریکہ میں بڑے بڑے میڈیا ہاؤسز سے وابستہ ہوگئے ہیں اور بطور پروگرامرز اور اینکرز کام کر رہے ہیں۔ استشراقی رنگ و آہنگ رکھنے والے ٹی وی سیریلیوں، پروگراموں اور فلموں کی ایک طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہے۔

اس مرحلے کے استشراق میں گہرائی و گیرائی کے بجائے سطحیت، سنجیدہ بحثوں کے بجائے اکسانے والے بیانات، ریسرچ و تحقیق کے بجائے کذب و افتراء، علمی اعتراضات کے بجائے اہانت آمیز الزامات اور علمیت کے بجائے پروپیگنڈوں پر اعتماد وغیرہ عام طور پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً اسلام کے خلاف توہین آمیز مقالوں اور کتابچوں کی بھرمار ہوگئی ہے۔ اس ضمن میں کریگ ون (Craig Wonn) کی کتاب بربادی کا نبی (Prophet of Doom) اور کریسنٹ مون پبلشنگ سے شائع ہونے والے کتابچے ''محمدؐ مانو ورنہ!'' اور بے شمار مولفوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

9.8 اغراض و مقاصد

جمہور محققین کی رائے ہے کہ استشراق کا آغاز دینی غرض و غایت سے ہوا لیکن اپنے طویل تاریخی سفر میں استشراق کو کئی ایسے عوامل سے گزرنا پڑا جس نے اس کی غرض و غایت کو متاثر کیا اور اس میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ چنانچہ ہمیں استشراق کے دینی، علمی، سیاسی، استعماری، اقتصادی اور نفسیاتی وغیرہ متعدد اغراض و مقاصد کا پتہ چلتا ہے۔ اور تاریخی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ استشراقی اغراض اس کے ساتھ کام کرنے والی اور اسے تعاون دینے والی قوتوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً عیسائی مشنری کی غرض اسلام کی نشر و اشاعت کو روکنا ہے تاکہ وہ نصرانیت کے مدمقابل نہ آسکے۔ استعماری قوتوں کا ہدف اسلامی صفوں میں انتشار برپا کرنا ہے تاکہ ان کا اتحاد استعمار کے غلبہ و اقتدار کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ صیہونیت کا مقصد اعلیٰ بھی عرب اور اسلامی وحدت کی بیخ کنی ہے۔ تاکہ امت مسلمہ اپنے افتراق اور شکست خوردگی کے احساس کے ساتھ اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

عالم عرب اور امت اسلامیہ ہی کے مانند استشراق کا رویہ دوسری مشرقی قوموں اور امتوں کے ساتھ بھی ہے جس کا بنیادی ہدف مشرق کو سیاسی، اقتصادی اور سماجی طور پر اپنے زیر نگیں رکھنا ہے۔ اگر استشراقی اغراض و مقاصد کو بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ اپنے تمام تر تنوع اور کثرت کے باوجود دو محوروں کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

1. تعمیری: جس کا تعلق مغربی تہذیب کی تعمیر و ترقی، خوشحالی اور رفاہیت سے ہے۔ مشرقی علوم و دولت و ثروت کے ذریعہ مغرب کے عروج و اقتدار کو برقرار رکھنے سے ہے۔

2. تخریبی: جس کا تعلق مشرق کے افکار و عقائد، اخلاق و کردار، اور تہذیب و ثقافت کی تخریب کاری و مخالفت سے ہے۔ مآل کار مشرق کو ہر دو مادی اور معنوی طور پر مغرب کا مرہون منت بنا کر رکھنا ہے۔

جن مشرقی بالخصوص عربی اسلامی علوم وفنون کو استشراق نے مغرب کی تعمیر و ترقی کے لیے استعمال کیا اس کی دو قسمیں ہیں:

1. تجربی عملی اور میدانی علوم وفنون جیسے کیمیاء، ریاضی، جبر و مقابلہ، طب، فلکیات اور مرایا و مناظر وغیرہ۔

2. انسانی معارف سے متعلق علوم وفنون جیسے آداب (تعمیری و تخریبی) دینی علوم فلسفے اور زبانیں۔

پہلی قسم کے علوم کو مکمل طور پر یورپ منتقل کر دیا گیا اور حسب امکان اس سے مشرقیوں یا مسلمانوں کے ناموں کو بھی الگ کر دیا گیا اور دوسروں کے نام منسوب کر دیا گیا۔

دوسری قسم کے علوم میں استشراق نے سب سے زیادہ توجہ مشرقی زبانوں پر دی۔ اس کے بعد اس کی ترجیح میں فلسفے کا نمبر آتا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ادب کی طرف استشراق کی توجہ کم ہی رہی سوائے تخریبی ادب کے جو مشرق اور اسلام کی صورت مسخ کرنے والا ہے۔ خالص دینی علوم کو بھی استشراقی مطالعے میں خاص اہمیت حاصل تھی، ان میں تصوف، فقہ اور کلام استشراق کا خاص محور رہے ہیں۔ لیکن ان علوم کے روشن اور تعمیری پہلوؤں کے بجائے تاریک اور تخریبی پہلو استشراق کے پیش نظر رہے ہیں، تصوف کے حوالے سے اجنبی اور فلسفیانہ افکار، کلام کے نام پر فرقہ وارانہ جدل و مشاجرات، فقہ میں ابواب حیل وغیرہ استشراق کے مرغوب موضوعات رہے ہیں۔ ہندوستانی معارف میں بھی یہی وطیرہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کے روشن و تابناک پہلوؤں کے بجائے جنسی فلسفوں، انتہا پسندی پر مبنی افکار اور عقلیت سے خالی رسوم پر زیادہ توجہ دی گئی۔

استشراق کے تعمیری اغراض و مقاصد قابل تعریف و ستائش ہیں۔ اور اہل مغرب نے انسانی تاریخ میں یہ کوئی نیا کام نہیں کیا ہے بلکہ یہ عمل سنت الٰہی کا حصہ ہے دنیا کی تمام قومیں دوسروں سے اخذ و استفادہ کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہیں۔ خود مسلمانوں نے یونانی، رومانی، ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں اور ثقافتوں سے اخذ و استفادہ کیا لیکن جس قدر تعمیری مقاصد قابل تعریف و توصیف ہیں اسی قدر تخریبی اغراض لائق تنقید و مذمت ہیں۔

اس مقدمے کے بعد ذیل میں استشراق کے اغراض و مقاصد کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے اہم مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

9.8.1 دینی مقاصد

استشراقی تحریک کے پس پشت دینی مقاصد کا وجود ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ بے شمار علمی و تاریخی دلائل اس مقصد کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ جن میں بعض مندرجہ ذیل ہیں:

الف۔ اس بات پر تقریباً سارے محققین و مصنفین کا اتفاق ہے کہ استشراق کا آغاز کلیسا سے ہوا۔ اور پادریوں کی کوشش سے یہ تحریک وجود میں آئی۔

ب۔ تحریک استشراق کا ہراول دستہ پادریوں، راہبوں اور دینی شخصیات سے ہی تشکیل پذیر ہوا ہے۔ جیسے یوحنا دمشقی (متوفی 749ء)، پیٹر محترم (متوفی 1156ء) پادری جربرٹ (متوفی 1003ء)، پادری جیرارد (متوفی 1187ء)، ریکولڈو (متوفی 1320ء) اور یوحنا اشقوبی (متوفی 1456ء) وغیرہ۔

ج۔ یوروپ میں مشرقی مطالعات کے بیشتر مراکز و ادارے راہبوں اور پادریوں کی کوشش سے قائم ہوئے جیسے: پیرس کا مشرقی زبانوں کی تدریس کا ادارہ جسے پادری ہونوریوس چہارم نے 1285ء میں قائم کیا۔ جامعہ سوربون جسے پادری روبیرڈی سوربن (Robert De Sorbon) نے 1253ء میں بنایا اور جس کی تعمیر نو کرڈینال ریشلیو (Duc De Recheieu) نے 1626ء میں کی۔ اسپین کا دفتر مترجمین جس کی بنیاد پادری ریمونڈ اول نے 1130ء میں ڈالی تھی اور مشرقی زبانوں اور علوم کے کئی دوسرے ادارے جن کا قیام عیسائی مذہبی رہنماؤں کی کوشش سے عمل میں آیا۔

د۔ استشراق کے پیچھے دینی مقصد کی موجودگی کی ایک بڑی دلیل خود مستشرقین کے اپنے کام ہیں جن پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ استشراق بالخصوص قدیم استشراق پر دینی مقصد غالب تھا۔

ھ۔ مستشرقین اور عیسائی تبلیغی جماعتوں کے باہمی گہرے روابط و تعلقات بھی اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ استشراقی مقاصد میں دینی مقصد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

و۔ مستشرقین میں متعدد ایسی شخصیات ہیں جو استشراق اور تبشیری صفات کی جامع ہیں یہ امر بھی دینی مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ز۔ کئی ایسے مستشرقین ہیں جنہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کاروان استشراق میں ان کی شمولیت کے پس پشت دینی عوامل کارفرما تھے۔

9.8.2 استعماری مقاصد

استشراق کی غیر معمولی ترقی اور مغرب میں اس کی قبولیت کا ایک سبب استعماری طاقتوں کی جانب سے اس علم کی پذیرائی ہے۔ استشراق کی پشت پر استعماری مقاصد کا ہونا ایک ثابت شدہ علمی حقیقت ہے۔ عملی استعمار سے پہلی ہی یہ مقصد کارفرما تھا، حقیقت یہ ہے کہ استعمار ونو آبادی نظام کی زمین ہموار کرنے کا کارنامہ استشراق نے ہی انجام دیا ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے استعماری مقاصد کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

الف۔ استشراقی مطالعوں کے نتائج اور مستشرقین کے اسفار کی روداد کو نو آبادکاروں نے خوب خوب استعمال کیا اور نو آبادیات بنانے اور اسے قائم رکھنے میں ان کا استعمال کیا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی مستشرق کانٹ دی ولنی (Count De Vilny) کے سفر نامہ مصر نے ہی نپولین کو مصر پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ یہ حملہ 1798ء میں ہوا تھا۔ اس ضمن میں برطانوی جاسوس ہمفر کے (Hempher) اعترافات کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ استشراقی مطالعے استعماری رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اور انہیں محوروں کے گرد گھومتے ہیں جن سے استعمار کو قوت و طاقت حاصل ہوتی ہے۔

ج۔ بعض مستشرقین نے خوداس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے استعماری قوتوں کے ساتھ مل کر کام کیا بلکہ مستشرق مارٹینی نے تو یہاں تک اعتراف کیا ہے کہ عصر استعمار میں تمام مستشرقین کسی نہ کسی طرح استعمار سے وابستہ تھے۔ یہ اعتراف انہوں نے عربی رسالے ''الموقف الادبی' (عدد:122, 1981ء) میں کیا ہے۔

د۔ کئی مستشرقین نے استعماری فوجوں میں عہدہ داروں کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ جیسے واٹسن، رچرڈ بورٹن اور جان مالکم وغیرہ۔

ہ۔ استشراقی مطالعوں کے نتائج سے استعماری طاقتوں نے فائدہ اٹھایا جیسے برطانوی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' استشراق کے فرقہ وارانہ اور گروہی مطالعات کا ایک نتیجہ ہے۔

و استعماری طاقتوں اور حکومت نے استشراق کی حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ اپنی محکوم قوموں کو سمجھ سکیں۔ اس غرض سے یوروپ کے علاوہ خود مشرقی مستعمرات میں کئی مراکز اور ادارے قائم کیے گئے جیسے کولکاتا میں قائم فورٹ ولیم کالج اور ایشیاٹک سوسائٹی وغیرہ اور مستشرقین کو بڑے بڑے مناصب پر فائز کیا گیا جیسے ولیم میور، کردمر اور لارنس وغیرہ۔

9.8.3 سیاسی مقاصد

گزشتہ صدی کے نصف آخر میں جب ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں نے مغربی استعمار سے آزادی حاصل کر لی اور مغربی ملکوں اور ان نو آباد ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوئے تو ان ملکوں میں قائم سفارت خانوں کو مستشرقین کے حوالے کر دیا گیا جنہیں ان ملکوں اور اس میں بسنے والی قوموں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات تھیں اور ان مستشرقین نے اپنے اپنے ملکوں کی توقعات کے مطابق اپنا کردار ادا کیا۔ چنانچہ ان ملکوں کو مغرب کی ہمنوائی اور زیردستی میں رکھنے کے لیے ان سفارت کاروں نے اپنے استشراقی مطالعوں سے خوب خوب استفادہ کیا۔ اور ان ملکوں میں جاسوسی' تخریب کاری' گروہی تشدد' مسائل کو پیچیدہ بنانے اور فتنوں کو بھڑکانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کئی ایشیائی اور افریقی ملکوں میں ہوئے انقلابات اور فکری و گروہی تصادمات میں ان مستشرق سفارت کاروں کا نمایاں طور پر رول رہا ہے جس کے تاریخی شواہد موجود ہیں۔

مقامی بولیوں کی طرف استشراق کی توجہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان کے حوالے سے قوموں میں تفریق پیدا کی جا سکے اور سیاسی مقاصد حاصل کیے جا سکیں۔ مسلم ملکوں میں اس کا ایک اور سیاسی و دینی مقصد بھی تھا اور وہ تھا اسلامی وحدت کے شیرازے کو منتشر کرنا۔

9.8.4 معاشی مقاصد

نامور محقق ایڈورڈ سعید کے مطابق آخری دور کے اکثر مستشرقین کی تگ و دو کا مقصد معاشی ہی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشی مقصد استشراق کے ہر دور میں موجود تھا۔ جو مذہب کا اثر و نفوذ کم ہونے اور نو آبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد مزید نمایاں ہوگیا۔ یوروپ کی حکومتیں اور وہاں کے ادارے اور کمپنیاں مشرق کے متعلق معلومات کے عوض بھاری معاوضہ پیش کرتی تھیں۔ مشرقی علم میں دسترس پانے والے اور وہاں کی زبانوں میں مہارت رکھنے والوں کو نو آباد دفتروں میں بڑے بڑے مناصب ملتے تھے۔

9.8.5 نفسیاتی مقاصد

انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اس کی طرح ہو جائیں۔ دوسرے بھی وہی مانیں جو وہ مانتا ہے اور وہی کریں جو وہ کرتا ہے، مستشرقین نے بھی اپنے افکار و نظریات کو تسلیم کرانے اور مشرقی اقوام کو اپنے نقش قدم پر گامزن کرنے کے مقصد سے علوم شرقیہ کے مطالعے اور بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے۔

9.8.6 علمی مقاصد

استشراق کے جملہ مقاصد میں علمی مقصد بھی ایک اہم اور قابل ذکر مقصد ہے۔ بہت سارے مستشرقین نے محض علمی مقصد سے اس میدان میں قدم رکھا۔ اور قرار واقعی علم کی خدمت کی، ان میں سے بعض حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہوئے اور بعض علمی وسائل کی کمی کے سبب حقیقت تک رسائی نہیں حاصل کر سکے لیکن ان کا اخلاص ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ ایسے مستشرقین کی تعداد اگر چہ بہت کم ہے مگر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

معلومات کی جانچ

۱۔ استشراقی مطالعات کے دو مقاصد کا ذکر کیجئے۔

۲۔ استشراق کے تخریبی مقاصد سے کیا مراد ہے۔

۳۔ کس مستشرق کی کتاب نے نپولین کو مصر پر حملے کی ترغیب دی۔

9.9 خلاصہ

استشراق کا لغوی معنی مشرق کی طلب ہے، اصطلاح میں اہل مغرب کی جانب سے مشرقی زبان و ادب، تہذیب وثقافت اور مذہب و فلسفہ کے مطالعات کو استشراق کہتے ہیں۔ اس کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں ماہرین کی آراء مختلف ہیں کوئی اس کے آغاز کو انسان کے ابتدائی تہذیبی عہد سے بتاتا ہے، تو کوئی اس کے آغاز کو اسلام کے آغاز سے مربوط کرتا ہے۔ کسی کے نزدیک استشراق کی شروعات اسپین میں اسلامی حکومت کے قیام سے ہوئی تو کوئی اسے صلیبی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تحریک سمجھتا ہے۔ عام رائے یہی ہے کہ مسلمانوں کے ذریعے اندلس کی فتح نے اہل مغرب پر مشرق کے دروازے کھولے، اور اسی کے بعد سے استشراقی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس کے کئی تاریخی مراحل ہیں اور ہر مرحلے کا استشراق الگ الگ خصوصیات کا حامل ہے۔ استشراق کے اہداف و مقاصد بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں، ان میں دینی، استعماری، سیاسی اور علمی مقاصد سرفہرست رہے ہیں۔ استشراقی مطالعات سے مغرب کی کئی طاقتوں اور تحریکوں نے فائدہ اٹھایا ان میں عیسائی مشنریز اور نوآبادیاتی نظام سب سے آگے ہے۔ مشرقی افکار پر استشراقی عمل کا گہرا اثر پڑا ہے، یہ آثار مثبت بھی ہیں اور منفی بھی ہیں، قابل تعریف بھی ہیں اور لائق مذمت بھی۔

9.10 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

۱۔ استشراق کے مختلف مقاصد پر روشنی ڈالیے اوراس کے دینی اور استعماری مقاصد کو شواہد کے ساتھ بیان کیجیے۔

۲۔ استشراق کی تاریخ پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے اوراس کے مختلف ادوار کا جائزہ لیجیے۔

۲۔ استشراق کے مفہوم کو واضح کیجیے اوراس کی لفظی و مختلف اصطلاحی تعریفات ذکر کیجیے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں تحریر کیجیے۔

۱۔ استشراق کے لفظی معنی اوراس کے مفہوم کو بیان کیجیے۔

۲۔ استشراق کے مختلف ادوار اوران کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

۳۔ تحریک استشراق میں دینی مقصد کے وجود کو مدلل طور پر ذکر کیجیے

۴۔ استشراق کے سیاسی اور استعماری مقاصد پر مختصر نوٹ لکھیے۔

9.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

۱۔ Edward Said , Orientalism, London: Penguin,1977.

۲۔ موسوعۃ المستشرقین عبدالرحمان بدوی، دارالعلم للملائین بیروت، بارسوم 1993ء

۳۔ ظاهرۃ الاستشراق وموقف بعض المستشرین منہا کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ ،طرابلس ،لیبیا

۴۔ اسلام اور مستشرقین دارالمصنفین شبلی الیڈمی ،اعظم گڑھ

اکائی 10 : قرآن وحدیث اور فقہ میں مستشرقین کی خدمات اور ان کا جائزہ

اکائی کے اجزا

10.1 تمہید

استشراقی مطالعات نے مشرقی علوم ومعارف کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے اپنے بحث ونظر اور تصنیف وتالیف کا محور نہ بنایا ہو۔ اسلام کو اپنا موضوع بنانے والے مستشرقین نے بھی تمام اسلامی علوم ومعارف کو اپنے فکروقلم کی جولا نگاہ بنایا ہے۔ اگر ہم اسلام کے حوالے سے استشراقی مطالعات کا ایک سرسری جائزہ لیں تو یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اسلامی علوم کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس میں استشراق نے خامہ فرسائی نہ کی ہو بلکہ اس مین بے شمار تصنیفات نہ چھوڑی ہو۔ اور یہ استشراقی اعمال صرف کتابوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ سینکڑوں رسالوں، جریدوں، سالناموں کے علاوہ کانفرنسوں اور سیمناروں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔

استشراق نے اپنے اسلامی مطالعات کی ابتداء شرعی علوم سے کی ہے کیونکہ اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کی معرفت کے لئے ان علوم کی خاطر خواہ معرفت ضروری ہے ان علوم میں قرآن، حدیث، فقہ اور علم کلام وغیرہ شامل ہیں۔ اس اکائی میں پہلے تین علوم کے سلسلے میں مستشرقین کی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔

10.2 مقصد

اس اکائی مقصد علوم اسلامی میں مستشرقین کی خدمات کا تعارف ہے۔اس اکائی کے مطالعے سے طلبہ نہ صرف قران وحدیث اور فقہ میں متشرقین کی خدمات سے واقف ہوجائیں گے بلکہ بعض مستشرقین کی جانب سے کی جانے والی تحریفات اور دسیسہ کاریوں سے بھی واقف ہوجائیں گے۔

10.3 قرآن کریم

قرآن کریم نے اپنے نزول کی ابتداء سے ہی اپنے سائنسی وبلاغی اعجاز وکمال کے سبب مخاطبین کو تعجب وحیرت میں ڈال دیا۔اور قرآن کے ذریعہ روئے زمین پر جو علمی،فکری وتہذیبی انقلاب برپا ہوا اس نے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔اہل مغرب کی اسلام کی طرف توجہ بھی اس حیرت واستعجاب کا ایک نتیجہ تھی اور اسی حیرت نے اہل مغرب یا مستشرقین کو اس کتاب کے مطالعے اور اس میں بحث وتحقیق کے لئے آمادہ کیا۔کسی نے یہ مطالعہ موضوعیت اور ایجابیت کے ساتھ کیا تو کسی نے مذہبی جذبات کے زیر اثر کیا،کسی کا کام حقیقت پسندانہ رہا تو کسی کا جانبدارانہ۔بعض ایسے بھی تھے جن کا مطالعہ تو تعصب سے خالی تھا لیکن علمی وسائل کی قلت اور عربی زبان سے ناواقفیت ان کے علمی نتائج پر اثر انداز ہوئی۔

مستشرقین نے قرآن کریم کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیا۔بعض اہم جوانب مندرجہ ذیل ہیں۔

1- ترجمہ قرآن:اس میں مختلف زبانوں میں کئے جانے والے ترجمۂ قرآن شامل ہیں ان میں بعض حرفی ترجمے ہیں بعض تفسیری ترجمے ہیں بعض کامل ہیں اور بعض ناقص۔

2- تاریخ قرآن کریم:اس میں نزول،اسباب نزول‘قرآن کی کتابت وتدوین اور اس کی سورتوں کی مختلف تقسیمات وغیرہ شامل ہیں۔

3- علوم قرآن پر تصنیف شدہ قدیم کتابوں کی نشر واشاعت‘مخطوطات کی تحقیق اور فہرست سازی وغیرہ

4- قرآن وعلوم قرآن سے متعلق تحقیقات ومطالعات۔

ذیل میں انہیں پہلوؤں کے تحت مستشرقین کے کاموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

10.3.1 ترجمہ قرآن

اسلام کو قرآن کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔اور غیر عربی داں کو قرآن سمجھنے کے لئے اس کے ترجمے کی حاجت ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی علوم پر مستشرقین کے اعمال کا آغاز قرآن کریم کے ترجمے سے ہوا۔اگر ہم یوحنا دمشقی کے عمل سے صرف نظر کر لیں تو پائیں گے کہ بیشتر استشراقی اعمال ترجمۂ قرآن سے ہی عبارت ہیں اور اس عمل میں مستشرقین نے غیر معمولی محنت کی کیونکہ ترجمہ کا عمل ایک بے حد دقت طلب عمل ہے۔اور یہ دقت قرآن جیسی کتاب میں اور بڑھ جاتی ہے۔وہ علم بیان کا ایک شاہکار ہے۔قرآن کا ترجمہ کرنے کے لئے نہ

صرف عربی زبان اور بلاغت سے گہری آشنائی کی ضرورت ہے بلکہ بلند پایہ فکر اور اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق بھی درکار ہے۔ قرآن کے ترجمے کی پہلی کوشش بطرس محترم (Peter the Venerable) کے ذریعہ 1143ء میں ہوئی اور یہ سلسلہ بیسویں صدی تک جاری رہا۔ ان میں سے بعض ترجمے پورے قرآن کے ہوئے اور کچھ ترجمے نامکمل بھی رہے۔ ذیل میں ان میں سے کچھ اہم ترجموں کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

الف: یورپ میں قرآن کا پہلا ترجمہ وہی ہے جس کا ابھی ابھی ذکر گزرا۔ یہ ترجمہ بطرس محترم کی زیرنگرانی لاطینی زبان میں ہوا اس ترجمے کو ایک عرب اسپینی پادری کی مدد سے کیا گیا تھا۔ اس کی اشاعت چار صدیوں کے بعد ہوئی۔ قرآن کریم کے معروف فرانسیسی ترجمہ نگار ریجیس بلاشیر (R.L.Blacher) متوفی 1973ء کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ نہ تو منصفانہ تھا اور نہ ہی قرآنی نصوص کے احاطے پر مشتمل تھا۔

ب: اطالوی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ مستشرق اُریفابین نے 1547ء میں کیا۔ اٹلی ہی میں پہلی بار عربی حروف میں قرآن کی طباعت ہوئی۔ یہ طباعت وینس کے مطبع میں 1530ء میں ہوئی۔

ج: جرمنی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ شیخر نورمبرگ (Solomon Schweiger) کے ذریعہ ہوا، اور یہ ترجمہ 1616ء میں نشر ہوا۔

د: فرانسیسی زبان میں شائع ہونے والا پہلا ترجمہ قرآن 1647ء میں منظر عام پر آیا یہ ترجمہ مصر میں فرانسیسی قونصل دیوریئر (Andre du Ryer) نے کیا تھا جو غلطیوں سے پُر تھا۔

ھ: قرآن کریم کا اولین انگریزی ترجمہ جورج سیل (G.Sale) متوفی 1736ء کے ذریعہ ہوا۔ سیل نے اپنے ترجمے پر حاشیہ بھی لکھا ہے اور ابتداء میں ایک طویل مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین علی صغیر کے مطابق یہ مقدمہ اسلام کے تعارف پر مشتمل ہے اور کذب وافترا سے بھرا ہوا ہے۔

و: روسی زبان میں قرآن کے ترجمے کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہو چکا تھا لیکن اس زبان میں پہلا علمی ترجمہ سابلکوو (Sabloukov) متوفی 1880ء نے کیا یہ ترجمہ 1878ء میں منظر عام پر آیا۔

یہ انیسویں صدی تک کئے جانے والے کچھ مشہور و معروف ترجمے ہیں ان میں سے کئی ایک متعدد بار شائع ہوئے اور کچھ کے دوسری یوروپی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ بیسویں صدی میں شائع ہونے والے بعض اہم تراجم مندرجہ ذیل ہیں۔

ز: فرانسیسی زبان میں ایڈورڈ مونٹیٹ (Ed.Montete) متوفی 1927ء کا ترجمہ قرآن جو 1929ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمے کے بارے میں محمد فواد عبدالباقی نے امیر شکیب ارسلان کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ مغربی زبانوں میں شائع ہونے والے تراجم میں سب سے عمدہ ہے۔ اس ترجمے کے مقدمے میں قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کا مفصل تعارف بھی ہے۔ اور آخر میں ایک موضوعاتی فہرست بھی ہے۔

ح: فرانسیسی زبان میں قرآن کا سب سے مشہور ترجمہ بلاشیر (Blacher) کا ہے۔ بلاشیر کی پیدائش تو پیرس میں ہوئی لیکن ان کی تمام تر تعلیم و تربیت مراکش اور الجزائر میں ہوئی اور رباط، پیرس اور سوربون میں بطور عربی استاد کے کام کیا۔ ان کا ترجمہ قرآن 1947ء سے 1952ء کے درمیانی عرصے میں تین جلدوں میں پیرس سے شائع ہوا۔

ط: گزشتہ صدی میں یورپ میں ہونے والے انگریزی تراجم میں سب سے نمایاں ترجمہ پکتھال (M.W.Pickthall) متوفی 1936ء

کا ہے۔ترجمہ کی تکمیل کے بعد پکتھال نے مصر جا کر علماء سے اپنے ترجمے پر نظر ثانی بھی کرائی۔ یہ ترجمہ انگریزی میں سب سے بہتر ترجمہ مانا جاتا ہے۔یورپ کے ساتھ ساتھ مسلم ملکوں میں بھی رائج ہے۔

ی: انگریزی زبان میں ایک اہم ترجمہ پروفیسر آربری(A.J.Arberry) متوفی 1969ء کا ہے۔ عربی زبان اور اسلامیات خصوصاً تصوف کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ہندوستان اور عرب ملکوں میں کام کیا۔انڈیا آفس لائبریری کے ڈائرکٹر بھی رہے۔متعدد کتابوں کے مصنف ومحقق ہیں۔آربری کا ترجمہ قرآن 1955ء میں نیویارک اور 1959ء میں لندن سے شائع ہوا۔

مستشرقین کے ذریعے کئے جانے والے نامکمل ترجموں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ایسے کئی شائع شدہ ترجموں کا ذکر بروکلمان نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔دوسرے مشہور جزئی تراجم میں سویڈن کے مستشرق زیٹرس ٹین(Zettersteen K.V) متوفی 1953ء کا اسپینی زبان میں کیا گیا ترجمہ اور ڈنمارک کے مستشرق بل(Bull) کا ترجمہ اہمیت کا حامل ہے،اول الذکر ترجمہ عالم مشرق نامی جرنل میں 1911ء میں شائع ہوا۔

10.4 تاریخ قرآن:

قرآن کریم سے متعلق استشراقی مطالعات کا دوسرا اہم محور تاریخ قرآن ہے۔اس ضمن میں نزول قرآن،شان نزول،ترکیب،ہیئت،اسلوب،قراءتیں،لہجے اور قرآن کی تدوین وکتابت وغیرہ آتے ہیں۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان تمام موضوعات سے متعلق استشراقی مطالعات واعمال زمانی اعتبار سے انہیں موضوعات پر مسلمان علماء کے کاموں سے کافی پیچھے ہیں اور اس سلسلے میں مستشرقین نے کوئی نیا کام نہیں کیا ہے۔ان موضوعات پر بعض اہم کام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

الف: تاریخ قرآن کے موضوع پر ایک قابل ذکر کام جو انیسویں صدی کے نصف اول میں منصۂ شہود پر آیا، وہ فرانسیسی مستشرق بوتیر (Pauthur G.) متوفی 1873ء کے علمی مقالے ہیں جنھیں انتہائی محنت اور طویل عرصے میں ترتیب دیا گیا ہے۔ان مقالوں میں قرآن کے نزول اور بزعم مؤلف اس پر قدیم مذاہب اور تہذیبوں کے اثرات اور آنے والی تہذیبوں اور سماج پر قرآنی تاثیرات وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔بوتیر کے یہ مقالے 1840ء میں پیرس سے شائع ہوئے ہیں۔اس کتاب میں نہ تو موضوعات کا حق ادا کیا گیا ہے اور نہ ہی علمی گہرائی وگیرائی ہے۔

ب: گستاوویل(Gustav Weil) متوفی 1889ء کو انیسویں صدی میں تاریخ قرآن کے موضوع پر لکھنے والوں میں سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔بیسویں صدی میں بھی ویل کی کتاب ''قرآن کا تاریخی وتنقیدی مقدمہ'' تمام مستشرقین کے لئے ایک اہم مرجع رہی ہے۔ویل نے پیرس،الجزائر اور مصر میں عربی تعلیم حاصل کی تھی۔عربی زبان وثقافت سے اچھی واقفیت کے سبب ان کی یہ کتاب نہ صرف اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے بلکہ بڑی حد تک اس میں علمی منہج کی بھی اتباع کی گئی ہے۔چونکہ ویل ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تھے لہذا ان کا یہ عمل تلمودی اثرات سے خالی نہیں ہے۔ویل نے اپنی اس کتاب میں ایک دلچسپ دعویٰ کیا ہے کہ نبی اسلام ﷺ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ویل نے ایک اور جدت کی ہے وہ یہ کہ انہوں نے مکی سورتوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے

اور بعد کے کئی مستشرقین نے اس تقسیم کو اختیار کیا ہے ان میں سر فہرست نولڈ کے کا نام آتا ہے۔

ج: جرمن مستشرق نولڈ کے (Thedor Noldeke) متوفی 1930ء کی کتاب "قرآنی سورتوں کی اصل اور ان کی ترکیب" بھی اس موضوع پر ایک اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ یہ مستشرق نہ صرف سامی زبانوں کا ماہر تھا بلکہ سنسکرت اور فارسی وغیرہ کئی ہند آریائی زبانوں پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ یہ کتاب اس کی ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھی جو اس نے 1856ء میں مکمل کیا تھا۔ بعد میں اس نے اس کتاب میں مزید اضافے کئے اور اس کو 1860ء میں "قرآنی نصوص کی تاریخ" کے نام سے شائع کرایا۔ اس کتاب کو یورپ میں بڑی شہرت ملی اور اس کے کئی تحقیق شدہ نسخے شائع ہوئے۔ اس کتاب میں سورتوں اور آیتوں کے نزول کی تاریخ سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نولڈ کے نے اس کتاب کی ترتیب وتصنیف میں بڑی محنت، علمیت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس کی یہ کتاب غلطیوں سے مبرا نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے کتاب میں کئی جگہ قرآن کے محرف ہونے کا شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس بات کو اس نے دائرہ معارف اسلامیہ اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔

د: انگریز مستشرق ایڈورڈ سیل (Edward Sell) کی کتاب "قرآن کا تاریخی ارتقاء" بھی اس موضوع پر لکھی جانے والی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کی پہلی اشاعت مدراس (چنائی) سے 1898ء میں ہوئی تھی۔ یہ کتاب یورپ سے کئی بار شائع ہوئی سیل نے اسلامی عقیدہ اور علم تجوید پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔

ھ: مشہور مستشرق گولڈ زیہر (Goldziher) متوفی 1921ء کی کتاب "مسلمانوں میں تفسیری مذاہب" بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے کتاب میں گولڈ زیہر نے قرآن کی تفسیر اور اس کے ارتقاء پر مفصل گفتگو کی ہے یہ کتاب لندن سے 1920 میں شائع ہوئی۔ عربی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ کتاب میں اختلاف قراءت، تفسیر ماثور اور اسرائیلیات وغیرہ سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ خوارج، معتزلہ اور شیعہ کی تفسیری روایتوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ جب کہ تفسیر فقہی، بلاغی، لغوی اور علمی وغیرہ کا کتاب میں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ کتاب میں ایک تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن میں قراءتوں کا اختلاف وحی والہام کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ قراء کی خواہش ومیلان کے سبب تھا۔ عبدالوھاب حمودہ نے گولڈ زیہر کے ان اعتراضات اور شبہات کا مفصل جواب دیا ہے۔

و: بروکلمان (Karl Brockelmaan) متوفی 1956ء نے اپنی کتاب تاریخ ادب عربی کے دوسرے باب کی دوسری فصل میں تاریخ قرآن کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ بروکلمان نے وحی، مکی ومدنی سورتوں اور ان کی خصوصیات وغیرہ کو اپنا موضوع بنایا اور اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کاہنوں کے مسجع کے مشابہہ ہے۔

ز: گذشتہ صفحات میں رتجیس بلاشیر کے ترجمہ قرآن کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس ترجمے میں سات فصلوں پر مشتمل قرآن کا ایک مفصل تعارف ہے جس کی پہلی چار فصلیں تاریخ قرآن سے متعلق ہیں۔ ان میں قرآن کے لفظی واصطلاحی معنی، تدوین قرآن کے مراحل، سور واجزاء میں قرآن کی تقسیم، مکی سورتوں کا اسلوب، مدنی سورتوں کا اسلوب، رسم قرآنی، قرآن کریم، عربی علوم اور قرآن کی فکری وتہذیبی تاثیرات وغیرہ مضامین شامل ہیں۔

10.4.1 تحقیق، نشرواشاعت اور فہرست سازی:

مستشرقین کی علمی کاوش کا غالباً سب سے روشن اور تابناک پہلو یہی ہے۔ مستشرقین نے مسلمانوں کی علمی میراث کی حفاظت وصیانت کا کام کیا بلکہ تحقیق وتدوین اور فہارس وملحقات کے ذریعہ ان کتابوں سے استفادے کو آسان بنایا۔ مستشرقین کے مقاصد سے قطع نظر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر اس بیش بہا علمی سرمایہ کی اس بڑے پیمانے پر نگہداشت نہ کی جاتی تو اس کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا۔ مسلمانوں کی علمی میراث کی تحقیق واشاعت کا کام یوں تو تمام یورپ میں ہوا ہے لیکن جرمنی کو اس سلسلے میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

علوم قرآن سے متعلق کتابوں کی تحقیق واشاعت میں بھی جرمنی کو اولیت حاصل رہی ہے۔ بیوریا اکیڈمی (Bavaria Acadamy) کی ایک قرارداد کے بموجب میونخ یونیورسٹی میں ایک قرآن میوزیم قائم کیا گیا۔ جس میں دنیا بھر سے قرآن کے مخطوطات ومطبوعات اکھٹا کر کے جمع کیے گئے۔ علوم قرآن کی کتابوں اور ان کی تصویر کو جمع کیا گیا۔ حتیٰ کہ اگر قرآن یا قرآن سے متعلق کسی کتاب کا ایک صفحہ بھی دستیاب ہوا تو اسے بھی یہاں محفوظ کر لیا گیا اور اس طرح قرآن کے موضوع پر یہ دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا۔ اور مشہور جرمن مستشرق برگسٹر یسر (Bargstrasserg) متوفی 1933ء کو اس کا مدیر بنایا گیا۔ اور اوٹو پرسٹل (Otto Prestel) متوفی 1941ء کو ان کا نائب مقرر کیا گیا۔ ان قرآنی مرکز نے علوم قرآن سے متعلق کئی نادر ونایاب مخطوطات کو تحقیق کے بعد زیور طبع سے آراستہ کیا ہے جن میں

1- کتاب التیسیر فی القراءات السبع لابی عمرو عثمان بن سعید

2- کتاب مختصر الشواذ لابن خالویہ

3- کتاب المحتسب لابن جنی

4- کتاب المقنع فی رسم مصاحف الأمصار

5- غایۃ النہایہ فی طبقات القراء لابن الجزری اس کی دوسری طباعت آج تک نہیں ہوئی۔

6- کتاب معانی القرآن للفراء

7- کتاب الایضاح فی الوقف والابتداء لابی بکر الانباری

8- فضائل القرآن وآدبہ لابی عبید القاسم بن سلام

وغیرہ قابل ذکر ہیں واضح رہے کہ برگسٹر یسر اور پرسٹل دونوں نے قرآنی موضوعات پر بڑے وقیع مقالے تحریر کیے ہیں۔ تفسیر اور علوم قرآن سے متعلق کتابوں کی تحقیق واشاعت میں مختلف مستشرقین نے حصہ لیا ہے۔ ان سے چند اہم کام مندرجہ ذیل ہیں۔

1- اسرار التاویل وانوار التنزیل معروف بہ تفسیر بیضاوی کی تحقیق واشاعت کا کام جرمن مستشرق جی۔ ڈبلیو فریٹاگ (Fraytag G.W) متوفی 1861ء نے انجام دیا۔

2- زمخشری کی تفسیر کشاف کی تحقیق واشاعت انگریز مستشرق ولیم لیز (Lees W.N) متوفی 1889ء نے کی۔ لیز برٹش انڈیا میں ایک بڑے فوجی عہدے پر فائز تھے۔ کلکتہ کالج کے پرنسپل اور استعماری حکومت کے ترجمان بھی رہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت کو لکاتہ سے

ہی ہوئی۔

3- جلال الدین سیوطی کی اتقان فی علوم القرآن کی تحقیق واشاعت کا کام مشہور آسٹریائی مستشرق اسپرنگر(Sprenger A) متوفی 1893ء نے کیا۔اسپرنگر نے برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں بطور طبیب ملازمت کرتے تھے۔

4- ولیم میور(Muir Sirwilliem) متوفی 1905ء میں کتاب ''شہادۃ القرآن لکتب انبیاء الرحمان'' کو 1860ء میں الہ آباد سے شائع کیا۔

5- امریکی مستشرق آرتھر جیفری(Jaffery A) نے سجستانی کی کتاب المصاحف کو اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کیا۔کتاب کے مصنف صاحب سنن ابی داؤد کے صاحبزادے ابوبکر ابن ابوداؤد متوفی 316ھ/928ء ہیں۔

قرآن کریم کی لفظی اور معنوی یا موضوعاتی فہرستوں کا کام بھی مستشرقین نے شروع کیا۔علمی نقطہ نظر سے یہ ایک مہتم بالشان کام ہے۔ سب سے پہلے اس کا کا آغاز ولیم بڈویل(Bedwell W) متوفی 1632ء میں ترکی زبان میں کیا۔یہ فہرست 1615ء میں لیڈن سے شائع ہوئی۔یہ ایک ابتدائی نوعیت کا کام تھا جس میں بہت ساری فنی خامیاں تھیں۔

قرآن کریم کی منظم علمی فہرست سازی کے آغاز کا سہرا جرمن مستشرق گوسٹا فلوگل(Flugel G) متوفی 1870ء کے سر بندھتا ہے۔ جنہوں نے 1842ء میں'' نجوم الفرقان فی أطراف القرآن'' کے نام سے قرآن کی فہرست شائع کی۔یہ عربی زبان میں قرآنی الفاظ ومفردات کی پہلی فہرست تھی۔فواد عبدالباقی نے اسی کتاب کو سامنے رکھ کر'' المعجم المفہرس لألفاظ القرآن الکریم'' مرتب کی اور اس میں بعض اصلاحات بھی کی۔

ایک دوسرے آسٹریائی مستشرق ماہلیر (Eduard Mahler) متوفی 1945ء نے فلوگل کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے دلیل القرآن کے نام سے ایک فہرست تیار کی اور اس میں اسماء وافعال کے ساتھ ساتھ حروف جر اور عطف کو بھی شامل کر لیا اور اسمقصد کے حصول کے لئے انہوں نے تمام سورتوں اور آیتوں کی ترقیم بھی کی۔فرانسیسی مستشرق بیوم(Jules La Beaume) متوفی 1876ء نے قرآن کی پہلی موضوعاتی فہرست تیار کی۔بیوم نے اپنی اس فہرست کو اٹھارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔اور ہر باب کے تحت ذیلی ابواب تیار کئے ہیں جن کی مجموعی تعداد 350 ہے اور ان موضوعات کے تحت قرآنی آیات کو تقسیم کیا ہے۔ایڈورڈ مونٹیٹ متوفی 1927ء نے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ایک تفصیلی فہرست کا اضافہ کیا ہے۔فواد عبدالباقی نے اس موضوعاتی فہرست کا عربی میں ترجمہ کیا ہے اور مونسٹیٹ کے اضافے کو بھی مستدرک کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔عربی نسخے کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

قرآنی مفردات اور موضوعات کی فہرست کے کام میں فلوگل اور بیوم کے کاموں کے بعد اس موضوع پر مزید گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ لہذا فہرست سازی کا یہ کام قرآن اور قرآنی علوم پر لکھی جانے والی کتابوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ چنانچہ انگریز مستشرق چارلس اسٹورے(Storey C.A) متوفی 1968ء نے انڈیا آفس میں موجود قرآن اور علوم قرآن سے متعلق کتابوں کی ایک ببلیوگرافی تیار کی۔ اسٹورے انگلو محمڈن اورینٹل کالج (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں 1914ء میں عربی کے پروفیسر بنائے گئے تھے۔انہیں ایک عرصے تک انڈیا آفس لائبریری میں بھی مختلف مناصب پر رہنے کا موقع ملا تھا۔ان کی کتاب ادبیات فارسی کے پہلے حصے میں علوم قرآن سے متعلق کتابوں

کی فہرست شامل ہے۔

استنبول کے مختلف کتب خانوں میں موجود علوم قرآن کی کتابوں کی ایک فہرست جرمن مستشرق ہلمت ریٹر (Hellmut Ritter) متوفی 1971ء نے تیار کی۔ اور جرمن کے ایک استشراقی رسالے میں 1928ء میں شائع کیا۔

برگسٹریسر متوفی 1933ء نے قراء قرآن کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ایک فہرست تیار کی۔

10.4.2 علمی مقالات ومطالعات:

قرآنی ادب سے متعلق مستشرقین کی خدمات کا یہ چوتھا میدان ہے۔ قرآن کریم کے تراجم، علوم قرآن پر مستقل تصنیفات اور علوم قرآن کے متعلق مخطوطات کی تحقیق واشاعت اور علمی فہرست سازی کے ساتھ ساتھ قرآن کریم سے متعلق استشراقی مطالعات کا ایک بڑا حصہ ان علمی رسائل اور مجلّات کے صفحات میں محفوظ ہے جو یورپ کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے تھے اور مستشرقین کی علمی نگارشات ان کی زینت بنتی تھیں۔ ان مقالات کا تعلق قرآن میں وارد مختلف موضوعات سے ہوتا ہے۔ جیسے عقیدہ، فقہ، بلاغت، قصص، خطاب قرآنی وغیرہ۔ ذیل میں ان میں سے کچھ اہم علمی مقالات، ان کے کاتبین اور ان سے متعلق معلومات نشر واشاعت کو ذکر کیا جا رہا ہے۔ درحقیقت یہ مقالات اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کا احاطہ کرنے کے لئے کئی جلدوں کی ضرورت ہے۔

1- نبی اسلام اور قرآن کے حوالے سے ڈچ مستشرق وتھ (Veth P.J) متوفی 1895ء کے پانچ مقالے ہالینڈ سے 1845ء میں شائع ہوئے۔

2- قرآن میں آخرت پر استدلال کے موضوع پر دنمارکی مستشرق پیڈرسین (Pedersen J) کا مقالہ۔

3- ''حضرت عیسیٰ قرآن کریم میں'' کے عنوان سے اڈولف گروہمان (Grohmann) کا ویانا کے اورینٹل جرنل میں شائع شدہ مقالہ۔

4- ''قرآن میں یہودیت اور نصرانیت'' جرمن مستشرق ومستارک (Baumstarka) مجلّہ: اسلام 1927ء۔

5- ''قرآن کی معتزلین کی شرح'' میکلانجلو جویدی، روم 1925ء۔

6- ''ابراہیم علیہ السلام قرآن میں'' وان جنیپ (Van Gennep) مجلّہ عالم اسلامی 1912ء۔

7- ''خلیفہ متوکل باللہ اور مسئلہ خلق قرآن'' منگنا الفانس (Mingana A) متوفی 1937ء مانچسٹر 1922,23ء۔

8- ''قرآن میں غیر عربی الفاظ'' فرینکل (Fraenkels) متوفی 1909ء یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو سن 1887ء میں لیڈن سے شائع ہوا۔

9- ''قرآن مکہ کے عوامی لہجے میں'' کارل وولرس (Vollers K) متوفی 1909ء۔

10- ''نصوص قرآن'' مرگلیوتھ مجلّہ عالم اسلامی 1925ء۔

11- ''اعجاز قرآن''، جیمس روبسن (Robson J) جرنل اورینٹل اکیڈمی گلاسگو 1929ء۔

12- قرآن سے متعلق امریکی مستشرق آرتھر جیفری کے مقالات جو امریکی جرنل برائے سامی زبان وادب، رسالہ الاسلام، رسالہ جدید مشرق، رسالہ عالم الاسلام، رسالہ اسلامی مطالعات وغیرہ میں 1932ء سے لے کر 1947ء کے درمیانی عرصے میں شائع ہوئے ہیں۔

معلومات کی جانچ

۱۔ یوروپ میں قران کا پہلا ترجمہ کس نے کیا۔

۲۔ انگریزی زبان میں قران سب سے مقبول ومشہور ترجمہ کس کا ہے۔

۳۔ مسلمانوں میں تفسیری مذاہب کس مستشرق کی کتاب ہے۔

10.5 حدیث اور علوم حدیث

یہ بات معروف ہے کہ مستشرقین نے اپنے ابتدائی عہد میں حدیث شریف اور اس کے علوم کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اور کئی صدیوں تک زبان وادب اور علوم قرآن وعقیدہ ہی ان کی تحقیقات اور ان کے مطالعات کا محور تھے۔ سترہویں صدی کے آخر میں حدیث نبوی استشراقی مطالعات کا حصہ بنی۔ اور ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کے مطابق فرانسیسی مستشرق ہربلو (Herbelot) متوفی 1695ء نے سب سے پہلے حدیث کو اپنا موضوع بنایا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مستشرقین کی توجہ حدیث نبوی کی جانب مبذول ہوئی۔ اور اس سلسلے کا سب سے اہم کام 1890ء میں منظر عام پر آیا۔ اور یہ کام مشہور مستشرق اگناس گولڈ زیہر کی کتاب'' اسلامی مطالعات'' ہے جس کا جرمن میں عنوان (Muhammedaniche Studein) ہے۔ استشراقی حلقے میں یہ کتاب اپنے موضوع پر ''انجیل'' کا درجہ رکھتی ہے۔

حدیث نبوی سے متعلق استشراقی اعمال کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تحقیق، تصنیف اور ترجمہ۔

تحقیق: جرمن مستشرق کریل (Krehl L) متوفی 1901ء نے صحیح بخاری کے پہلے تین حصوں کی تحقیق کا کام کیا جو ۱۸۶۲-۱۸۶۸ء کے درمیانی وقفے میں لیڈن سے شائع ہوا۔ چوتھا حصہ جونیبول (Juynboll W) متوفی 1948ء نے 1908ء میں لیڈن سے اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کرایا۔

ولیم مارسے (Marcais W) متوفی 1889ء کی تحقیق کے ساتھ امام ابن حجر عسقلانی کی کتاب ''نخبۃ الفکر'' 1854ء میں کولکاتا سے شائع ہوئی۔

فرڈینینڈ وسٹنفیلڈ (Wustenfeld F) نے امام ذہبی اور امام سیوطی کی طبقات الحفاظ کو جرمنی کے شہر گوٹنگن سے ۱۹۲۴-۱۹۳۴ء کے درمیان شائع کرایا۔

کرنکو فرنس (Krenkow Fr) متوفی 1953ء نے ابن ابی حاتم کی کتاب جرح وتعدیل کی تحقیق کی جو دائرہ معارف عثمانیہ سے 1952ء میں شائع ہوئی۔

ب۔ مطالعات وتصنیفات:

انیسویں صدی کے نصف آخر میں مستشرقین نے تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ حدیث شریف پر مقالے، بحثیں اور کتابیں لکھنے کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے اس جانب کایتانی (Caelani) ولیم میور اور اسپرنگر نے توجہ دی۔ بعد میں اور بہت سے مستشرقین اس کارواں میں شامل ہوگئے جن میں سے کئی ایک کے نام بطور محقق بھی گزر چکے ہیں۔ دوسرے ناموں میں قابل ذکر نولڈکے (Noldeke)، جوزف ہاروچ (Horovits J) متوفی 1938ء اس مستشرق نے بطور استاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں خدمات بھی انجام دی ہیں۔ جوھان فوک (Fuck J) متوفی 1974ء، الورڈ ولیھم (Ahlward W) متوفی 1909ء، ونسنک (Wensinck A.J) متوفی 1939ء، جیمس روبسن، ڈرمنگھم (Dermenghem E) اور اسنوک ہرگرونج (Snouck Hurgron) متوفی 1936ء وغیرہ ہیں۔

حدیث شریف سے متعلق مندرجہ بالا محققین ومصنفین کے مقدمات ومقالات اور مضامین اپنی تاثیر اور گہرائی دونوں اعتبار سے بے حد محدود رہے۔ لیکن اس ضمن میں مستشرقین کے قلم سے تین ایسی کتابیں وجود میں آئیں جو غیر معمولی اثرات کی حامل رہیں۔ ان میں سب سے اہم کام اگناس گولڈ زیہر کی کتاب ہے جس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ اس کے بعد شاخت (Schacht J.) نے اسی نہج پر اس موضوع کو آگے بڑھایا۔ اور تیسرا قابل ذکر کام الفریڈ گیوم (Guillaume A) متوفی 1966ء کا ہے، ذیل میں ان تینوں کتابوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

-1 ''مطالعات اسلامیہ'' (Muslim Studies):

کتاب کے مصنف اگناس گولڈ زیہر ہنگری کے مستشرق تھے جو اصلاً یہودی تھے۔ یورپ اور عرب ملکوں میں تعلیم حاصل کی از ہر کے اساتذہ سے بھی استفادہ کیا۔ مغرب میں حدیث کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے ہیں۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں مادہ ''حدیث'' کے مصنف ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''حدیث کے موضوع پر گولڈ زیہر کی تحریروں کا خود علم منت کش احسان ہے'' شاید ہی کسی مستشرق نے دوسرے مستشرقین پر اتنا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا ہو جتنا اس ہنگرین مستشرق نے۔ اور اس نے اپنی تحقیقات سے مطالعہ حدیث کے جو خطوط وضع کردئے یورپ آج تک اسی پر گامزن ہے۔ جبکہ کتاب کی پہلی اشاعت 1890ء کو سوا سو سال گزر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر شاخت (Schacht J) متوفی 1969ء اور پروفیسر اسنوک ہرگرونج وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں گولڈ زیہر نے پورے ذخیرۂ حدیث کو مشکوک قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں یہ تمام حدیثیں دوسری اور تیسری صدی ہجری میں وضع کی گئیں۔ بلکہ اس نے یہ رائے پیش کی ہے کہ عہد صحابہ میں ہی وضع حدیث کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اور زیادہ تر حدیثوں کو فقہی' کلامی اور سیاسی جماعتوں نے وضع کیا ہے۔

-2 ''شریعت محمدی کے اصول'' (The Origins of Muhammadan Jurisprudence):

گولڈ زیہر کی مذکورہ بالا کتاب جس میں انہوں نے احادیث کو موضوع قرار دیا تھا، کے ساٹھ سال بعد جوزف شاخت کی یہ کتاب شائع ہوئی، شاخت نے ان کی عدم صحت کو یقینی اور حتمی قرار دیا۔ اس کتاب نے نہ صرف مستشرقین کو متاثر کیا بلکہ عالم اسلام میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی پڑی۔ بہت سی کتابیں اس کے رد میں لکھی گئیں جن میں سرفہرست ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی کتاب ''السنۃ ومکانتھا فی التشریع

الاسلامی'' ہے۔

شاخت نے اس کتاب میں مؤطا امام مالک اور امام شافعی کی کتاب الأم کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور پھر حاصل مطالعہ کو حدیث وفقہ کی تمام کتابوں پر نافذ کر دیا۔ شاخت کے مطابق امام شافعی نے ہی حدیث کی حجیت کے اصول کو وضع کیا ہے۔ مستشرقین کے درمیان حدیث کے باب میں اس کام کو حرف آخر سمجھ لیا گیا اور بقول پروفیسر جب (Gibb) مستقبل میں شاخت کی یہ کتاب اس موضوع پر کم از کم مغرب میں ہونے والے تمام کاموں کی بنیاد رہے گی۔

3۔''احادیث اسلام'' الفریڈ گیوم کی یہ کتاب گولڈ زیہر کی کتاب کا عکس ہے۔ انگریزی میں (The Tradition of Islam) کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی جس میں جیوم نے پوری طرح سے گولڈ زیہر پر بھروسہ کیا ہے۔

ج ترجمہ:

مستشرقین نے حدیث کی چند کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ولیم مارسے نے امام نووی کی دو کتابوں التقریب اور التیسیر کا ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں بخاری شریف کا بھی فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے۔ مارسے ایک طویل عرصے تک مراکش میں رہے اور انہیں عربی زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اس سلسلے میں دوسرا اہم نام پروفیسر رابسن کا ہے انہوں نے بھی حدیث کی دو کتابوں ''مشکاۃ المصابیح'' اور امام حاکم کی کتاب ''مدخل'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

یہ چند اہم اعمال ہیں جو مستشرقین نے علم حدیث کے باب میں انجام دیئے ان کے علاوہ بہت سارے مستشرقین نے ادبی' تاریخی' کلامی اور فقہی بحوث کے ضمن میں حدیث شریف کو اپنا موضوع بنایا۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر انہیں خطوط پر چلتے رہے جو گولڈ زیہر اور شاخت نے بنائے تھے۔ نیکلسن' جب' واٹ (Montgomery Watt) متوفی 2006ء ونسنک وغیرہ بیشتر مولفین نے اس موضوع پر صرف ثانوی درجے کے اضافے کئے۔

بعض مستشرقین نے گولڈ زیہر اور شاخت سے جزئی اختلافات بھی کئے ہیں۔ جیسے پروفیسر رابسن کا خیال ہے کہ کچھ حدیثیں ایسی ہیں جنہیں صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہذا ان کے نزدیک شاخت کا مطلقا ساری احادیث کو غیر صحیح اور موضوع قرار دینا پوری طرح درست نہیں ہے۔ رابسن نے کایتانی اور اسپرنگر سے بھی حضرت عروہ بن زبیرؓ کی سندوں کے فرض ہونے کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے۔ خود اسپرنگر نے اپنے مقالے ''مسلمانوں کے نزدیک تدوین وثائق کے اصول'' میں گولڈ زیہر اور شاخت کے برخلاف عہد نبوی میں تدوین حدیث کو تسلیم کیا ہے۔

حدیث شریف سے متعلق استشراقی مطالعات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات نے حدیث کی تنقید کے سلسلے میں صرف اپنے ذوق اور خواہش کو ہی سامنے رکھا ہے۔ مثلاً گولڈ زیہر نے امام زہری پر الزام لگایا کہ انہوں نے حدیث ''لا تشد الرحال......'' کو وضع کیا ہے جبکہ یہ حدیث امام زہری کے علاوہ دوسرے طرق سے بھی مروی ہے۔

گولڈ زیہر نے سارے ذخیرہ حدیث کو مشکوک قرار دیا اور اس سلسلے میں دوسرے دلائل کے ساتھ اس حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کیا کہ ''عنقریب میری حدیثوں کی کثرت ہوگی تو اگر تم سے کوئی حدیث روایت کرے تو اسے قرآن پر پیش کرو اگر وہ قرآن کے مطابق ہو تو میری

حدیث ہے ورنہ نہیں"۔(مفہوم)

جو نبی کریم ﷺ کی نبوت ورسالت کے قائل نہیں ہیں ان کے لئے ان حدیثوں کو قبول کرنا جو معجزات اور خوارق سے متعلق ہیں ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ پروفیسر نکلسن نے شق صدر والی حدیث کو ماننے سے انکار کردیا۔ ان کے خیال میں یہ حدیث "الم نشرح لک صدرک" کی تفسیر میں وضع کی گئی ہے۔

پروفیسر گب (Hamilton Jibb) متوفی 1971ء نے حدیث شریف "من کذب علی متعمدا............" کوموضوع قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں وضع حدیث کی تحریک کو روکنے کے لئے یہ حدیث وضع کی گئی ہے۔ اس استدلال میں جو خرابی ہے اس سے قطع نظر یہ ایک متواتر حدیث ہے۔ امام مناوی نے فیض القدیر میں لکھا ہے کہ اسے دوسو صحابیوں نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث چارسو طریقوں سے مروی ہے۔

ونسنک نے حدیث "بنی الاسلام علی خمس......" کوموضوع قرار دیا ہے ان کے گمان میں اس حدیث کو مسلمانوں نے شام میں عیسائیوں سے متاثر ہو کر وضع کیا ہے۔ چونکہ شہادت وگواہی کا تصور ایک عیسائی تصور ہے اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ "شہادت" کلمۂ اذان اور نماز تینوں کا حصہ ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ مستشرقین نے حدیث کی تصنیف اور اس میں تشکیک کے سلسلے میں کلی طور پر اپنے ذوق وخواہش پر اعتماد کیا ہے۔

حدیث اور علوم حدیث کے متعلق مستشرقین کا مرکزی موضوع اسلامی شریعت کے دوسرے ماخذ کے سلسلے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا محسوس ہوتا ہے۔ ان مطالعات میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے زیادہ شکوک پیدا کرنے میں دلچسپی نظر آتی ہے۔ بعض اہم شبہات جن کا ان مطالعات میں کثرت سے ذکر ملتا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

1- حدیث کی تدوین کا کام دوسو سال کے بعد شروع ہوا لہذا ان کی صحت وسلامتی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

2- اگر حدیث ضروری ہوتی تو اس کی حفاظت کا بھی ویسا ہی انتظام ہوتا جیسا کہ قرآن کی حفاظت کا ہوا۔

3- قرآن میں ہر شئے کا بیان ہے لہذا اس کے بعد کسی دوسرے مصدر کی ضرورت نہیں ہے۔

4- نبی اسلام ﷺ نے خود حکم دیا ہے کہ قرآن پر پیش کئے بغیر مجھ سے منسوب کسی حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

5- نبی اسلام ﷺ نے قرآن کی کتابت کا حکم دیا اور حدیث کی کتابت سے منع کیا۔

6- مستشرقین کے گمان میں بہت سی حدیثیں قرآن سے متعارض ہیں اس کی مثال میں قرآن کی آیت " فاقرؤا ما تیسر من القرآن (یعنی قرآن میں سے جو میسر آئے (نماز میں) پڑھو۔) اور حدیث "لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب" (یعنی بغیر سورہ فاتحہ کے کوئی نماز نہیں) کو پیش کرتے ہیں۔

7- حدیث کی روایت کرنے والے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اموی اور عباسی فوجوں کا حصہ تھے لہذا وہ اقتدار وسلطنت کی حمایت میں

حدیث وضع کرتے تھے۔

8- مستشرقین جرح وتعدیل اور توثیق وتخریج میں علمائے حدیث کے اختلاف کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ان کے خیال میں ان علماء نے اپنی پسند کی حدیثوں کے راویوں کی توثیق کی ہے۔

9- پہلی صدی ہجری میں سند کا وجود نہیں تھا۔

ان تمام شبہات کے تفصیلی جواب دیئے گئے ہیں۔تفصیلات کے لئے ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی کتاب ''السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی'' اور ڈاکٹر محمد بہاء الدین کی کتاب ''المستشرقون والحدیث النبوی'' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

مؤخر الذکر نے بعض مستشرقین سے ہی ایسے اقوال نقل کئے ہیں جو ان شبہات کی تردید کرتے ہیں ان میں گستاو جرونیوم (Gustave E von Grunebavi) متوفی 1972ء اور ٹریٹن (A.S. Tritton) متوفی 1973ء وغیرہ کے اقوال وآراء شامل ہیں۔

حدیث کے مطالعے میں مستشرقین کی غلطیوں کے متعدد اسباب ہیں جن میں چند اہم اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

1- اسلام اور رسول اسلام پر عدم ایمان

2- عربی زبان کے ذوق کا فقدان

3- عربی تہذیب وتمدن سے ناواقفیت

4- محدثین کے تنقیدی مناہج سے روگردانی

5- خواہش نفس کی پیروی

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث نبوی کے تعلق سے زیادہ تر مستشرقین کی تحقیقات حق وصواب سے دور رہیں۔البتہ اس قیمتی علمی میراث کے بعض حصوں کی حفاظت وصیانت مستشرقین کا بڑا کارنامہ ہے۔

اسی طرح ان کتابوں کی ببلیوگرافی کا جو کام بروکلمان وغیرہ نے کیا ہے اس کی قدر وقیمت بھی ہر شک شبہ سے بالاتر ہے۔یونہی احادیث نبویہ کے معاجم کی تیاری بھی قابل ذکر کام ہے۔جن میں سرفہرست ونسنک (Wensinck A.J) متوفی 1939ء کا نام آتا ہے۔جن کی دو کتابوں کو لازوال شہرت ہوئی اور انٹرنیٹ کے عام ہونے سے پہلے ان دونوں کتابوں کی مدد کے بغیر حدیث نبوی میں کوئی قابل ذکر کام کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔یہ کتابیں ہیں:

1- مفتاح کنوز السنۃ: یہ حدیث کی چودہ اہم کتابوں کی ایک معجم یا ڈائرکٹری ہے۔اس کے ذریعہ مختلف موضوعات سے متعلق احادیث تک رسائی آسان ہوجاتی ہے۔

2- المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی: یہ صحاح ستہ، سنن دارمی، مؤطا امام مالک اور مسند امام احمد کی الفبائی فہرست ہے۔اس کتاب کی ترتیب میں ونسنک کے ساتھ دوسرے مستشرقین نے بھی حصہ لیا۔اس کی تکمیل سے پہلے ونسنک کی وفات ہوگئی۔یہ کتاب عربی میں تیار کی گئی جبکہ

مفتاح کنوزالسنۃ کی زبان انگریزی تھی، جسے فواد عبدالباقی نے عربی میں منتقل کیا ہے۔

معلومات کی جانچ

۱۔ کس مستشرق نے حدیث کو سب سے پہلے اپنا موضوع بنایا۔

۲۔ نخبۃ الفکر کس مستشرق کی تحقیق کے ساتھ کولکاتا سے شائع ہوئی۔

۳۔ کس کتاب میں گولڈزیہر نے پورے ذخیرۂ حدیث کو مشکوک قرار دیا۔

۴۔ مطالعہ حدیث شریف میں مستشرقین کی غلطیوں کے کوئی دو سبب ذکر کیجیے۔

10.6 فقہ

فقہ اسلامی فکر کی عملی تطبیق کا نام ہے۔ اسلامی فقہ کے حجم، وسعت اور تنوع کے پیش نظر بہت کم مستشرقین نے اس کی جانب توجہ کی ہے۔ چند ہی مستشرقین ہیں جو اس وسیع وعریض موضوع کے لیے خاطر خواہ وقت ومحنت صرف کرنے کے لیے تیار ہوئے ورنہ زیادہ تر نے گولڈزیہر اور شاخت وغیرہ کی تحقیقات سے نقل واستفادہ کرنے پر ہی اکتفاء کیا ہے۔ مستشرقین نے فقہ اسلامی کی طرف اس لیے توجہ دی کیونکہ اسلام کی پوری اور کامل فہم کے لیے فقہ اسلامی اور اس کے ارتقاء سے واقفیت ناگزیر ہے۔

حدیث کی طرح فقہ کی جانب بھی مستشرقین کی توجہ تاخیر سے ہوئی' خود شاخت جنہوں نے فقہ کے میدان میں تمام مستشرقین سے زیادہ کام کیا ہے، نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ فقہ اسلامی میں مستشرقین کی خدمات ماضی قریب میں شروع ہوئیں اور یوروپ میں انیسویں صدی کے نصف آخر سے اسلامی فقہ کے مطالعے کا آغاز ہوا۔ دراصل نوآبادکاروں اور مغربی استعمار کو اپنے مقبوضہ علاقوں اور نوآبادیات خاص کر جہاں مسلمانوں کی اکثریت یا معتدبہ تعداد تھی وہاں کے عدالتی نظام کو چلانے کے لیے اسلامی فقہ کی ضرورت پیش آتی۔ چنانچہ ان مطالعوں کی ابتداء فقہ اسلامی کی معروف کتابوں کے ترجمے سے ہوئی۔ ہندوستان میں فقہ حنفی کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور مغرب عربی میں فقہ مالکی کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور اسی طرح دوسرے فقہی مذاہب کی کتابیں۔

دوسرے مرحلے میں مستشرقین نے مختلف جوانب سے فقہ کا مطالعہ شروع کیا۔ مثلاً شریعت کے احکام، ان کے اصول ومصادر، مسلمانوں میں فقہی مطالعے کا ارتقاء اور مسلمانوں میں قانون سازی کی تاریخ کا آغاز وارتقاء وغیرہ۔ یوں تو بے شمار مستشرقین نے فقہ اسلامی کو اپنی تحقیقات ومطالعات کا موضوع بنایا۔ لیکن خود مستشرقین کے نقطہ نظر سے اس سلسلے میں سب سے اہم اور قابل توجہ کام گولڈزیہر نے کیا۔ جنہوں نے سب سے پہلے اسلامی فقہ کی اصالت اور اس کی قدامت پر سوال اٹھایا۔ اور چار سو صفحات کی طویل بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی عقیدہ اور شریعت کا مصدر آسمانی نہیں بلکہ زمینی ہے۔ البتہ اس زمینی مصدر کے بارے میں مستشرقین میں اختلاف ہے۔ کوئی اسے تلمود

سے ماخوذ مانتا ہے تو کوئی اسے رومیوں سے ،شیلڈون اموس (Sheldon Amos) متوفی ۱۸۸۶ء نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ شریعت محمدی رومی شہنشاہ جسٹینین اول (Justinan I) کی طرف منسوب قوانین کا چربہ ہے ۔ مستشرقین کے خیال میں یہ رومی قوانین جو جسٹینین (Justinan I) کے عہد 527-565ء میں وضع کیے گئے ۔ وہ مصر وشام کے علمی و تعلیمی حلقوں میں معروف تھے بلکہ بیروت اور اسکندریہ وغیرہ شہروں میں ان کی تدریس ہوتی تھی مسلم فقہاء نے انہیں مراکز سے یہ قوانین حاصل کیے۔

دراصل مستشرقین کی فکری اور نفسیاتی الجھن یہ ہے کہ وہ اس عظیم اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط قوانین کے آسمانی ماخذ ہونے کو تسلیم نہیں کرتے اور زمین پر اتنے مختصر عرصے میں کوئی قانون ارتقاء کے اتنے مراحل طے کر لے اس بات کو عقل تسلیم نہیں کرتی ، لہذا کبھی اسے تلمود سے ماخوذ بتاتے ہیں جس میں عربوں نے اپنے ماحول وطبیعت کی آمیزش کر دی ، تو کبھی اسے رومی قوانین سے ماخوذ مانتے ہیں ۔ چونکہ وہ اس شریعت کے حقیقی مصدر کو مانتے نہیں ہیں جو کہ آسمانی ہے اور زمینی مصادر میں سے کسی تیسرے مصدر کی گنجائش نہیں ہے لہذا تمام مستشرقین کی کاوشیں انہیں دونوں مصادر کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں ۔

مستشرقین دلائل اور براہین کے ذریعہ ان نتائج تک نہیں پہنچے بلکہ ان نتائج کو پہلے مان لیا اور بعد میں ان کی تقویت کے لیے دلائل کی تلاش شروع کی ۔ ان کے بعض دلائل مندرجہ ذیل ہیں جن کا ذکر گولڈ زیہر اور شاخت وغیرہ نے کیا ہے اور جن کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی فقہ رومی قوانین سے متاثر ہے۔

1. فقہ اسلامی اور جسٹینین کے قوانین کی بعض اصطلاحات بظاہر ملتی جلتی ہیں جیسے: فقہ ، رائے اور اجماع وغیرہ۔

2. رومی قوانین مصر وشام کے مدارس میں پڑھائے جاتے تھے اور یہ فطری بات ہے کہ وہاں آنے کے بعد مسلمان ان سے متاثر ہوئے ہوں گے کیونکہ رومی تہذیبی طور پر مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے ۔ دونوں جگہ رومی قوانین نافذ تھے۔

3. امام شافعی اور امام اوزاعی کا تعلق مصر وشام سے تھا اور انسان اپنے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے ۔ بلکہ بعض مستشرقین نے یہاں تک گمان کیا کہ امام اوزاعی نے بیروت کے مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی اور امام شافعی کو اصول فقہ میں پہلی کتاب لکھنے میں اسی لیے سبقت حاصل ہوئی کیونکہ وہ رومی قانون سے پہلے سے واقف تھے۔

4. عرب کے قوانین ان کے اعراف وعادات تھے ۔ جن پر رومی قانون کا پہلے ہی سے اثر تھا کیونکہ عرب شام ومصر کی اپنی تجارت کے سبب ان قوانین سے واقف تھے ۔ ان اعراف وعادات نے اسلامی قوانین پر اثر ڈالا اور اس طرح یہ بھی بالواسطہ رومی قانون کے اثر سے متاثر ہوئے۔

اسی قسم کے دلائلا سلامی فقہ کے تلمود سے متاثر ہونے کے بارے میں بھی دیے جاتے ہیں ۔ فرانسیسی مستشرق بوسکے (Bousquet G.H.) متوفی 1978ء پورے جزم ویقین کے ساتھ فیصلہ دیتے ہیں کہ اسلام عقیدۓ عبادات اور معاملات سبھی میں یہودی فکر سے متاثر ہے ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بوسکے رومانی اثرات کو بھی یقینی ہی مانتے ہیں۔

فقہ اسلامی کی اصل اور اس کے مصدر و ماخذ کے ساتھ ساتھ مستشرقین نے اس کے ارتقاء پر بھی گفتگو کی ہے ۔ شاخت کے مطابق فقہ

اسلامی کی ابتدا کے قدیم ترین مظاہر بھی پیغمبر اسلام کی وفات کے سو سال بعد سے ملنا شروع ہوتے ہیں۔ اور اس کا آغاز کتاب وسنت سے نہیں بلکہ یہ عوامی اور انتظامی تعامل سے ترقی پذیر ہوا ہے۔ چونکہ وفات رسول کے بعد قانون سازی کے امکانات ختم ہوگئے تھے لہذا جدید ضرورتوں کے لیے کتاب وسنت اور اقوام صحابہ میں تاویل سے کام لیا گیا اور تاویلات میں حسب ضرورت توسع ہوتا رہا یہاں تک کہ یہ تاویلات اصل معنی سے بہت دور چلی گئیں۔ اور بقول ان کے انہیں تاویلات کی تائید کے لیے وضع حدیث کا سلسلہ شروع ہوا۔ شاخت نے اپنی کتاب ''شریعت محمدیہ کے اصول (The Origins of Islamic Jurisprudence) میں ان آراء کا اظہار کیا جو کہ 1967ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اپنی دوسری کتاب ''اسلامی قانون کا ایک تعارف (An Introduction to Islamic Law) میں بھی انہیں باتوں کا ذکر کیا ہے۔ مؤخر الذکر کتاب آکسفورڈ سے 1964ء میں شائع ہوئی۔ شاخت کی انہیں آرا کی بازگشت ہمیں اینڈرسن، رابسن، کولسن اور نارمن کولڈ (Norman Kolde) وغیرہ کی تحریروں میں ملتی ہے۔ یہاں تک کہ اسلامی فقہ کے بارے میں شاخت کے نظریات قول فیصل مانے جاتے ہیں اور ان کی مخالفت علم کے مسلمات کی مخالف سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے لکھا ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی میں ایک طالب علم نے شاخت کی تنقید کو اپنے مقالے کا موضوع منتخب کیا تو اسے اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

اسلامی فقہ کے بارے میں مستشرقین پر گولڈ زیہر اور شاخت کے گہرے اثرات کے باوجود کچھ ایسے مستشرقین ہیں جنہوں نے دلیل کے ساتھ فقہ اسلامی کی استقلالیت کی بات کہی ہے۔ اور اسے تلمود اور رومی اثرات سے پاک قرار دیا ہے اور ان میں سرفہرست کارلو نللینو (Carlo Nallino) متوفی 1931ء ہیں۔

تحقیق، ترجمہ اور اشاعت

اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں تقریباً پورا افریقہ اور ایشیا، یورپ کی نوآبادیات میں داخل تھا اور عالم اسلام بھی اس میں شامل تھا۔ مسلم ممالک میں نظام حکومت کو چلانے کے لیے وہاں رائج فقہی مذاہب سے واقفیت مغربی استعمار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مستشرقین اس کام کے لیے آگے آئے اور حنفی، مالکی اور شافعی فقہ کی بہت سی کتابوں کو انگریزی، فرانسیسی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ کیا۔ بعض مستشرقین دوسرے اغراض سے بھی متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا اور ان کتابوں کی تحقیق واشاعت کا کام بھی ہوا۔ ان میں بعض کام مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ لارڈ اسٹانلے (Lord Stanlay) نے امام اعظم کی فقہ اکبر کو اپنی تحقیق کے ساتھ 1882ء میں لندن سے شائع کیا۔ جرمن مستشرق ہلوان (Hell Von J.) نے جرمن زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔

ب فرانسیسی مستشرق بوسکے (Bousquet G.H.) متوفی 1973ء نے فقہ حنفی کی کتاب قدوری کا ترجمہ کیا اور شائع کیا۔ شافعی فقہ پر ایک کتاب لکھی جس میں فرانسیسی قانون سے شافعی فقہ کا موازنہ کیا کتاب کا نام ہے۔ ''جزائر میں فرانسیسی واسلامی قانون اور عرف وعادت''۔

ج ایچ۔ آر۔ رسل (H.R. Russel) نے فقہ مالکی میں رسالہ ابن ابی زید کی تحقیق کی اور انگریزی ترجمے کے ساتھ 1906ء میں لندن سے شائع کیا۔

د فیناں (E.Fagnon) نے ابن ابی زید کی اسی کتاب کو فرانسیسی ترجمے کے ساتھ 1916ء میں پیرس سے شائع کیا۔ کتاب کی تفصیلی فہرست بھی تیار کی۔

11.1 تمہید

11.2 مقصد

11.3 سیرت

11.3.1 سیرت عہد وسطیٰ میں

11.3.2 سیرت نبوی عہد جدید میں

11.4 سوانح

11.5 تصوف

11.6 خلاصہ

11.7 نمونے کے امتحانی سوالات

11.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

11.1 تمہید

اسلام کی تاریخ نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ سے شروع ہوتی ہے۔اور آپ ﷺ کی ذات بابرکات اسلامی عقیدہ، شریعت، اخلاق اور آداب کی عملی تطبیق اور نمونہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ امت نے روز اول سے اس سیرت کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔اور آپ کی سیرت کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جسے محفوظ نہ کیا گیا ہو۔چنانچہ نہ کسی نبی ورسول کی سیرت اور نہ کسی بھی سربرآوردہ شخص کے حالات زندگی اس طرح جمع کیے گئے ہیں جس طرح نبی عربی ﷺ کی سیرت کے جمع وتدوین کا کام کیا گیا ہے۔آپ ﷺ کی زندگی کے چھوٹے بڑے تمام واقعات حوادث کو حدیث وسیرت کی کتابوں میں محفوظ کرلیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی سیرت کو اپنے تمام بندوں کے لیے نمونہ عمل بنایا ہے۔لہذا ضروری تھا کہ اس سیرت کے سارے پہلوؤں کی حفاظت کی جائے۔قرآن نے جابجا آپ ﷺ کی پیروی کا حکم دیا ہے۔اس حکم کی تعمیل کے لیے آپ کی سیرت سے واقفیت ضروری ہے۔قرآن فہمی کے لیے بھی آپ کی سیرت کی معرفت ضروری ہے کیونکہ آپ کی سیرت قرآنی اجمالات کی تفسیر اور اس کا بیان ہے۔

جب مستشرقین نے اسلام کے مطالعے کی طرف توجہ کی تو انھوں نے قرآن کے بعد سب سے زیادہ سیرت ہی کو اپنا موضوع بنایا۔اور اس پر بے شمار کتابیں لکھیں اور نبی اسلام کی سیرت کا اپنے اپنے نقطہ نظر سے مطالعہ کیا۔کتاب وسنت کے راوی اور ناقل ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں نے صحابہ اور تابعین کی سوانح کو بھی تفصیل کے ساتھ مرتب کیا۔اور حدیث رسول کی حفاظت وصیانت کے پیش نظر علم رجال جیسے فن کو وضع کیا جس نے سیرت وسوانح نگاری کے فن کو ایسی بلندیوں تک پہنچا دیا۔جس سے آگے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔مستشرقین نے صحابہ تابعین، ائمہ مجتہدین اور صالحین امت کی سوانح کو بھی اپنا موضوع بنایا۔اس اکائی میں سیرت وسوانح سے متعلق استشراقی مطالعوں کا ذکر کیا

جائے گا۔اور تصوف اور تصوف سے متعلق شخصیات پر استشراقی اعمال کا جائزہ لیا جائے گا کیونکہ یہ بھی استشراقی مطالعات کا اہم گوشہ ہے اور امت مسلمہ کی علمی میراث کا ایک اہم حصہ بھی۔

11.2 مقصد

اس اکائی کا مقصد سیرت نبوی،سوانح نگاری اور علم تصوف کے ابواب میں مستشرقین کی خدمات کا جائزہ لینا ہے۔اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ نہ صرف ان علوم میں مستشرقین کے کاموں اور ان کاموں کی مقدار اور نوعیت سے واقف ہونگے بلکہ ان کی لغزشوں اور ان کے ذریعے کی جانے والی تحریفات سے بھی مطلع ہونگے۔یہ اکائی طلبہ کو ان اسباب سے بھی روبرو کرائیگی جو مستشرین سے صادر ہونے والی عمداً یا سہواً غلطیوں کے پس پشت کارفرما تھے۔

11.3 سیرت

مستشرقین کی جانب سے کیے جانے والے اسلامی مطالعات میں سیرت طیبہ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔اور سیرت کے حوالے سے مستشرقین کے اعمال نے اہل مغرب کی عقلوں پر بہت گہرے اور دوررس اثرات چھوڑے ہیں اور اسلام وپیغمبر اسلام کے بارے میں مغرب کی فکر کو تشکیل دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔بلکہ ان تحریروں نے مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی متاثر کیا ہے۔

سیرت نبوی سے متعلق مستشرقین کی آراء وافکار اور ان کے مقالات وتصنیفات کو دو عہد میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔انیسویں صدی سے پہلے کا عہد جسے عہد وسطی یا متوسط عہد کہا جاتا ہے اور انیسویں صدی اور اس کے بعد کا عہد جسے عام طور پر عہد جدید کہا جاتا ہے۔

سیرت عہد وسطیٰ میں

عہد وسطیٰ میں نبی اسلام ﷺ کی شخصیت اور سیرت سے متعلق مغربی نقطہ نظر دینی بنیادوں پر وجود میں آیا تھا۔جو بغض ونفرت اور عداوت سے بھرا ہوا تھا۔اس عہد میں مستشرقین نے نبی اسلام ﷺ کی جیسی صورت گری کی تھی وہ نہ صرف غیر علمی تھی بلکہ بڑی حد تک مضحکہ خیز بھی تھی۔اس صورت کی تعمیر وتشکیل میں کلیسا اور متعصب پادریوں کا نمایاں کردار تھا۔اس میں عہد نبی کریم ﷺ کے بارے میں نہ صرف خلاف واقعہ بلکہ خلاف عقل باتیں مشہور تھیں۔اس کا ایک سبب صلیبی جنگوں میں مغرب کی عبرتناک شکست بھی تھی اور اہم سبب مغربی اقوام کو اسلام سے دور رکھنے کی کوشش بھی تھی۔یہاں تک کہ انیسویں صدی کے متعدد مستشرقین جو اسلام کی مخالفت کے حوالے سے جانے جاتے ہیں وہ بھی عہد وسطی کے ان استشراقی افکار وآراء سے برأت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔محمد البہی اپنی معروف کتاب ''جدید اسلامی فکر اور مغربی استعمار سے اس کا ربط'' میں سیرت رسول ﷺ سے متعلق عہد وسطی کی تحریروں کے کئی نمونے پیش کیے ہیں۔مثلاً: کتاب ''دین حق کی تلاش'' کا مصنف لکھتا ہے کہ:

> ''مشرق میں ایک دشمن ظاہر ہوا ہے اور وہ اسلام ہے جس کی بنیاد طاقت اور شدید قسم کے تعصب پر ہے۔محمد (ﷺ) نے اپنے پیروکاروں کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔اور اخلاق کے مقدس ترین قوانین کو نظر

انداز کر دیا ہے اور اپنے متبعین کو فسق و فجور اور لوٹ مار کی اجازت دے دی ہے اور لڑائیوں میں مارے جانے والوں کو جنت میں دائمی لذت اندوزی کی بشارتیں دی ہیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایشیائے کوچک، افریقہ اور اسپین ان کا شکار بن چکا ہے۔''

ایک اور کتاب ''اسلامی میتھولوجی'' کا مصنف لکھتا ہے کہ:

''دین محمدی ایک جذام کی مانند ہے جو لوگوں میں پھیلا ہے اور انہیں ہلاک کر رہا ہے۔ یہ ایک بھیانک مرض اور عمومی فالج ہے یہ ایک ایسا ذہنی جنون ہے جو لوگوں کو غافل اور کاہل بنا کر رکھتا ہے اور یہ لوگ صرف قتل و خونریزی کے لیے بیدار ہوتے ہیں یا شراب نوشی کے لیے اٹھتے ہیں۔ اور مکہ میں محمد کی قبر ایسا پاور ہاؤس ہے جو مسلمانوں میں جنون، بے عقلی اور ہسٹریا پیدا کرتا ہے۔''

''تاریخ فرانس'' کا مصنف جولیان لکھتا ہے کہ:

''مسلمانوں کے دین کے بانی محمد (ﷺ) نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ سارے عالم کو زیر کریں اور تمام دینوں کو دین اسلام میں بدل دیں، اور یہی فرق ہے ان بت پرستوں (مسلمانوں) اور عیسائیوں میں۔ عرب نے اپنے دین کو طاقت کے ذریعے لوگوں پر مسلط کیا اور لوگوں سے کہا کہ یا تو ایمان لاؤ یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب کہ عیسائیوں اور مسیح کے پیروؤں نے لوگوں کو اپنی نیکی اور بھلائی کے ذریعہ راحت دی۔''

اگرچہ مستشرقین کی تحریروں میں یہ رنگ انیسویں صدی میں بھی ملتا ہے۔ البتہ سب وشتم اور واضح تاریخی حقائق کا انکار نہیں ملتا لیکن منہج میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔ پیش کش کا انداز ضرور بدل گیا ہے اور جنگجویانہ اور کلیسائی اسلوب کی جگہ مادی، لادینی اور استشراقی اسلوب نے لے لی ہے۔ اور سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے سیرت کے بارے میں جو کچھ مغرب میں لکھا جاتا تھا اس کا ماخذ عیسائی پادریوں کی تحریریں ہوتی تھیں، انیسویں صدی کی تحریروں میں عربی اسلامی مصادر کا استعمال کیا گیا لیکن ان مصادر میں وارد نصوص کی تاویل و تفسیر مستشرقین نے اپنے صواب دید سے کی۔

عہد وسطیٰ میں سیرت نبوی پر لکھی جانے والی قدیم ترین کتاب پادری سکندر ڈیبون (Alexandre D.) کی ''محمد'' ہے جسے اس نے 1258ء میں تحریر کیا تھا۔ ایک طویل عرصے تک یہ کتاب مغرب میں بنیادی مصدر کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ لوگ اسے تاریخ اور سیرت کی مستند کتاب مانتے رہے جب کہ یہ کتاب تاریخ و سیرت نویسی کے ادنیٰ ترین معیار پر بھی پوری نہیں اترتی تھی۔ اس عہد میں سیرت نبوی پر دوسرا اہم کام ٹورمیڈا (A. Turmeda) متوفی 1432ء نے کیا۔ ٹورمیڈا اسپین کے شہر (Palma De Mallorca) میں پیدا ہوا جسے عرب میورقہ کہتے ہیں۔ اس کی کتاب کا نام ''کتاب النبوات'' تھا جسے اس نے اٹلی میں تحریر کیا تھا۔ اس کتاب میں اس نے رسائل اخوان الصفا سے کافی استفادہ کیا تھا یہ کتاب بھی ایک زمانے تک یورپ میں مرجع کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی ہے۔

فرانسیسی میں اس کتاب کے چار ترجمے ہوئے ایک ترجمہ جرمن زبان میں بھی ہوا۔

سیرت نبوی عہد جدید میں

اس عہد میں عہد وسطی کے الزامات، اوصاف اور لفظیات کا خاتمہ ہوا۔ اور زیادہ علمی اور معروضی بنیادوں پر سیرت نبوی کا کام ہوا۔ اگر چہ ان میں بہت سارے مستشرقین نے اپنی تنقیدات اور شکوک وشبہات میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا۔ سیرت نبوی پر کام کرنے والے انیسویں صدی کے مستشرقین میں ولیم میور (Muir W.)، کوسن ڈی پرسی وال (Caussin de Perceval) متوفی 1871ء تھیوڈر نولڈکے، مرگلیوتھ، اسپرنگر، کارلال، ڈوزی (Dozy R.P.A) متوفی 1883ء اور اسنوک ہرگرونج وغیرہ ہیں۔ سیرت نبوی پر کام کرنے والے بیسویں صدی کے مستشرقین میں کایتانی، ماسینیون، فادر لامینس (Lammens) متوفی 1937ء ایڈورڈ مونٹیٹ، ہوڈاس (Houdas O) متوفی 1916ء، کاسانووا (Casanova P.) متوفی 1926ء گلیلیوم (Guillaume)، مونٹگومری واٹ آرنلڈ (Arnold W.T)، کارل بروکلمان، ڈرمنگھم اور ولہاوزن (Welhausen J.) وغیرہ شامل ہیں۔

ان مستشرقین کے علاوہ بھی ایک طویل فہرست ان مغربی مصنفین کی ہے جنہوں نے سیرت نبوی کو اپنا موضوع بنایا۔ اگر چہ جدید عہد کے ان مغربی سیرت نگاروں کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے سیرت کا منہجی اور معروضی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن فی الواقعی ایسا نہیں ہے۔ اگر چہ ان میں سے کئی ایک نے جزئی طور پر حقائق کا اعتراف کیا ہے لیکن کوئی بھی پوری طرح سے غیر جانبدار نہیں رہ سکا ہے۔ کلیسا اور دینی اثرات سے آزادی بھی انہیں مکمل طور پر معروضی نہیں بنا سکی اور یہ حضرات قومی، استعماری اور اشتراکی افکار کے زیر اثر حقیقت تک رسائی نہیں حاصل کر سکے۔

عہد وسطی سے قطع نظر عہد جدید کے مغربی سیرت نگار بھی مختلف اسباب کی وجہ سے غلطیوں کا شکار ہوئے۔ ڈاکٹر عماد الدین خلیل اپنی کتاب "المستشرقون والسیرۃ النبویۃ" میں ان اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

1. شکوک وشبہات میں مبالغہ، مفروضات کی کثرت اور ضعیف روایات پر اعتماد عہد جدید کے تمام مغربی سیرت نگاروں کے درمیان قاسم مشترک ہے۔ اپنے شکوک کو واقع کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ایسے خود ساختہ امکانات اور افتراضات کو پیش کرتے ہیں جن کا تاریخ میں دور دور تک کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ نبی اسلام ﷺ کے نام تک میں شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی جس کی اصلاً کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے۔ ایمیل ڈرمنگھم نے اپنی کتاب حیات محمد (The Life of Mohmet) میں اس امر پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ولیم میور، مرگلیوتھ، اسپرنگر، فادر لامنس، ماسینیون، مونٹیٹ، نولڈکے، ڈوزی اور کایتانی جیسے ماہرین میں کئی ایک نے مبالغہ آمیز شدت سے کام لیا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں:

"Sometimes, unfortunately, certain of these specialists fell into the error of exessive radicalsim"

(بسا اوقات، بدقسمتی سے، ان ماہرین میں سے بعض شدت پسندی میں حد سے تجاوز کرنے کی غلطی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔)

فادر لامینس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Father lammens, one of the most erudite of recent specialists, is unfortunately one of the most partial also".

(ان معاصرین میں سے ایک ماہر ترین شخصیت فادر لامینس بدقسمتی سے سب سے زیادہ جانبدار بھی ہیں۔)

مزید لکھتے ہیں کہ: فادر لامنس نے اپنی عمدہ اور تحقیقی کتابوں کو اسلام اور نبی اسلام سے اپنی نفرت کے چلتے برباد کرلیا ہے۔

بعض مستشرقین نے سیرت کے ان واقعات کو جنہیں وہ قبول نہیں کرنا چاہتے اس حجت سے ان کا انکار کردیا ہے کہ یہ واقعات قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ واقعات واحداث کو مشکوک بنانے میں بھی وہ اس دلیل کا استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے استدلال کا ایک نمونہ شبرنگر کا یہ استدلال ہے کہ نبی اسلام ﷺ کا نام قرآن میں چار بار آیا ہے اور سورہ آل عمران' احزاب' محمد اور فتح میں وارد ہوا ہے اور یہ چاروں سورتیں مدنی ہیں۔ لہذا آپ ﷺ کا یہ نام بطور علم ہجرت سے پہلے استعمال نہیں ہوا تھا۔ اور اسے آپ ﷺ نے عیسائیوں سے ملاقات کے بعد اور ان کی کتاب انجیل سے متاثر ہو کر اختیار کیا۔

مستشرقین کے افتراضات کے حوالے سے ہی بنی نضیر کے یہودیوں کے اخراج والے واقعے کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ کئی مستشرقین کا خیال ہے کہ یہ قدم اس لیے اٹھایا گیا تھا کہ احد کی شکست کی بھرپائی کی جاسکے۔ جب کہ مسلم سیرت نگاروں نے اس واقعہ کے کئی وقیع اور اہم اسباب کا ذکر کیا ہے۔ جن میں نبی اسلام ﷺ کی قتل کی کوشش اور قریش مکہ وغیرہ سے مل کر اسلام و مسلمانوں کے خلاف سازش وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن مستشرقین نے اپنے مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے صحیح ترین روایات کا انکار کردیا۔ اور اس سلسلے میں جو دلیل پیش کی وہ بھی کسی مفروضے سے کم نہیں ہے' اور کسی بھی صورت میں قابل قبول دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے بیان کردہ اسباب درست ہوتے تو ان کا ذکر سورۂ حشر میں ضرور ہوتا جو اس واقعے کے بعد یعنی بنی نضیر کے یہودیوں کے اخراج کے بعد نازل ہوئی ہے

مستشرقین کا ایک وطیرہ یہ بھی ہے کہ وہ شکوک کو بڑھانے کے لیے حقائق کو مبہم اور غیر واضح انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً بروکلمان لکھتا ہے کہ:

''پھر مسلمانوں نے بنی قریظہ پر حملہ کیا اور ان یہود کا طرز عمل تمام معاملات میں غیر واضح تھا۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلوب تحریر غیر واضح ہے اور شکوک کو بڑھانے والا ہے۔ یہاں بروکلمان کو وضاحت سے لکھنا چاہیے تھا کہ یہود بنی قریظہ نے بدترین قسم کی عہد شکنی کی تھی۔ مختلف احزاب اور قبائل کو مسلمانوں کے خلاف جمع کرنے کی سازش میں شریک ہوئے تھے اور ایک بڑے امتحان کی گھڑی میں معاہدہ کو توڑا تھا۔

مستشرقین جب سیرت کے کسی واقعے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو بے حد ضعیف بلکہ شاذ روایت کو بھی قبول کرلیتے ہیں۔ اور جب کسی واقعے کا انکار کرنا چاہتے ہیں تو صحیح ترین روایت کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔

2. عہد جدید کے مستشرقین پر قدیم فکری وراثت' ماحول' لادینیت اور اشتراکی نظریات کا بھی گہرا اثر پڑا ہے۔ اور یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ کوئی مستشرق ان اثرات سے پوری طرح سے باہر نکل سکے۔ اطالوی اصل نومسلم ماہر اسلامیات' اتیان ڈینٹ (Dinet Et) متوفی 1929ء نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ: ہم محمد عربی (ﷺ) کو جرمن لہجے میں بات کرتے ہوئے پاتے ہیں اگر کتاب کا مصنف جرمن ہوتا ہے۔ اطالوی لہجہ بولتے ہوئے پاتے ہیں اگر لکھنے والا اطالوی ہوتا ہے...... اور اس طرح کاتب کے بدلنے سے آپ کی شخصیت بدلتی رہتی ہے۔ اور اگر

مستشرقین کی بنائی ہوئی ان تصویروں میں آپ کی حقیقی شخصیت تلاش کریں تو اس کا پانا بے حد مشکل ہے۔

مستشرقین کی صورت گری میں زمان ومکان کی رعایت بھی بہت کم ملتی ہے۔ بقول اتیان ڈینٹ ان قلمی تصویروں پر مغربی منطق اور معاصر تصورات کی پوری چھاپ ملتی ہے۔

ڈاکٹر جواد علی اپنی کتاب ''اسلام کے بعد عربوں کی تاریخ'' میں مشہور اطالوی مستشرق اور سیرت نگار کایتانی کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ مستشرقین متعین تصورات وافکار کے ساتھ سیرت لکھنا شروع کرتے ہیں اور صرف انہیں روایات کو لیتے ہیں جو ان کے افکار کی تائید کرتی ہوں۔

سیرت نبوی میں مستشرقین کی خطا کا ایک اہم سبب ان کا دنیوی اور مادی نقطہ نظر بھی ہے۔ لہٰذا الہامی امور کی تفسیر کرنے میں وہ غلطیاں کرتے ہیں۔ مثلاً ان حضرات کا خیال ہے کہ اسلام کی عالمیت کا تصور مکہ میں واضح نہیں تھا اور مدینہ میں جب اس کے لیے حالات بنے تو نبی اسلام نے اس تصور کو پیش کیا۔ جب کہ اسلام کی عالمیت پر دلالت کرنے والی بہت سی آیتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔ مگر ان کی موجودگی کے باوجود بہت سے مستشرقین اس بات پر مصر ہیں کہ اسلام کے عالمی دین ہونے کا خیال حیات رسول کے بالکل آخری حصے میں آیا۔ اور ان آیات کی خودساختہ تاویل کرتے ہوئے ولیم میور لکھتے ہیں کہ: محمد (ﷺ) نے خود کبھی اسلام کی عالمیت اور عالمگیریت کے بارے میں نہیں سوچا اور اگر فرض کرلیا جائے کہ انہوں نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہے تو یہ سوچ مبہم اور غیر واضح تھی اور ان کا عالم جس کے بارے میں وہ کبھی کبھی سوچتے تھے وہ جزیرۂ عرب تک محدود تھا۔

یہ کیسی عقلیت اور منہجیت ہے؟ اس کا جواب اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہوسکتا کہ مادی نقطہ نظر اس کے ماورا نہیں جاسکتا ہے اور یہ تاویلات اس کی مجبوری ہیں۔ اس مادی خیال اور دینوی نقطہ نظر نے مستشرقین سے سیرت کے ان تمام ابواب میں غلطیاں کرائیں جن کا تعلق وحی اور غیبیات سے تھا۔

3- سیرت نبوی کے موضوع پر مستشرقین کی غلطیوں کا تیسرا بڑا سبب اسلامی عقائد واحکام کو عیسائی یا یہودی اصل قرار دینے کی کوشش ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جواد علی لکھتے ہیں کہ: ''زیادہ تر مستشرقین کا تعلق مذہبی طبقات سے ہے۔ اور ان میں سے بڑی تعداد عیسائی دینی اداروں سے تعلیم یافتہ ہے اور وہ جب اسلام کے ان حساس موضوعات کو برتتے ہیں تو وہ اس بات کی ممکنہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسے عیسائی اصل سے جوڑ کر دیکھیں اور عیسائی اصل کی طرف واپس کرنے کی کوشش کریں۔ ی یہودی مستشرقین بھی ایسی ہی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح یہ دونوں گروہ جذبات وخواہشات کی پیروی کرتے ہیں''۔

اول وہلہ میں اسلام اور عیسائیت میں بہت ساری مشابہتیں نظر آتی ہیں لیکن اگر بنظر غائر ان کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر نظر آنے والی مشابہتیں بے شمار اختلافات پر مشتمل ہیں۔ لیکن مستشرقین صرف مشابہتوں سے گفتگو کرتے ہیں اختلافات کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اور اگر ان اختلافات کو موضوع بھی بناتے ہیں تو آدھے ادھورے انداز میں تاکہ اپنے اس زعم کو ثابت کرسکیں کہ اسلام عیسائیت کی ایک نامکمل اور بگڑی ہوئی صورت ہے۔

مذہبی زعم تعصب اور احساس تفوق کی چند مثالیں دیکھیے:

بروکلمان اپنی کتاب ''تاریخ ملل اسلامیہ'' میں لکھتے ہیں:

''تھوڑے ہی عرصے میں محمد (ﷺ) اور یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودی اس دور دراز خطے میں بھی اپنے معمولی علم کے باوجود بھی نبی اسلام سے علم و ادراک میں فائق تھے۔''

دینی تعصب کے سوا اس خلاف واقعہ بیان کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ:

''احد کی ہزیمت سے محمد (ﷺ) کی فوجی عظمت کو جو نقصان ہوا تھا' اسے انہوں نے دوسرے ذرائع سے پورا کرنے کی کوشش کی اور وہ ذریعہ تھا یہودیوں کا خاتمہ چنانچہ بے حد کمزور بہانے کو لے کر بنی نضیر پر حملہ کر دیا۔''

اس موضوع کو لے کر مرگلیوتھ بھی یہودیوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ محمد اور طلوع اسلام (Mohammed and the Rise of Islam) نامی کتاب میں لکھتے ہیں کہ: محمد (ﷺ) نے ہجرت کے پہلے چھ سال لوٹ مار میں گزارا لیکن اس عرصہ میں انہوں نے مکہ والوں کو لوٹا جس کے لیے ان کے پاس معقول وجہ تھی کہ اہل مکہ نے انہیں ان کی جائے پیدائش سے بھگایا تھا اور ان کا مال ضائع ہوا تھا۔ مدینہ کے یہودی قبائل کے خلاف بھی حقیقی یا فرضی اسباب رہے ہوں گے۔ لیکن خیبر جو کہ مدینے سے بہت دور واقع تھا اور وہاں والوں نے محمد (ﷺ) اور ان کے متبعین کے حق میں کوئی ظلم وزیادتی بھی نہیں کی تھی، اور ان میں سے کسی کا ان کے پیامبر کو قتل کر دینا کوئی ایسا گناہ بھی نہ تھا جسے بہانہ بنا کر پورے خیبر سے بدلہ لیا جاتا۔''

اور اس کے بعد ایک طویل بحث میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ طاقت ملنے کے بعد دھیرے دھیرے نبی اسلام کی سیاست بدلتی چلی گئی تھی۔ اور انہوں نے وہی کیا جو ان سے پہلے سکندر نے اور ان کے بعد نپولین نے کیا۔

عجیب وغریب بات ہے کہ اپنے مذہبی تعصب میں یہ حضرات ان تمام روایتوں کو ایک سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جن میں یہودیوں کی سازشوں کا ذکر ہوا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ روایتیں ابن ہشام اور واقدی نے بھی ذکر کی ہیں۔ جن کے حوالے سے یہ لوگ یہودیوں کی مظلومیت ثابت کرنے کے درپے ہیں۔

سیرت نبوی کے حوالے سے مستشرقین کے کاموں کے کئی گوشے ہیں۔ ان میں سیرت نبوی کی قدیم کتابوں کی تحقیق واشاعت اور ان کا ترجمہ' سیرت نبوی پر مستقل کتابیں' مقالات' مضامین' مطالعات اور سیرت کی ترجمہ شدہ کتابوں پر مقدمات وغیرہ شامل ہیں۔ اس ضمن میں دائرہ معارف اسلامیہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جس میں شامل سینکڑوں مضامین کا سیرت نبوی سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق ہے۔

برطانوی مستشرق مارسڈن جونس (Marsden Jones) نے واقدی کی کتاب المغازی کا ترجمہ کیا جسے آکسفورڈ یونیورسٹی نے 1966ء میں شائع کیا۔ جونس امریکن یونیورسٹی قاہرہ میں قائم مشرقی زبانوں کے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ انہوں نے اپنے اس ترجمے پر ایک علمی مقدمہ اور ایک تفصیلی فہرست کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ڈی گوتج۔ ایم۔ جے (Goeje De) متوفی 1909ء نے تاریخ طبری (تاریخ الرسل والملوک) کا ترجمہ کیا اور اس ضخیم کتاب کو اپنے ترجمے اور تحقیق کے ساتھ شائع کیا۔ ٹورنبرگ (Tornberg K.J) متوفی 1878ء نے کئی دوسرے مستشرقین کے ساتھ مل کر ابن اثیر کی کتاب ''کامل فی التاریخ'' کے ترجمہ اور تحقیق کا کام کیا۔ جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے آخری جلد

فہارس اور استدراکات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ڈی جونگ (Jong P. De) نے سیرت ابن ہشام کی تحقیق کی اور اسے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا یہ کام لیون سے 1881ء میں شائع ہوا۔ پھر اس کتاب کی تحقیق کا کام جرمن مستشرق وسٹینفیلڈ نے کیا اور اس پر جرمن زبان میں مقدمہ اور فہارس کا اضافہ کیا۔

سیرت سے متعلق مستشرقین کے اہم کاموں میں تھومس کارلائل (Carlyle) متوفی 1881ء کی معروف کتاب ''ہیروز اینڈ ہیروز ورشپ'' کی ایک فصل جس میں نبی اسلام کا تذکرہ کیا ہے۔سیمون ویل (Weil S.) کی کتاب نبی محمد جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ اسپرنگر نے بھی تین جلدوں پر مشتمل سیرت پر ایک کتاب تصنیف کی اس کتاب کی تصنیف میں نولڈکے نے بھی تعاون کیا۔ہملٹن گب کی کتاب دین محمد (1949) الفریڈ گیوم اور آرنلڈ نے بھی اپنی کتابوں میں سیرت کے موضوع پر تفصیلی طور پر لکھا ہے۔ آرنلڈ کی کتاب اسلام کی تبلیغ (Preaching of Islam) اور گیوم نے اپنی کتاب ''اسلام'' میں بھی سیرت نبوی کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی حالانکہ ان کی یہ کتاب تعصب سے بھری ہوئی ہے۔اور آخر میں سیرت پر مستشرقین کا سب سے اہم کام مونٹگمری کی دو کتابیں ہیں۔محمد مکہ میں اور محمد مدینہ میں۔ ایک اور کتاب Mohammed Prophet and Statesman بھی اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ان تینوں کتابوں کے ساتھ مونٹگمری کا نام سیرت پر لکھنے والوں میں سرفہرست آتا ہے۔1931ء میں شائع ہونے والے مرگلیوتھ (Margoleouth D.S) کی کتاب ''محمد اور طلوع اسلام'' اور ولہاوزن کی کتاب ''اسلامی ریاست کی تاریخ'' بھی مستشرقین کے ذریعے سیرت پر لکھی جانے والی اہم کتابوں میں سے ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار مقالات ومضامین ہیں جو مستشرقین نے مختلف کتابوں، رسالوں، سالناموں اور دائرہ معارف جیسی کتابوں میں تحریر کیے ہیں۔اس موضوع پر مستشرقین کے بہت سارے مطبوعہ لکچرز بھی ہیں۔

سیرت نبوی کے موضوع پر ولیم میور نے تعصب کے ساتھ کام کیا ہے تو اتیان ڈینٹ نے اپنی کتاب ''محمد رسول اللہ'' اور کونسٹانس جورجیو نے اپنی کتاب ''سیرت رسول پر نئی نظر'' میں بڑی حد تک انصاف سے کام لیا ہے۔اور اس فہرست میں بوڈلے Bodley R.V.E کی کتاب ''محمد رسول'' کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

معلومات کی جانچ

۱۔ تاریخ فرانس کے مصنف کا کیا نام تھا۔

۲۔ انیسویں صدی میں سیرت پر کام کرنیوالے دو مستشرقین کا نام بتائیے۔

۳۔ سیرت پر مرگلیوتھ نے کون سی کتاب لکھی ہے۔

11.4 سوانح

مستشرقین نے سوانح کے باب میں دو قسم کے کام کئے ہیں ایک تو مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں اور مستشرقین کے مخصوص رسالوں اور مجلات میں مقالات کی صورت میں یہ کام انجام دیا ہے۔دوسرے خود مسلمانوں کی لکھی ہوئی سوانح، طبقات اور تراجم کی کتابوں کو بحث وتحقیق اور ترتیب وتدوین کے ساتھ شائع کیا ہے۔دونوں قسم کے کاموں کی تعداد سینکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔اور استشراق کے تمام مدارس نے

اس موضوع کو اہمیت دی ہے۔ ذیل میں استشراق کے تین مدرسوں کے نمائندہ مستشرقین کے اس نوعیت کے بعض کاموں کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

الف۔ برطانیہ

1. سی جے لیال (Lyall C.J.) متوفی 1920ء نے شعراء عرب کے سوانحی خاکوں پر مشتمل کتاب شائع کی۔

2. مرگلیوتھ (Margolionth D.S.) متوفی 1940ء نے کئی اہم کتابوں کو اپنی تحقیق و تدوین کے ساتھ شائع کیا جن میں یاقوت حموی کی معجم الادباء بھی شامل ہے، جسے لیڈن سے سات جلدوں میں شائع کیا۔ اس کتاب کی اشاعت 1907ء سے لے کر 1926ء کے درمیان ہوئی۔ اور مرگلیوتھ نے 1912ء میں لندن سے سمعانی کی مشہور زمانہ کتاب ''الانساب'' کو بھی زیور طبع سے آراستہ کیا۔

3. نکلسن (Nicholson R.A.) متوفی 1945ء نے سیرت و سوانح کی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اور کئی کتابوں کی تحقیق و اشاعت کی ہے۔ ان میں سب سے اہم شیخ فریدالدین عطار کی کتاب تذکرہ الاولیاء کی اشاعت ہے جسے نکلسن نے 1905ء میں لیڈن سے شائع کیا۔ انہوں نے کئی صوفیہ کی سوانح عمری مرتب کی جن میں جلال الدین رومی (کیمبرج 1950ء) ابن فارض اور ابن عربی وغیرہ شامل ہیں۔

4. مارگریٹ (Margaret Smith) نے رابعہ بصریہ کی ایک تفصیلی سوانح حیات مرتب کی اور رابعہ عدویہ ایک صوفی خاتون کے نام سے 1930ء میں شائع کی۔

5. ڈونالڈسن (Donaldson D.M.) نے مختلف مصادر سے جمع کر کے حضرت سلمان فارسی کی سوانح لکھی ہے۔ اس کتاب میں حدیث و تفسیر اور سیرت و تراجم اور تاریخ ادب کی تقریباً تمام کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

6. فرٹس کرنکوو (Krankow Fr.) برطانوی مستشرق تھے جو ایک طویل عرصے تک ہندوستان میں رہے اور دائرہ معارف عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ تحقیق سے وابستہ رہے اور کئی کتابوں کی تحقیق و تدوین کا کام کیا تنہا بھی اور دوسروں کے ساتھ مل کر بھی۔ سیرت و سوانح سے متعلق آپ کا سب سے اہم کام ابونعیم کی کتاب ''حلیۃ الاولیاء'' اور ابن حجر عسقلانی کی کتاب ''الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ'' کی تحقیق و تدوین ہے۔ ان میں سے اول الذکر قرون اولی کے عابدوں، زاہدوں اور صالحین کی سوانح پر مشتمل ہے جب کہ مؤخر الذکر کتاب کا تعلق آٹھویں صدی ہجری کی اہم شخصیات سے ہے ان دونوں اہم کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام دائرہ معارف عثمانیہ کے نمایاں کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران ہی کرنکوو نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام سالم کرنکوی رکھ لیا تھا۔ 1953ء میں انتقال ہوا۔

7. ہیملٹن گب (Hamilton Gibb) مشہور برطانوی مستشرق تھے۔ مختلف عربی اسلامی علوم و فنون پر کام کیا۔ صلاح الدین ایوبی کی تفصیلی سوانح لکھی۔

8. آربری (A.J. Arberry) متوفی 1969ء برطانوی مدرسہ استشراق کے ایک نمایاں عالم تھے۔ جنید بغدادی کی تفصیلی سوانح لکھی ہے۔ مصر کے جدید عربی شعراء حافظ اور شوقی کے سوانحی خاکوں پر مشتمل کتاب تیار کی ہے۔ اور ''ابن سینا' زندگی اور عہد'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔

9 برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) متوفی 2006ء مشہور برطانوی اصل' امریکی سکونت اور یہودی نژاد مستشرق ہیں۔ اسرائیلی

حکومت کے مشیر رہے ہیں۔ ''صلاح الدین اور حشاشین'' کے عنوان سے صلاح الدین ایوبی کی سوانح تیار کی ہے۔ شیعوں کے فرقہ اسماعلیہ پر بہت کام کیا ہے۔

ب۔ فرانس

1. لانگلس (Langlas L.) متوفی 1824ء نے فرانسیسی زبان میں تیمور لنگ کی سوانح لکھی اور 1787ء میں اسے پیرس سے شائع کرایا۔

2. ہوڈاس (Houdas O) متوفی 1916ء نے سلطان جلال الدین منکبرتی کی سیرت پر سنوی کی کتاب کی تحقیق کی اور اسے دو جلدوں میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ 1891ء میں شائع کیا۔

3. بیسٹ (Basset Rent) متوفی 1924ء نے امام بوصیری کے قصیدے کے متن کی تدوین کا کام کیا اور اس کی شرح لکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ صاحب قصیدہ کی مفصل سوانح حیات بھی تحریر کی۔

4. ہوارٹ (Hurat Cl.) متوفی 1927ء نے بھی سوانح پر کئی کام کیے۔ شاعرہ فضل بصریہ کی مبسوط سوانح لکھی جسے 1881ء کے ایشیاٹک جرنل میں شائع کیا۔ اس سلسلے میں ان کا دوسرا اہم کام شمس الدین احمد فلکی کی کتاب مناقب العارفین کی اشاعت بھی ہے جو ہوارٹ کی تحقیق وتدوین کے ساتھ 1918ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب سلسلہ مولویہ کے بزرگوں کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔

5. الفریڈ بیل (Bel A.O.) متوفی 1945ء ایک طویل عرصے تک مراکش وغیرہ میں مقیم رہے اور وہاں کی تاریخ اور شخصیات پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں ''سیدی ابو فدین اور ان کے استاد دقاق'' ان دونوں صوفی شخصیات پر ایک اہم کتاب شمار کی جاتی ہے۔ جو 1925ء میں شائع ہوئی۔

6. کیرا ڈی واکس (Carra De Vaux) نے مفکرین اسلام کے نام سے پانچ جلدوں میں سینکڑوں اسلامی شخصیات کی سوانح حیات مرتب کی۔

7. لیوی پرووِنشال (Lavi Provencal) متوفی 1956ء۔ مشہور فرانسیسی مستشرق ہیں جنہوں نے تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین کے نمایاں کام انجام دیے ہیں۔ سوانح پر بھی ان کی کئی کتابیں اور مقالات ہیں۔ جن میں ''اخبار اولیائے مغرب'' (1920) ''فلسفی وزاہد ابن مسرۃ قرطبی'' (1956) اور مراکش اور اسپین سے تعلق رکھنے والی متعدد علمی اور ادبی شخصیات کی سوانح پر مشتمل کئی طویل مقالے ہیں جو مختلف استشراقی جرنلز میں شائع ہوئے۔

8. لوئیس ماسینیون (Massignon L.) نے دائرہ معارف اسلامیہ میں کندی، محاسبی، نوبختی، شستری اور ترمذی کی سوانح حیات لکھی۔

9. ڈرمنگھم (Dermengham E.) کا ذکر حضور کی سیرت طیبہ لکھنے والے مستشرقین کے ساتھ گزر چکا ہے۔ یہ جزائر کی مرکزی لائبریری کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے متعدد صوفی شخصیات کی سیرت وسوانح پر مشتمل کتابیں اور مقالات لکھے۔ مشہور صوفی حرالی پر ''حرالی

تیرہویں صدی کے ایک صوفی، عالم، فلسفی اور شاعر'' کے نام سے طویل مقالہ لکھا جو ادارہ مطالعات علوم شرقیہ کے جرنل میں 1948ء میں شائع ہوا۔ ''ابوبکر شبلی بغدادی صوفی شاعر'' کے عنوان سے ایک اور مقالہ مذکورہ جرنل کے 1949ء اور 1950 کے اعداد میں شائع ہوا۔ الجزائر کے مجاہد آزادی امیر عبدالقادر جزائری کی سیرت پر ''امیر عبدالقادر کچھ یادیں'' کے عنوان سے امریکن جرنل میں 1953ء میں ایک طویل مقالہ لکھا۔ ''مسلم اولیاء کی سیرت'' کے نام سے ان کی ایک مستقل کتاب ہے جو 1956ء میں الجزائر سے شائع ہو چکی ہے۔

ج۔ جرمن

1. فلوگل (Flugel G.) متوفی 1870ء نے حنفی فقہاء کے تذکروں پر مشتمل مشہور ترکی عالم ابن قطلوبغا کی دو کتابیں: طبقات الفقہاء اور تاج التراجم کو اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کیا۔ اور اس پر تفصیلی حاشیے بھی لگائے۔

2. اگسٹ مولر (Muller A.) متوفی 1892ء نے عیوان الانباء فی طبقات الاطباء کی تحقیق وتدوین کا کام کیا۔

3. وسٹنفیلڈ (Wustenfeled F.) متوفی 1899ء کا شمار بڑے جرمن مستشرقین میں ہوتا ہے۔ متعدد میدانوں میں کام کیا۔ سیرت اور سوانح کے موضوعات پر بھی کئی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اور طبقات وتراجم کے کئی مخطوطات کو تلاش کر کے اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ طبع کرایا۔ ان میں سب سے اہم کتابیں ہیں: بڑے محدثین کے تذکروں پر مشتمل ذہبی کی ''طبقات الحفاظ'' جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ وسٹینفیلڈ نے اسے اپنی تحقیق کے ساتھ 1833ء اور 1834 میں شائع کیا۔ عہد صحابہ کے بعد سے ساتویں صدی ہجری تک کی شخصیات کا سب سے مشہور و معتبر تذکرہ ابن خلکان کی کتاب وفیات الاعیان ہے۔ اس اہم کتاب کی اشاعت بھی انہوں نے ہی کی اور تیرہ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب 1935-1950ء کے درمیان زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ ابن اثیر جزری کی کتاب ''اللباب فی معرفۃ الانساب'' اور تراجم اطباء عرب نامی کتاب بھی انہوں نے ہی علی الترتیب 1835 اور 1840ء میں گوٹنگن (جرمنی) سے شائع کیا۔

4. سخاؤ (Sachau E.) متوفی 1930 کا شمار بھی جرمنی کے بڑے مستشرقین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سوانح حیات پر دو بڑی کتابیں تصنیف کی ہیں جنہیں برلن اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ سخاؤ نے ابوریحان بیرونی کی حیات اور ان کی خدمات پر سب سے نمایاں کام انجام دیا ہے۔

5. کارل بیکر (Becker C.H.) متوفی 1933ء نے ابن جوزی کی کتاب ''مناقب عمر عبدالعزیز'' کی تحقیق وتدوین کی ہے اور اس پر ایک طویل مقدمہ جرمن زبان میں تحریر کیا ہے۔ لیپزگ جرمنی سے یہ کتاب 1899ء میں شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں انہوں نے عمر دوم کے نام سے عمر ابن عبدالعزیزؒ کی سوانح حیات پر اپنی طویل ریسرچ کو برلن سے 1900ء میں شائع کیا ہے۔

سیرت وسوانح کے باب میں مستشرقین کی خدمات کا یہ ایک سرسری جائزہ ہے نہ اس میں تمام مدارس استشراق کو شامل کیا گیا ہے اور نہ ہی مذکورہ مدارس کے تمام افراد اور ان کے سارے اعمال کا ہی احاطہ کیا گیا ہے۔ لیکن جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ سیرت وسوانح کے سلسلے میں مستشرقین کی خدمات بالخصوص طبقات وتراجم کی کتابوں کی تحقیق وتدوین اور نشر واشاعت کے حوالے سے بے حد وقیع اور اہمیت کی حامل ہیں۔

معلومات کی جانچ

۱۔ الدرر الکامنہ کس صدی کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ دائرۂ معارف عثمانیہ کس شہر میں ہے۔

۳۔ فقہائے احناف کے احوال پر مشتمل ایک کتاب کا نام لکھیے۔

11.5 تصوف

علم تصوف اسلامی علوم کا ایک اہم حصہ ہے۔اس علم کی تعریف بیان کرتے ہوئے زکریا انصاری متوفی 929ھ رسالہ قشیریہ کے اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:

''تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیہ نفس، صفائی اخلاق اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال کو جانا جاتا ہے تاکہ ابدی سعادت کا حصول ہو سکے۔''

صوفیہ کے نزدیک تصوف وہی ہے جسے کتاب وسنت میں تزکیہ اور احسان کہا گیا ہے۔تصوف ہمیشہ دوسروں کے لیے بے حد پرکشش رہا ہے اس کشش و جاذبیت میں صوفیہ، طرق تصوف، کتب تصوف اور صوفیہ کے اعمال و اشغال سبھی شامل ہیں۔تصوف کے حوالے سے استشراق کے قدیم ترین عمل کا تعلق حضرت رابعہ بصری کے قصوں سے ہے۔جو تیرہویں صدی کے آخر میں فرانس میں مشہور ہوگئے تھے۔ فرانسیسی زبان میں یہ قصے شہنشاہ فرانس لوئیس نہم کی مشیر گوینول (Goneveil) کے ذریعہ پہنچے۔فرانس میں 1640ء میں ہونے والے ایک مطالعہ میں بھی رابعہ بصری اور ان کے افکار کا چرچہ ہوا۔یہ مطالعہ ''سچی محبت'' کے عنوان سے تھا۔سولہویں اور سترہویں صدی میں درویشوں کے رقص اور سلسلہ رفاعیہ کے معمولات کا ذکر یورپ میں عام طور پر ملتا ہے۔اور 1638ء میں مستشرقین کے ذریعہ پہلا باضابطہ کام منظر عام پر آیا اور یہ کام ابن فارض مصری کی صوفیانہ شاعری کے تعلق سے تھا۔ان کے قصائد کو فبیر یسیوس (Fabriciuce) نے روسٹاک شہر سے شائع کیا۔اور بعد میں اس کا ترجمہ بھی کیا۔مشہور جرمن مستشرقہ انامیری شمل (Annemarrie S.) کے مطابق یورپ میں تصوف پر دوسرا قابل ذکر کام گلستان سعدی کا ترجمہ ہے جسے آدم اولیاریوس (Adam Olearius) متوفی 1641ء نے 1651ء میں کیا۔پھر تقریباً ایک صدی کا عرصہ گزرنے کے بعد ولیم جونس (Jones W.) نے کولکاتا میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جہاں سے بڑے پیمانے پر فارسی صوفی شاعری کا ترجمہ ہوا۔1784ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کے بعد استشراقی حرکت ونشاط میں کافی تیزی آئی۔یہ فورٹ ولیم کالج اور ایشیاٹک سوسائٹی کا ہی اثر تھا کہ یورپ میں ابتدا میں فارسی تصوف پر زیادہ بڑے پیمانے پر کام ہوا اور یوروپ نے تصوف کو حافظ، سعدی، فریدالدین عطار، اور رومی کی شاعری کے ذریعہ جانا۔انیسویں صدی میں استشراق اپنے اوج کمال پر پہنچا اسی صدی میں مستشرقین کی توجہ بھی بڑے پیمانے پر تصوف کی جانب مبذول ہوئی۔ شمالی افریقہ تصوف کا مرکز تھا صحرائے سیناء سے مراکش کے مغربی ساحلوں تک صوفیہ کی خانقاہیں پھیلی ہوئی تھیں۔بہت سارے فرانسیسی اور انگریزی مستشرقین فوجی اور غیر فوجی عہدے داروں کی حیثیت سے ان علاقوں میں طویلہ عرصے تک مقیم رہے۔شمالی افریقہ کے مسلم معاشرے پر تصوف کے غیر معمولی اثرات کے سبب بھی تصوف سے واقفیت استعماری نظام کے لیے بے حد ضروری تھی انہیں سلاسل تصوف اور ان کے مشائخ سے استعماری نظام کا ایک عرصہ تک ٹکراؤ چلتا رہا۔جن میں امیر عبدالقادر جزائری اور لیبیا کے عمر مختار وغیرہ مشہور و معروف ہیں۔انیسویں صدی

سے پہلے تک علم تصوف اور تاریخ تصوف کے بارے میں مستشرقین کی معلومات معمولی قسم کی تھیں۔ یورپ میں تصوف کو متعارف کرانے میں جرمن مستشرق تھولوک(F.A.P. Tholuk) کا نمایاں ہاتھ رہا ہے انہوں نے تصوف پر کئی کتابیں لکھیں۔

فرانسیسی مستشرقین میں ڈرنگھم، سیرویا (Serouya H.) آرنوڈ (Arnaud) لیوں گوتھیر (Gauthier L.) بلوشیٹ(Blochet)، پول مارٹی (Marty P.)، گیفون (Guenon Rene) اور ماسینیون وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے تصوف کی تاریخ اس کے ماخذ و مسائل اور تصوف کی شخصیات پر کام کیا ہے۔ مغرب عربی کے تصوف اور وہاں کے سلاسل پر فرانسیسی مستشرقین نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔

استشراق کے برطانوی اسکول کیخاص توجہ کا مرکز فارسی تصوف رہا ہے یعنی تصوف کے وہ اعمال اور شخصیات جن کا تعلق فارسی زبان بولنے والوں سے تھا یا جو فارسی زبان میں لکھے گئے۔ ہندوستان بھی اس میں شامل ہے کیونکہ یہاں مغلیہ حکومت کے خاتمے بلکہ اس کے بعد تک بھی فارسی زبان رائج تھی۔ ایڈورڈ پوکوک(Pocok) متوفی 1727ء، ایڈورڈ پالمر اور براؤن وغیرہ برطانوی مستشرقین نے تصوف پر کام کیا ہے۔ لیکن پروفیسر نکلسن کو برطانوی مدرسہ استشراق میں سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ نہ صرف انہوں نے تصوف کی بے شمار کتابوں کی نشر و اشاعت کی بلکہ تاریخ مسائل تصوف پر اپنی تحقیقی کتابوں اور علمی مقالات کے ذریعہ مغرب کو اس مشرقی علم سے واقف کرایا۔ اس فہرست میں ایک اہم نام مارگریٹ اسمتھ کا بھی ہے جنہوں نے امام محاسبی، رابعہ بصری، غزالی اور شعرانی وغیرہ کی شخصیت اور افکار پر اہم کام کیا ہے۔

استشراق کے اطالوی مدرسے میں تصوف پر کام کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام کارلو نللینو (Carlo Nallino) کا ہے۔ جنہوں نے ابن فارض سمیت بہت سے عربی صوفی شعراء کے کلام کی تحقیق و تدوین کی اور انہیں شائع کیا۔ نللینو کی وفات 1938ء میں ہوئی۔ مورینو (Moreno) میں اس مدرسے کا ایک ممتاز نام ہے جس نے تصوف پر بہت کام کیا۔

روسی مستشرقین میں ایوانوو(Ivanow)، گورڈلیوسکی وغیرہ نے تصوف پر اپنے بیش قیمت کاموں کے ذریعہ شہرت پائی۔ مؤخر الذکر نے سلسلہ نقشبندیہ پر بہت سارا کام کیا۔ گولڈزیہر ہنگرین مستشرقین میں تصوف پر کام کرنے والوں میں سب سے ممتاز نام ہے انہوں نے اپنی کتاب ''اسلام میں عقیدہ اور شریعت'' میں تصوف سے بھی گفتگو کی ہے۔

جرمن مدرسہ استشراق نے بھی تصوف کو بے حد اہمیت دی ہے۔ تصوف پر سب سے زیادہ کام کرنے والے جرمن مستشرقین میں میکس ہارٹن Max Horten اور ہلمٹ وغیرہ شامل ہیں۔

تصوف کے آغاز اور تسمیہ کو لے کر مستشرقین میں الگ الگ نظریات ہیں۔ مسیحی افکار اور مادی نظریات کے زیر اثر اکثر مستشرقین نے تصوف کو غیر اسلامی اصول سے ماخوذ مانا ہے۔ مگر وہ غیر اسلامی اصل کیا ہے، اس پر خود مستشرقین میں اختلاف ہے جو ان کے نظریہ کو کمزور کرنے والی بات ہے۔ تصوف کی اس فرضی غیر اسلامی اصل کو لے کر مستشرقین تین خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

1. بعض کی رائے میں تصوف ہندو ویدانتا سے ماخوذ ہے اس رائے کو پیش کرنے اور اسے قبول کرنے والے مستشرقین میں ہورٹن (Horten)، بلاشیٹ (Blochet) اور ماسینیون (Massignon) سرفہرست ہیں۔ دراصل ان حضرات نے وحدۃ الوجود کو ہی تصوف سمجھ لیا اور اس کے اور ویدانتا کے نظریہ اَدْوَیت واد میں بظاہر مشابہت نظر آئی اسی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرلیا گیا جب کہ نہ تو وحدۃ الوجود تصوف کا مترادف

ہے اور نہ ہی اس میں اور ویدانتا کے حلول واتحاد میں کوئی حقیقی تعلق ہے۔خود وحدۃ الوجود کے سب سے بڑے شارح اور ناشر ابن عربی نے اتحاد و حلول سے کھل کر برأت کا اعلان کیا ہے۔

2. مستشرق گولڈزیہر (Goldziher) اور اولیری (O'Leary) وغیرہ کی رائے ہے کہ تصوف بدھ ازم کے اثرات سے پیدا ہوا ہے۔ بعض ظاہری مناسبت کی بنیاد پر یہ بات کہنے والوں نے اس بڑی حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ تصوف خدا کے عشق اور اس تک پہنچنے کی کوشش کا نام ہے۔اور بدھ ازم خدا کے تصور سے ہی خالی ہے۔

3. اس سلسلے میں تیسرا اہم نقطہ نظر یہ ہے کہ تصوف عیسائی رہبانیت سے نکلا ہے۔پروفیسر نکلسن اس نظریے کے بانی تھے۔اور تصوف کی اصل کو غیر اسلامی ماننے والوں کی بھاری اکثریت اس رائے کی قائل ہے۔یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ خود اس نظریہ کے مؤسس نکلسن نے اپنی اس رائے سے آخری وقت میں رجوع کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے "دائرہ معارف مذاہب و اخلاق" (Encyclopedia of Religions and Ethics) میں اپنے مضمون میں واضح طور پر لکھا ہے کہ تصوف کی اصل اور اس کے مصدر و ماخذ کے بارے میں وہ اپنی سابقہ آراء سے رجوع کرتے ہیں۔انہوں نے مزید لکھا ہے کہ اب ان کی رائےہے کہ صوفیہ کے تمام افکار و اصول بنیادی طور پر کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں۔

تصوف کے تسمیہ کو لے کر بھی مستشرقین میں کئی آراء ہیں۔اکثریتی رائے کے مطابق صوف (اون) سے بنے ہوئے لباس پہننے کے سبب میں یہ لوگ صوفی کہلائے۔تھیوڈر نولڈکے (Noldek. Th.) نے لکھا ہے کہ تصوف صوف سے مشتق ہے اور یہ لباس شروع میں مسلمان زاہد استعمال کرتے تھے اور ان کا یہ استعمال عیسائی راہبوں کی نقل کے طور پر تھا۔تھیوڈر نولڈکے نے یونانی لفظ (تھیوسوفیا) سے تصوف کے اشتقاق کی تردید کی ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ عربی زبان میں سین کا حرف کبھی بھی صاد سے نہیں بدلا جاتا۔ ماسینیوں نے نولڈکے کا رد کیا ہے۔وان کرومر کی رائے میں تصوف کی نشوونما میں بدھ افکار کا کافی دخل ہے۔کیونکہ بلخ بدھ ازم کا مرکز تھا،اور بہت سے صوفیہ بھی بلخ کی طرف منسوب ہیں۔بعض مستشرقین کے خیال میں تصوف کا زہد وخلوت اسلام سے ماخوذ ہے۔لیکن خود اسلام میں یہ چیزیں عیسائیت سے داخل ہوئیں۔تصوف کے سلسلے میں بیسویں صدی بالخصوص اس کے نصف آخر میں ہونے والے استشراقی مطالعات میں اس بات کی کم گنجائش رہ گئی ہے کہ تصوف کو اسلام کے علاوہ کسی اور اصل سے جوڑا جائے تو اب تصوف کو اسلام پر عیسائی اثرات کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے۔اور یہ مستشرقین کا عام طریقہ ہے کہ اگر اسلام اور عیسائیت و یہودیت میں کوئی بھی چیز مشترک پاتے ہیں تو اسے ان دونوں سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔

تصوف میں مستشرقین کی خدمات

تصوف استشراقی مطالعے کا ایک مرکزی موضوع ہے۔تقریباً تمام مستشرقین یا اکثر نے تصوف پر کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا ہے۔علوم تصوف کی نام نہاد پر اسراریت اور اس کی روحانیت جو انسانیت کی ایک مشترک قدر ہے۔عوام وخواص سبھی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ذیل میں بعض مدارس کے چند مستشرقین اور ان کی خدمات کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے۔

1. برطانیہ

اس مدرسے کے مستشرقین نے تصوف کے مطالعہ میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور براؤن نکلسن اور آربری جیسے ماہرین تصوف دیے

1. گارڈنر (Gardner W.R.W) نے امام غزالی اور ان کے تصوف پر صوفی غزالی کے نام سے ایک مفصل کتاب تحریر کی جسے 1917ء میں شائع کیا۔

2. براؤن (Brown E.G) متوفی 1929ء کو تصوف کے حوالے سے غیر معمولی شہرت ہے۔ انہوں نے جلال الدین رومی اور ان کے نظریات وافکار پر ایک اہم مقالہ قلم بند کیا ہے جو اسلامیکا نامی جرنل میں 1926ء میں شائع ہوا۔

3. نکلسن (Nicholson R.A) متوفی 1945ء مستشرقین میں پروفیسر نکلسن سب سے بڑے ماہر تصوف تسلیم کیے جاتے ہیں اور ان کے کام کے تنوع اور حجم کو دیکھا جائے تو یہ بات غلط بھی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ انہوں نے کئی جلدوں میں تصوف کی تاریخ اور اس کے مسائل و نظریات کو تحریر کیا ہے۔ بہت ساری تصوف کی قدیم کتابوں کی تحقیق وتدوین کا کام کیا ہے، کئی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ دیوان شمس تبریز کو انگریزی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ فریدالدین عطار کی تذکرہ اولیاء اور مثنوی مولانا روم کی تحقیق وتدوین اور نشرواشاعت کا کام کیا ہے۔ تصوف کی بعض امہات کتب کو اپنی تحقیق اور مقدمات کے ساتھ شائع کیا ہے جیسے طوسی کی کتاب اللمع اور ہجویری کی کشف المحجوب وغیرہ۔

4. مارگریٹ اسمتھ (Margaret Smith) نے غزالی کے رسالہ لونیہ کو شائع کیا ہے اور ''محاسبی غزالی کے پیش رو'' کے عنوان سے ایک طویل تحقیقی مقالہ قلمبند کیا ہے جس میں امام غزالی کی فکر پر حارث محاسبی کے اثرات کا جائزہ لیا ہے یہ علمی مقالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں 1936ء میں شائع ہوا۔

5. آربری (Arberry A.J.) متوفی 1969ء: برطانوی مدرسہ استشراق میں تصوف پر کام کرنے والا ایک بڑا نام آربری کا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ کلاباذی کی کتاب ''التعرف'' کی نشرواشاعت ہے۔ یہ کتاب قاہرہ سے 1934ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی آربری نے تصوف پر کئی کتابیں لکھیں جیسے: فارسی صوفیہ کی شاعری (1937) محاسبی کی کتاب التوھم کی تحقیق وتدوین اور اشاعت (قاہرہ 1937)، تاریخ تصوف کا انٹروڈکشن، اسلام میں تصوف، تصوف اور اخلاق اور تصوف کی ابجد وغیرہ۔

ب۔ فرانس

1. لوئس ماسینون (Massignon L.) متوفی 1962 اس فرانسیسی مستشرق نے اپنے مطالعات کو منصور حلاج پر مرتکز رکھا اور ان کے فکروفلسفے پر کئی کتابیں لکھیں۔ ماسینون فرانسیسی استشراق کا ایک بڑا نام ہے، نجیب عقیقی کے مطابق ماسینون نے تقریباً 650 کتابیں تحریر کیں۔ تصوف اور اس کی تاریخ سے متعلق کئی مخطوطات شائع کیے جن میں دیوان حلاج اور حلاج کی طرف منسوب ''کتاب الطواسین'' بھی ہے جسے پیرس سے 1913ء میں شائع کیا۔ اور دائرہ معارف اسلامیہ میں محاسبی اور ترمذی وغیرہ پر مقالات لکھے۔

2. ڈرمنگھم (Dermengham E.) نے شیخ حرالی اور مشہور صوفی بزرگ ابوبکر شبلی پر تفصیلی مقالے تحریر کیے۔ جو ادارۂ مطالعات شرقیہ میں ترتیب وار 1948 اور 1949ء میں شائع ہوئے۔

3. پرووَنسال (Provencal L.) نے مراکش کے صوفیائے پر ایک کتاب تصنیف کی جس میں ان کے افکار واحوال کا تذکرہ کیا ہے۔

ج۔ جرمنی

1. فلوگل (Flugel G.) متوفی 1870ء نے مصطلاحات صوفیہ میں ابن عربی کے ایک نادر رسالہ کو اپنی تحقیق و تدوین کے ساتھ شائع کیا۔

2. فرڈرنچ ڈیٹریشی (Dietrice Fr.) متوفی 1903ء نے ابن عربی کی مشہور زمانہ کتاب فصوص الحکم کی تحقیق و تدوین کا کام کیا۔ اور اسے لیڈن سے 1890ء میں شائع کیا۔

3. انامیری شیمل (Annemarie Schemmel) متوفی 2003ء اس مستشرقہ کے ذکر کے بغیر استشراق اور تصوف کا ذکر مکمل نہیں ہوسکتا ہے۔ اسلام اور تصوف کے بارے میں اپنی مثبت رائے کے حوالے سے مشرق و مغرب میں معروف ہیں۔ ان کی کتاب ''اسلام میں صوفی ابعاد'' غیر معمولی شہرت کی حامل ہے اس کا انگریزی نام Mystical Dimensions of Islam ہے۔ یہ کتاب دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ ان کی ایک کتاب ''اسلام میں صوفی شاعری'' بھی شہرت کی حامل ہے۔ اقبال بالخصوص ان کے صوفیانہ رخ پر شیمل نے کئی مقالے لکھے جن کی بڑی پذیرائی ہوئی اور انہیں ہلال امتیاز اور نشان پاکستان جیسے ایوارڈ بھی دیے گئے۔

د۔ دوسرے مدارس

استشراق کے دوسرے مدارس کی بھی کئی شخصیات نے تصوف کو اپنا موضوع بنایا۔ سویڈن سے تعلق رکھنے والے مستشرق ٹور آنڈرے (Tor Androc) متوفی 1947ء کی کتاب ''اسلامی تصوف'' کا شمار مغرب میں تصوف کے اہم مصادر میں ہوتا ہے۔ جس میں تصوف کی باطنی زندگی کے اسرار پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اطالوی مدرسہ استشراق کے کارلونلینو (Carlo Nallino)، روسی مدرسہ استشراق کے گورڈ لیوسکی (Gord Levski)، اور آسٹریا کے مستشرق جوزف وان ہامر (Josepvon Hammer) بھی قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر نے دیوان حافظ کی اشاعت اور اس کے ترجمے کے ذریعہ شہرت پائی۔

معلومات کی جانچ

۱۔ مستشرقہ انامیری شیمل کا تعلق کس ملک سے تھا۔

۲۔ استشراق کے کس مدرسے نے فارسی تصوف پر زیادہ زور دیا۔

۳۔ کشف المحجوب کا مصنف کون ہے۔

11.6 خلاصہ

مستشرقین نے قرآن کریم کے بعد جس موضوع پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کی ہے وہ ہے سیرت نبوی۔ استشراق نے اپنے ابتدائی عہد سے ہی اس موضوع کو اپنایا۔ سیرت پر ہونے والے مستشرقین کے ابتدائی عہد کے کاموں میں علمیت اور موضوعیت دونوں کا فقدان تھا۔ اس

وقت یوروپ میں سیرت کے نام پر کذب وافتراء کا ایک بازار گرم تھا جو انیسویں صدی کے آتے آتے بڑی حد تک علمی رنگ میں رنگ گیا لیکن پوری طرح سے موضوعیت اختیار نہیں کر سکا۔ جدید عہد میں سب وشتم کا سلسلہ تو موقوف ہو گیا لیکن جانبدارانہ نقطہ نظر برقرار رہا۔ اور جن لوگوں نے نبی اسلام ﷺ کی تعریف وتوصیف بھی کی تو ایک عظیم انسان اور عبقری کی حیثیت سے۔ مستشرقین نے سیرت وسوانح کی کتابوں کی نشر واشاعت میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیا۔ تصوف پر بھی مستشرقین نے بہت کام کیا اور اپنے کاموں میں تصوف کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ لیکن عملی تصوف کے بجائے فلسفی تصوف پر ان حضرات کی زیادہ تر کیز رہی۔ کئی ایک نے تصوف کے اسلامی اصل کا انکار کیا اور اسے غیر اسلامی مصادر سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ سیرت وتصوف کے ثابت شدہ امور میں شک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی ضعیف روایات کو اجاگر کیا۔

11.7 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1. سیرت وسوانح کے موضوع پر استشراقی اعمال وخدمات کا جائزہ لیجئے۔
2. سیرت نبوی کے تعلق سے مستشرقین کی تحریف اور اغلاط پر ایک مفصل نوٹ لکھیے۔
3. مغرب میں مطالعہ تصوف کے آغاز وارتقاء کو بیان کیجئے ،تصوف کی اصل کے حوالے سے مستشرقین کی آراء کا ذکر بھی کیجئے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں تحریر کیجئے۔

1. سیرت نبوی کے موضوع پر مستشرقین کی اغلاط کے اسباب پر روشنی ڈالئے۔
2. سوانح نگاری میں استشراقی خدمات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
3. تصوف کے سلسلے میں برطانوی مدرسہ استشراق کے کاموں کا جائزہ لیجئے۔

11.8 سفارش کردہ کتابیں

۱۔ المستشرقون والسیرۃ النبویۃ عمادالدین خلیل دارابن کثیر، باراول؛ دمشق: ۱۴۲۶ھ

۲۔ اسلام اور مستشرقین دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۳۔ السیرہ النبویۃ واوہام المستشرقین عبدالمتعال محمد الجبری قاہرہ، غیر مورخ۔

۴۔ جہود المستشرقین فی دراسۃ تاریخ التصوف الاسلامی زہیر یوسف علیوی فیکلٹی آف ایجوکیشن، قادسیہ یونیورسٹی

۵۔ Annemarrie Schemmel, Mystical Dimensions of Islam, University of North

Carolina Press, 1975

اکائی:12 تاریخ، ادب اور لغت میں مستشرقین کی خدمات اور ان کا جائزہ

اکائی کے اجزاء

12.1 مقصد

12.2 تمہید

12.3 تاریخ

12.4 ادب

12.5 لغت

12.66 خلاصہ

12.7 نمونے کے امتحانی سوالات

12.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

12.1 مقصد

• اس اکائی کا مقصد تاریخ، ادب اور لغت میں مستشرقین کی خدمات کا جائزہ لینا ہے۔ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ علم کے ان ابواب میں مستشرقین نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں اور ان خدمات کی اہمیت اور علمی قدر و قیمت کیا ہے۔

12.2 تمہید:

استشراق کی تاریخ اور اس کے اعمال کا جائزہ لینے سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ مشرقی اقوام کی زبانیں اور ان کی تاریخ استشراق کا بنیادی ہدف اور مقصد رہے ہیں چونکہ کسی قوم کو جاننے کے لئے اس کی زبان اور تاریخ کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ اور ان کو جانے بغیر کسی قوم کی ہمہ جہت معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ یوں تو استشراق نے تمام مشرقی زبانوں اور تمام مشرقی اقوام کی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا۔ لیکن اس کی توجہ اور اہتمام کی فہرست میں عربی زبان اور اسلامی تاریخ سب سے اوپر ہے۔ اسلامی تاریخ اور عربی زبان کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس پر مستشرقین نے کام نہ کیا ہو۔ اسلامی تاریخ اور عربی زبان وادب کے حوالے سے مستشرقین کی خدمات اپنے تنوع اور مقدار دونوں لحاظ سے غیر معمولی ہیں۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب استشراق میں لکھا ہے کہ مستشرقین نے 1800ء سے لے کر 1950ء تک کے عرصے میں تقریباً ساٹھ ہزار کتابیں لکھی ہیں۔ مضامین و مقالات اور لکچرز وغیرہ ان کے علاوہ ہیں پھر گزشتہ پینسٹھ سالوں میں اندازہ ہے کہ یہ تعداد تقریباً دوگنی ہو گئی ہوگی۔ اور اس عظیم الشان علمی کارنامے میں زبان و تاریخ کا حصہ بہت بڑا ہے، جس کا احاطہ کرنا دشوار کام ہے۔ آئندہ صفحات میں تاریخ اور عربی زبان وادب سے متعلق مستشرقین کے اہم کاموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

12.3 تاریخ

دوسرے تمام موضوعات کی طرح اسلامی تاریخ پر لکھنے والے مستشرقین کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور ان کے الگ الگ مقاصد ہیں کچھ مصنفین ہیں تو کچھ غیر مصنفین ۔ کچھ کے مقاصد علمی ہیں تو کچھ کے مقاصد غیر علمی ۔ جیسے تبشیری ' استعماری اور سیاسی وغیرہ ۔ ان صفحات میں جو بات کہی جائے گی اس کا تعلق مجموعی یا اکثریتی نقطۂ نظر کے اعتبار اور مستشرقین کی اکثریت کے لحاظ سے ہوگا۔

مستشرقین نے مسلمانوں کی تاریخ کے تمام گوشوں پر کام کیا ہے ۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کو اپنے مطالعے، بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا موضوع بنایا بلکہ ان کی تمدنی اور اجتماعی تاریخ ، ان کے فرقوں اور مذہبی جماعتوں کی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون کی تاریخ ، سبھی کو اپنا موضوع بنایا اور سب پر خامہ فرسائی کی ۔

مسلمانوں کی تاریخ پر مستشرقین کا سب سے اہم اور قابل تعریف کام مسلمانوں کے علمی سرمایے کی حفاظت اور اس کی تحقیق و تدوین اور نشر و اشاعت ہے ، جس میں تاریخ کی کتابوں کا بھی ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے ۔

لیکن اسلامی تاریخ پر مستشرقین کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد علمی کم اور سیاسی زیادہ ہے ۔ اور اپنے غیر علمی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے مختلف طریقۂ کار کو اختیار کیا ہے ۔ جنہیں ہم مندرجہ ذیل نقاط میں بیان کر سکتے ہیں ۔

1- مستشرقین نے مسلمانوں کے مذہبی فرقوں اور ان کے تنازعات کو خصوصی اہمیت دی ہے ۔ ان کے یہاں ان فرقوں کی نشو نما اور ان کے ارتقاء پر خصوصیت سے کام ملتا ہے ۔ زیدی ، اباضی ، نصیری اور دروز جیسے فرقوں پر مستشرقین نے بہت کام کیا ہے ۔ باطنی تحریکات اور قرامطہ وغیرہ کو بھی ان کی تحریروں میں نمایاں مقام حاصل ہے ۔

2- الحاد اور ملحدین کی تاریخ پر مستشرقین نے کافی توجہ مرکوز کی ہے ۔ مثلاً م فرانسیسی مستشرق ہنری کاربن (Henry Corbin) متوفی 1978ء نے شہاب الدین یحیٰی سہروردی مقتول متوفی 586ھ/ 1190ء پر تصنیف و تالیف میں اپنی پوری عمر فنا کردی ۔ شہاب الدین مقتول کی شخصیت اور ان کے فلسفہ اشراق کے شرح و بیان میں کئی کتابیں اور مضامین تحریر کیے ۔ اس کا مقصد ایک طرف تو غیر اسلامی فکر و فلسفے کو نمایاں کرنا ہے اور دوسری طرف صلاح الدین ایوبی پر یہ الزام لگانا کہ وہ حریت رائے اور فکر کی آزادی کے خلاف تھا ۔ خواہ صاحب رائے کو قتل کرنا پڑے ۔ اور اس حوالے سے اسلام کو مورد الزام ٹھہرانا کہ وہ آزادی فکر اور اظہار رائے کی اجازت نہیں دیتا ہے ۔

اسی طرح لویس ماسینیوں نے اپنی پوری زندگی منصور حلاج کی شخصیت اور افکار پر تصنیف و تالیف میں گزار دی ۔ حلاج کے فکر و فلسفے پر موجود اختلاف سے قطع نظر ان مطالعات سے ماسینیوں کا وہی مقصد تھا جو ہنری کاربن کا شہاب الدین مقتول پر کیے جانے والے اپنے کاموں سے تھا ۔

ج ۔ اسلامی تاریخ کے مطالعے کے نام پر اسلامی مراکز کے ماقبل اسلام کی تاریخ پر توجہ مرکوز کرنا بھی مستشرقین کا ایک خاص طریقہ کار ہے ۔ مثلاً مصر کی اسلامی تاریخ کے ساتھ فرعونیت کی تاریخ ، عراق کی تاریخ کے نام پر بابلی اور اشوری تاریخ اور شام کی تاریخ میں فینقی تاریخ کو شامل کرنا اور اسے غیر معمولی اہمیت دینا استشراقی تاریخ نویسی کا ایک خاص منہج ہے ۔ اس طریقہ کار کے ذریعہ علاقائیت کو ہوا دے کر امت مسلمہ کو بانٹنا ان کا بنیادی مقصد ہے ۔

د: اسلامی تاریخ کا مطالعہ ایک امت کی تاریخ کی حیثیت سے نہیں بلکہ گروہوں، جماعتوں، نسلوں اور خاندانوں کی تاریخ کی حیثیت سے کرنا مثلاً اموی، عباسی، فاطمی، عثمانی اور ممالیک وغیرہ۔ تاریخ نویسی کا یہ موجودہ طریقہ کار درحقیقت استشراقی تاریخ نویسی کا اثر ہے۔

ھ: مستشرقین کی تاریخ نویسی کا ایک منہج یہ بھی رہا ہے کہ اسلامی تاریخ کے روشن اور تابناک پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہیں اور تاریک پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم کی طرح مسلمانوں کی تاریخ کے بھی روشن اور تاریک دونوں پہلو ہیں۔ اسلامی تاریخ بھی انسانوں کی تاریخ ہے فرشتوں کی نہیں لیکن کسی قوم کی تاریخ کے صرف مخصوص جوانب کا ذکر و بیان انصاف اور معروضیت کے مطابق نہیں ہے۔

اگر مستشرقین کے ذریعے لکھی ہوئی ہندوستان کی تاریخ دیکھیے تو یہ سکندر مقدونی کے ہندوستان پر حملے سے شروع ہوتی ہے اور یہ مورخین اس حملے کو پوری تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد محمد بن قاسم اور اس کی فتوحات کا بے حد اجمالی تذکرہ اور وہ بھی بے حد مبہم انداز میں ہوتا ہے اور فوراً بعد محمود غزنوی اور اس کی مبینہ لوٹ مار کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ جبکہ محمد بن قاسم کی آمد اور فتوحات' سکندر کی آمد اور فتوحات سے زیادہ اہم تاریخی اور سماجی اثرات کی حامل ہیں۔ محمد بن قاسم کی فتوحات زیادہ فیصلہ کن، سکندر کی فتوحات سے زیادہ وسیع و عریض اور اس سے کہیں زیادہ دیرپا تھیں لیکن بایں ہمہ عربی فتوحات اور عصر عربی کا ذکر مستشرقین کی تحریروں میں بہت کم ملتا ہے۔

و: مستشرقین کی تاریخ نویسی کا ایک قابل ذکر گوشہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نظریات اور آراء کو ثابت کرنے کے لئے غیر تاریخی مصادر پر اعتماد کرتے ہیں جیسے اغانی وغیرہ ادبی کتابیں۔ ظاہر ہے کہ ادبی کتابیں تاریخی نقطہ نظر سے نہیں لکھی جاتی ہیں۔ لہذا ان پر غیر مشروط اعتماد تاریخ نویسی کے اصول اور قاعدوں کے خلاف ہے۔

ز: مستشرقین کی تاریخ نویسی میں ایک اہم بات یہ ملتی ہے کہ ان میں مسلم قائدین کی صورت مسخ کرنے کی ہر امکانی کوشش ملتی ہے۔ مستشرقین نے ہارون رشید' سلطان صلاح الدین ایوبی اور سلطان عبدالحمید کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے اور ان قائدین پر جیسی تہمتیں لگائی ہیں انہیں جانبدارانہ تاریخ نویسی کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں میں مقبول اور محبوب ان شخصیات کے خلاف یاوہ گوئی اور الزام تراشی ایک کھلا ہوا راز ہے۔

تاریخ کے موضوع پر استشراقی خدمات:

اسلامی تاریخ کا مطالعہ تمام استشراقی مدارس کے درمیان قدر مشترک ہے۔ اور اسلام پر کام کرنے والے تقریباً تمام مستشرقین نے کسی نہ کسی صورت میں اسلامی تاریخ پر کچھ نہ کچھ ضرور کام کیا ہے۔ ان اعمال اور کاموں کی کثرت اور تنوع کے پیش نظر ذیل میں صرف چند مدارس استشراق کے نمایاں کاموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1- برطانیہ:

برطانوی مستشرقین نے اسلامی تاریخ پر بہت زیادہ اور متنوع کام کیا ہے۔ اس مدرسے کی خصوصی توجہ کا مرکز ہندوستان اور ایران کی اسلامی تاریخ رہی ہے۔ لیکن عرب بالخصوص مصر کی تاریخ پر بھی برطانوی مستشرقین نے نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں۔ یہاں ان میں سے بعض کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

1- سیمون اوکلے (Ockley S) متوفی 1720ء نے دو جلدوں میں اسلام کی تاریخ لکھی ہے۔

2- ولیم جانسن (Jones W) متوفی 1794ء نے محمد علی خاں کی فارسی کتاب تاریخ نادری کو اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کرایا اور اسے انگریزی میں بھی منتقل کیا۔ ولیم جانسن عربی، فارسی اور اردو سمیت دنیا کی کئی زبانوں کے ماہر اور لسانیات کے بہت بڑے واقف کار تھے۔ ہندوستان کے تناظر میں اس برطانوی مستشرق کی بڑی اہمیت ہے۔ انہوں نے فورٹ ولیم میں بطور جج کے کام کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ایک عرصے تک نو آبادیاتی نظام کا سپریم کورٹ، فورٹ ولیم کولکاتا میں ہی تھا۔ انہوں نے ہی 1784ء میں

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد رکھی۔ اور وہاں سے ایشیائی تحقیقات (Asiatic Researches) نامی جرنل بھی شروع کیا۔

3- رولینڈسن (Rowlandson R) نے لیڈن سے 1832ء میں ''تحفة المجاہدین فی بعض اخبار البرتغالیین'' شائع کی۔ زین الدین معبری کی یہ کتاب ہے جس میں جنوبی ہند پر پرتگالیوں کے حملے اور ان کے مظالم کا ذکر ہے، تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

4- کیورٹین (Cureton W) متوفی 1858ء نے شہرستانی کی مشہور کتاب ''الملل والنحل'' کو اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کیا۔

5- ولیم رائٹ (William Right) متوفی 1889ء نے سفرنامہ ابن جبیر کو شائع کیا۔

6- ایڈورڈ ریہاٹسیک (Rehatseek Ed) متوفی 1891ء نے ملا عبدالقادر بدایونی کی مشہور تاریخی کتاب ''منتخب التواریخ'' کو اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کیا۔

7- جورج رالنسن (Rawlinson G) متوفی 1902ء نے تاریخ پر کئی کتابیں اور مقالے لکھے ہیں جن میں 'قدیم مصر کی تاریخ' اور 'مصر وبابل' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

8- میلکم (Sir John Malcom) نے ایران کی تاریخ پر دو جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی اور اسے 1815ء میں لندن سے شائع کیا۔

9- امیڈروز (Amedroz H.F) نے بہت سی تاریخ کتابوں کی اشاعت کی اور انہیں منظر عام پر لائے۔ امیڈروز اصلاً سوئیزرلینڈ کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں انہوں نے برطانوی شہریت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے ابن مسکویہ کی کتاب ''تجارب الامم''، ماوردی کی کتاب ''الاحکام السلطانیۃ''، ابوالحسن ہلال صابی کی کتاب ''تحفة الأمراء فی تاریخ الوزراء'' اور ابن قلانسی کی کتاب ''ذیل تاریخ دمشق'' وغیرہ جیسی اہم کتابوں کو اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کیا۔

10- لارڈ کرومر (Lard Cromer) متوفی 1917ء نے جو اسماعیل پاشا کے عہد میں مصر میں برطانوی کنٹرولر جنرل تھے۔ جدید مصر کی تاریخ لکھی ہے۔

11- میلر (Miller W) نے سلطنت عثمانیہ اور اس کے خلفاء وسلاطین کی تاریخ لکھی ہے جو 1801ء سے لے کر 1926ء تک کے عرصے کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

-12 گسٹ(Guest A.R) نے اپنے طویل مقدمے کے ساتھ کندی کی کتاب ''الولاۃ والقضاۃ'' کوتحقیق کے ساتھ شائع کیا۔

-13 گب (H. Gibb) مشہور برطانوی مستشرق ہیں اسلامی علوم وفنون کے مختلف گوشوں پر کام کیا ہے ان میں تاریخ کی بھی کئی کتابیں ہیں جن میں 'ذیل تاریخ دمشق' بھی شامل ہے۔ جسے تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ سفرنامہ ابن بطوطہ کوعربی متن اور انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

-14 لین پول (Stnley Edward Lane-Poole) متوفی 1931ء نے تاریخ پر بہت کام کیا ہے، 'عصور وسطی میں مصر کی تاریخ' (1901ء)، 'تاریخ ہند، 'مسلم فتوحات سے اکبر کے عہد تک' (1907ء) اس کے علاوہ مسلم خاندانوں، صلاح الدین ایوبی اور مسلم اسپین پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔

ب: فرانس:

تاریخ کے میدان میں کام کرنے والے چند فرانسیسی مستشرقین کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

-1 لانگلس (Langles L) متوفی 1824ء نے سلیمان تاجر کی مشہور کتاب ''سلسلۃ التواریخ'' کوشائع کیا۔

-2 ساسی ڈی (Socy de) متوفی 1838ء نے مقریزی کی ''کتاب الخطط'' کوتحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کیا۔

-3 کاترے میر (Marc Quatremere) متوفی 1852ء نے مقدمہ ابن خلدون کوتین جلدوں میں شائع کیا اور مقریزی کی کتاب ''السلوک فی معرفۃ الدول والملوک'' کومتن اورترجمے کے ساتھ شائع کیا۔

-4 مارسل (Marcel J.J) متوفی 1854ء مصر کی ایک مفصل تاریخ لکھی ہے جو اسلامی فتوحات سے شروع ہوکر نپولین بوناپارٹ کے مصر پر حملے تک پر مشتمل ہے۔

-5 جوزف ٹوسن رینو (Renaud J.T) متوفی 1867ء نے ابوالفداء کی تقویم البلدان کی تحقیق کی اور اسے فرانسیسی ترجمے کے ساتھ 1848ء میں شائع کیا۔ اور بلاذری کی مشہور کتاب فتوح البلدان کوبھی 1945ء میں فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔

-6 سالمون (Salmon G) متوفی 1907ء نے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کے مقدمے کوفرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ مراکش کے شہروں کی ایک ڈائرکٹری بھی تیار کی ہے جس میں ان شہروں کے تاریخی احوال بھی درج ہیں۔

-7 ہوداس (Houdas O) متوفی 1916ء نے جدید مراکش کی مفصل تاریخ تحریر کی ہے۔

-8 (Huart Clement) متوفی 1926ء نے تاریخ پر بہت سارے کام کئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم کام مطہر بن طاہر مقدسی متوفی 967ء کی ضخیم کتاب ''البدء والتاریخ'' کومتن اور ترجمے کے ساتھ 1899ء میں شائع کیا۔ اور دوجلدوں میں عربوں کی تاریخ بھی لکھی ہے۔

-9 میشو بللیر (Michaux Bellaire) نے مراکش کی تاریخ پر درجنوں کتابیں تصنیف کی ہیں وہاں کے شہروں، شخصیتوں اور حکمرانوں اور جماعتوں کی تاریخ مدون کی ہے۔

10- وانڈر ہیڈن (Vonder Heyden) نے ابن حماد کی لکھی ہوئی اباضی فرقے کے حکمرانوں کی تاریخ جنہوں نے لیبیا والجزائر وغیرہ پر حکومت کی ہے، کو متن اور ترجمے کے ساتھ 1927ء میں شائع کیا۔

11- لوسیان بووا (Bouvat L) متوفی 1942ء نے مسلمانوں کی تاریخ پر کئی کتابیں اور علمی مقالات لکھے ہیں جن میں کتاب 'تاریخ برامکہ' (پیرس 1912ء) اور 'مغل شہنشاہیت' یہ کتاب کئی جلدوں میں تیار کی جانے والی کتاب 'تاریخ عالم' کی آٹھویں جلد کے طور پر پیرس سے 1927ء میں شائع ہوئی۔ اس مستشرق نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بھی تاریخ لکھی ہے جو ایک مقالے کی صورت میں اسلامک ورلڈ جرنل میں شائع ہوئی ہے۔

12- بلاشیر (Blachere R.L) نے صاعد اندلسی کی کتاب طبقات الامم کا ترجمہ کیا ہے جو پیرس سے 1935ء میں کتاب کے متن کے ساتھ شائع ہوا۔

13- ڈیسو (Dussaud R) متوفی 1958ء نے نصیریوں کی تاریخ اور ان کے عقیدے پر کتاب تحریر کی ہے۔

ج: جرمن:

جرمن مستشرقین اسلام کی علمی میراث کی نشر و اشاعت میں تمام مدارس استشراق سے آگے ہیں۔ ان میں سے بعض نے ایک ایک کام کے لئے پوری زندگی فنا کردی۔ اسلامی تاریخ کی امہات کتب جرمن مستشرقین کے ذریعے ہی منظر عام پر آئیں۔ ان کی کچھ اہم شخصیات اور ان کے کارناموں کا گوشوارہ مندرجہ ذیل ہے:

1- کوزیگارٹن (Kosegarten J.G.L) متوفی 1860ء نے ابن سید الناس کی کتاب ''بشری اللبیب فی ذکر الحبیب'' کو متن اور جرمن ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ اور 1831ء سے 1853ء کے درمیانی وقفے میں تاریخ طبری کو تحقیق و تدوین کے ساتھ شائع کیا۔

2- فریتاگ (Freytag G.W) متوفی 1861ء نے یاقوت حموی کی معجم البلدان کو تفصیلی فہرستوں کے ساتھ چھ جلدوں میں لیبرگ سے 1866ء سے 1873ء کے درمیان شائع کیا۔ ادریسی کی کتاب 'فلسطین وشام کا تذکرہ' کی اشاعت کرائی۔

3- فلاشیر (Fleischer H.L) متوفی 1888ء نے اسلام سے قبل عربوں کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی جو لیپزگ سے 1831ء میں شائع ہوئی۔ قزوینی کی کتاب عجائب المخلوقات کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

4- سیمون ویل (Weil S) متوفی 1889ء نے سولہ سال کی مدت لگا کر پانچ جلدوں میں مسلمان خلفاء کی تاریخ تیار کی۔ مسلمانوں کی ایک مختصر تاریخ بھی لکھی ہے جو عہد رسول اللہ ﷺ سے لے کر سلطان سلیم اول کے عہد تک کی تاریخ ہے۔

5- وسٹنفیلڈ (Wustenfeld F) متوفی 1899ء نے مکہ مکرمہ کی تاریخ پر چار مشہور کتابوں پر مشتمل کتاب 'تواریخ مکہ' ترتیب دی اور جرمن زبان میں ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ یہ چاروں کتابیں 'المنتقی من اخبار ام القری' جو کہ فاکہی کی تاریخ مکہ کے منتخبات پر مشتمل ہے۔ فاسی کی 'شفاء الغرام'، ازرقی کی کتاب 'اخبار مکہ' کا پہلا حصہ اور ابن ظہیر کی کتاب 'الجامع اللطیف' ہیں۔

وسٹنفیلڈ کا سب سے اہم کارنامہ ابن خلکان کی کتاب وفیات الاعیان کی تیرہ جلدوں میں اشاعت ہے۔ جو گوتنگن سے 1835ء سے 1850ء کے عرصے میں شائع ہوئی۔ مکہ مکرمہ کی تاریخ اور وہاں کی شخصیات کے بیان پر مشتمل ہندوستانی عالم قطب الدین نہروالی احمد آبادی کی

کتاب ''الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام'' کو بھی جرمن زبان میں اپنے مقدمے اور کتاب کے عربی متن کے ساتھ شائع کیا۔ان کتابوں کے علاوہ بھی تاریخ پر کئی کتابیں تصنیف کیں اور کئی تاریخی کتابوں کو ایڈٹ کیا۔

6- ولہاوزن (Wellhousen J) متوفی 1918ء نے مسلمانوں اور عربوں کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں 'عرب اور روم' (گوٹنگن 1901ء) اور 'عربی حکومت اور اس کا زوال' وغیرہ ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب برلن سے 1902ء میں شائع ہوئی۔اور عبدالہادی نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

7- سیبولڈ یا سائیولڈ (Seybold) متوفی 1921ء نے سیوطی کی کتاب ''الشماریخ فی التاریخ'' کو جرمن مقدمہ کے ساتھ 1894ء میں لیڈن سے شائع کیا۔

8- ویادمان (Wiedemanne E) متوفی 1928ء نے بیہقی کی تاریخ الحکماء کو تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کیا۔عرب کے علوم اور علماء کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے جس میں ابن سینا' قطب الدین شیرازی' حافظ نوری اور کندی وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

9- نولڈکے (Noldeke) متوفی 1930ء نے ایک کتاب 'ساسانی عہد میں عرب اور ایرانی' لکھی جو لیڈن سے 1879ء میں شائع ہوئی، اور ابن قتیبہ کی کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' کو ایڈٹ کیا۔

10- سخاؤ (Sachau) متوفی 1930ء نے چھ جلدوں میں طبقات ابن سعد کو شائع کیا۔اس کتاب کی اشاعت 1920ء میں ہوئی۔

11- جوزف ہوررووچ (Horovitz J) متوفی 1931ء نے واقدی کی مغازی اور بلاذری کی کتاب انساب الاشراف کو شائع کیا۔ اور ابن قتیبہ کی کتاب عیون الاخبار کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا۔

معلومات کی جانچ:

1- مستشرقین نے کن مسلم فرقوں کی تاریخ پر زور دیا ہے۔

2- مستشرقین نے کن مسلم قائدین کی صورت بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔

3- برطانوی مستشرقین نے اسلامی تاریخ کے کس حصے پر زیادہ توجہ دی ہے۔

4- اسلام کی علمی میراث کی اشاعت میں کون سا مدرسہ استشراق سب سے آگے ہے۔

12.4 ادب

کسی بھی قوم کا ادب اس قوم کا آئینہ دار اور اس کی تہذیب وتمدن کا ترجمان ہوتا ہے۔اس کے مسائل اور غم وخوشی کا پرتو ہوتا ہے۔اور اس کے افکار ونظریات کا عکاس ہوتا ہے۔اسی لئے مستشرقین نے شروع ہی سے عربی، فارسی، اردو اور مسلمانوں کے ذریعے بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادب کی جانب خصوصی توجہ دی۔اور مشرقی زبان وادب کی معرفت کے لئے یورپ کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں مسلمانوں کی زبان سکھانے والے مراکز کھولے گئے بالخصوص عربی زبان کی تعلیم وتدریس کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ساری بڑی یونیورسٹیوں میں عربی

شعبے قائم کئے گئے اور اہم تعلیم گاہوں میں عربی اور دوسری افریقی و ایشیائی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کے لئے چیئرز قائم کی گئیں۔ مغرب اسلامی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب سے بھی متاثر ہوا۔ معاصر انگریز مورخ اور مستشرق ایڈمنڈ بوسورتھ (Edmund Bosworth) متوفی 2015ء نے انگریزی ادب پر عربی ادب کے اثرات کا

اعتراف کیا ہے۔

سلوسٹر ڈی ساسی نے پیرس میں مشرقی زبانوں کا اسکول قائم کیا تھا یہ اسکول یورپ کے تمام مستشرقین کا قبلہ تھا۔ عربی زبان و ادب کے حوالے سے استشراقی مطالعات کی چند اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

1- عربی ادب کی کتابوں کی نشر و اشاعت اور ان کا ترجمہ۔

2- قدیم عربی ادب میں انتحال (impersonation) کا قضیہ، مرگلیوتھ وغیرہ نے زور و شور سے اس موضوع کو اٹھایا۔ اور جاہلی دور کی پوری عربی شاعری کو ناقابل اعتبار قرار دیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں سب سے پہلے نولڈکے نے یہ دعویٰ کیا کہ عربی شاعری کے عہد جاہلی کی طرف منسوب قصائد اسلامی عہد میں وضع کئے گئے ہیں۔ بہت سارے عرب ادباء بھی اس نظریئے سے متاثر ہوئے جن میں سرفہرست طہ حسین ہیں جنہوں نے اپنی مشہور و متنازعہ کتاب ''فی الادب الجاہلی'' میں اس موضوع کو اٹھایا۔ اور عرب کی جاہلی شاعری کو مشکوک قرار دیا۔ انتحال کا معنی جعلسازی اور غیر واقعی ہے۔

3- مستشرقین نے اخلاقی اعتبار سے انحطاط پذیر ادب کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور اعلیٰ اخلاق کے نمائندہ ادب کو اپنے مطالعات میں وہ مقام نہیں دیا ہے۔

4- عربی ادب کے غیر اسلامی عناصر کو اہمیت دی۔ اور ادب کے مغربی رجحانات کو عام کرنے والے ادباء کو خصوصی توجہ دی۔

5- عربی زبان و ادب کے محاسن کو دوسری قوموں اور زبانوں کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی۔

ادب میں مستشرقین کی خدمات:

1- جونس ولیم (Jones W) متوفی 1794ء نے معلقات سبع کو متن اور ترجمے کے ساتھ 1780ء میں شائع کیا۔

2- ایڈورڈ لین (Lane Edward) متوفی 1876ء نے الف لیلہ و لیلہ کو انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔

3- شرلیال چارلس جیمس (Lyall C.J) متوفی 1920ء نے تبریزی کی شرح معلقات سبع کو شائع کیا۔ اور عبید اللہ ابن ابرص، اور عامر بن طفیل کے دیوان کو شائع کیا۔ شرلیال کولکاتہ میں واقع رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل کے ایڈیٹر بھی تھے۔

4- پروفیسر براؤن (Brown E.G) متوفی 1929ء نے فارسی ادب پر نمایاں کام کیا۔ چار جلدوں میں فارسی ادب کی تاریخ لکھی۔ نظامی عروضی سمرقندی کی مشہور کتاب چہار مقالہ کو پہلی بار رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں 1899ء میں شائع کیا۔

5- سر ایڈون آرنلڈ (Arnold Edwin) نے 1899ء میں شیخ سعدی کی گلستان کو شائع کیا اور انگریزی میں اس کا منظوم ترجمہ بھی

کیا۔

6- مرگلیوتھ نے ابوتمام کا دیوان شائع کیا۔

7- انتون بیون (Bevan A.A) متوفی 1933ء نے تین جلدوں میں جریر وفرزدق کے نقائض پر مبنی قصائد کو شائع کیا۔ اور اس کی بے حد عمدہ اور نفیس تحقیق وتدوین کی۔

8- ایڈورڈ روس (Edward Ross) متوفی 1940ء نے اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ کلیلہ ودمنہ کی نشر واشاعت کا کام کیا۔

9- سالم کرنکو (Krenkow) متوفی 1950ء نے مزاحم عقیلی، طرماح کے دواوین اور ابن درید کی کتاب ''الجمہرۃ'' کو تین جلدوں میں مرتب کیا۔

10- پروفیسر گب (Gibb) نے انگریزی میں عربی ادب کی ایک تاریخ لکھی۔

11- آربری (A.J.Arberry) متوفی 1969ء نے فارسی ادب پر بہت سے کام کیے۔ جن میں رباعیات عمر خیام کی تحقیق وتدوین (1950ء)، حافظ کی پچاس منتخبہ غزلوں کی کیمبرج سے اشاعت اور ابن خالویہ کی کتاب ''البدیع'' کی تدوین واشاعت شامل ہے۔

یہ سب کے سب انگریز مستشرق تھے، فرانسیسی مستشرقین اور ادب میں ان کے کچھ اہم کارنامے مندرجہ ذیل ہیں۔

12- کاسن ڈی پرسیوال (Caussin de perceval) متوفی 1835ء نے الف لیلہ ولیلہ کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ (1806ء)، اور مقامات حریری کو 1819ء میں اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کیا۔

13- ویٹ (Wiet G) یہ فرانسیسی مستشرق مصر کے ادارہ برائے مشرقی آثار میں ایک اہم منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے مقریزی کی ''المواعظ والآثار'' کو چار جلدوں میں اعلیٰ درجے کی تحقیق کے ساتھ شائع کیا۔ اور پوری کتاب کا ترجمہ بھی کیا۔

14- پیریس (Peres H) نے عربی ادب کے حوالے سے کئی کام انجام دیے۔ کثیر عزہ کے دیوان کو اپنی شرح اور تعلیق کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا، جو کام الجزائر یونیورسٹی کے آرٹس فیکلٹی کی طرف سے 1927ء سے 1930ء کے درمیان شائع ہوا۔ انہوں نے اندلس کی عربی شاعری پر ایک کتاب بھی لکھی جسے 1937ء میں پیرس سے شائع کیا گیا۔ ان کا ایک اور ادبی تحقیقی کام ابوولید اشبیلی کی کتاب ''البدیع فی وصف الربیع'' کی تحقیق واشاعت بھی ہے۔

15- بلاشیر (Blachere) اس فرانسیسی مستشرق کا زیادہ تر کام عربی شاعر متنبّی پر ہے۔ انہوں نے متنبّی پر کئی کتابیں اور کئی مقالات لکھے۔ ان کی کتاب ''چوتھی صدی ہجری اور دسویں صدی عیسوی کا ایک عربی شاعر متنبّی'' اس مشہور عربی شاعر پر لکھی جانے والی سب سے اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ اس میں نہ صرف متنبّی کی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے بلکہ متنبّی پر کی جانے والی تمام تنقیدات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور معاصر تنقید نگاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں متنبّی پر مضمون بلاشیر ہی نے لکھا ہے۔ ان کا ایک اور وقیع مقالہ 1929ء میں مجلّہ دراسات اسلامیہ میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا متنبّی ایک عربی اسلامی شاعر۔ بلاشیر نے عربی ادب کی تاریخ پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا

ترجمہ ابراہیم کیلانی نے عربی میں کیا ہے۔

جرمن مستشرقین نے ادب میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔اور عربوں کے ادبی ذخیرے کے احیاء واشاعت کا کام بہت بڑے پیمانے پر کیا ہے۔ان میں سے کچھ بڑے مستشرقین اوران کے کارناموں کا اجمالاً ذکر کیا جارہا ہے۔

16- فریتاگ (Freytag G) متوفی 1861ء کا شمار بڑے محققین میں ہوتا ہے۔عربی ادب کی بہت سی نادرونایاب کتابوں کی تحقیق وتدوین کا کام کیا۔تبریزی کی شرح کے ساتھ دیوان حماسہ کو دوحصوں میں علی الترتیب 1828ء اور 1847ء میں شائع کیا۔کعب ابن زہیر کے قصیدہ بردہ کو پہلے بون سے 1822ء میں پھر اسی قصیدہ کو لاطینی ترجمے کے ساتھ 1833ء میں شائع کیا۔اس کے علاوہ حارث بن حلزہ اور طرفہ ابن العبد کے معلقہ قصیدوں کی تحقیق وتدوین کی ہے۔میدانی کی مجمع الامثال کو لاطینی ترجمہ کے ساتھ 1838ء میں اور ابن عرب شاہ کی کتاب ''فاکہۃ الخلفاء ومفاکہۃ الظرفاء'' کو بون سے 1838ء میں شائع کیا۔

17- فلوگل (Flugel G) متوفی 1870ء نے جرجانی کی کتاب التعریفات آستانہ سے 1837ء میں اور ثعالبی کی کتاب مونس الوحید کو ترجمہ اور متن کے ساتھ 1829ء میں ویانا سے شائع کیا۔فلوگل کا سب سے بڑا کارنامہ حاجی خلیفہ کی کتاب ''کشف الظنون'' کی تحقیق واشاعت ہے۔آٹھ جلدوں کی اس کتاب کو فلوگل نے تیرہ سالوں میں لاطینی ترجمے کے ساتھ مرتب اور مکمل کیا۔

18- وسٹنفیلڈ (Wuslenfeild) متوفی 1899ء نے ابن قتیبہ کی کتاب المعارف کی تحقیق وتدوین کی اور 1850ء میں اسے شائع کیا۔

19- سخاؤ (Sachau) نے 1867ء میں جوالیقی کی کتاب المعرب کو شائع کیا اور وسٹنفیلڈ کے ساتھ مل کر بیرونی کی کتاب ''الآثار الباقیۃ'' کی تحقیق کی اور جرمن مقدمے کے ساتھ 1871ء میں شائع کیا پھر مزید اضافے کے ساتھ 1879ء میں لندن سے شائع کیا۔اس مستشرق نے بیرونی کی کتاب ''ماللھند من مقولۃ'' کی بھی اشاعت کی ہے۔اوراس کے مقدمے میں بیرونی کو تاریخ انسانی کا سب سے بڑا دماغ قرار دیا ہے۔

20- ولہاوزن (Welhausen) متوفی 1928ء نے ''دیوان الہذلیین'' کو جرمن اورینٹل جرنل میں شائع کیا۔

21- ہاروچ (Horovitz J) متوفی 1931ء نے عربی شاعر کمیت کے دیوان ''الہاشمیات'' کے متن کو اپنی تحقیق اور جرمن ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔

22- نولڈکے (Noldeke) نے طرفہ کے دیوان کو مدون کیا۔کلیلہ ودمنہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔اور معلقات خمس کو متن اور ترجمے کے ساتھ ویانا سے 1899ء میں شائع کیا۔

معلومات کی جانچ:

1- مشرقی زبانوں کا اسکول کس نے قائم کیا۔

2- انتحال کسے کہتے ہیں۔

3- کس مستشرق نے متنبی پر سب سے زیادہ کام کیا۔

4- کس نے بیرونی کو انسانی تاریخ کا سب سے بڑا عقلمند قرار دیا۔

12.5 لغت

مستشرقین نے تقریباً تمام مشرقی زبانوں کو اپنا موضوع بنایا۔ جن میں عربی، فارسی اور اردو بھی شامل ہیں۔ خاص کر عربی زبان پر مستشرقین نے بے حد توجہ دی ہے۔ یورپ کا کوئی ایسا ملک نہیں تھا جہاں عربی زبان کی تعلیم کے لئے بہت سے مراکز' ادارے اور شعبے نہ رہے ہوں۔ کئی یونیورسٹیوں میں عربی کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو کے شعبے بھی قائم تھے۔ اس غرض سے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اور ہندوستان کے بہت سے اداروں میں انگریزوں کی تعلیم کے لئے مراکز قائم کئے گئے جہاں انگریزی حکومت کے آفیسرز اور عہدیداران مقامی زبانیں سیکھتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کی ترویج واشاعت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اگر چہ ان کا بنیادی مقصد اردو زبان کی خدمت نہیں تھی بلکہ مقامی ماحول اور ضرورت سے واقف انگریز حاکموں کو تیار کرنا تھا۔

عربی زبان میں بھی مستشرقین نے اہم کارنامے انجام دئے ہیں۔ لیکن فصحیٰ کے سلسلے میں استشراقی رویہ منفی نوعیت کا تھا۔ انہوں نے فصحیٰ کو ایسی زبان قرار دیا جو عصری ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ اور اس کے مقابلے میں انہوں نے عامی زبانوں اور لہجوں کی سرپرستی کی جو ظاہری طور پر اسلام دشمنی کا ایک مظہر ہے کیونکہ عربی فصحیٰ ہی کتاب وسنت اور اسلامی تہذیب وثقافت کی زبان ہے۔ مستشرقین نے نہ صرف عوامی لہجات پر کام کیا بلکہ ان کی ترویج واشاعت کے لئے حکومت واقتدار کا سہارا بھی لیا۔ اور مقامی لہجات کی طرف بلانے والی تحریکوں کے ساتھ تعاون کیا اور ان کو آگے بڑھایا۔

اسی طرح آزاد شاعری اور نثری نظم' ادب خواتین اور زبان وادب کے تاریک پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ عامی زبان کی دعوت کے پس پشت عربوں کے باہمی اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کرنا تھا۔

عربی زبان سے متعلق استشراقی مطالعے کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ انہوں نے فقہ اللغہ یا لسانیات پر کافی توجہ دی ہے۔ ہملٹن گب، ماسینیون، ڈی ساسی وغیرہ نے عربی زبان اور اس کی لسانیات پر بہت کام کیا ہے۔ اور استشراق کے تقریباً تمام مدارس نے عربی لغات اور معاجم پر کام کیا ہے۔ یورپ کی کوئی ایسی زبان نہیں ہے جس میں عربی کی کئی کئی لغات موجود نہ ہوں۔

زبانوں سے متعلق مستشرقین کی خدمات:

1- ولیم بیڈویل (Bedwell W) متوفی 1632ء نے سات جلدوں پر مشتمل عربی انگریزی لغت تیار کی۔ غالباً یہ انگریزی زبان میں عربی کی قدیم ترین لغت ہے۔

2- ایڈورڈ لین (Lane Edward) متوفی 1876ء نے مدالقاموس کے نام سے آٹھ جلدوں میں انگریزی عربی لغت تیار کی۔

3- جان گلکرسٹ (John Gilchrist) متوفی 1841ء نے اردو زبان کی نشر واشاعت میں بہت حصہ لیا وہ فورٹ ولیم کالج کولکاتا میں پروفیسر تھے انہوں نے انگریز ملازمین حکومت کے لئے اردو زبان کا نصاب بھی تیار کیا اور اردو زبان کی اولین قواعد کی کتابوں میں سے ایک

کتاب لکھی جو بڑی حد تک عربی قواعد کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ گلگرسٹ نے دہلی کالج میں بھی اردو کے استاد کے طور پر کام کیا، انہوں نے اردو اور فارسی زبان میں انجیل کا بھی ترجمہ کیا۔ انگریزی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں پر مشتمل ایک لغت تیار کی۔

4- مارسل (Marcel J.J) متوفی 1854ء نے ایک عربی فرانسیسی لغت تیار کی۔

5- رینان (Renan E) نے سامی زبانوں کی مفصل تاریخ مرتب کی۔

6- ورمنڈ (A. Wahrmund) متوفی 1913ء نے عربی جرمن لغت تیار کی۔

7- جرمنی کے ایک اور مستشرق برگسٹریسر (Bergstrasser G) متوفی 1933ء نے عربی کی مشہور لغت ''تہذیب اللغۃ'' کو اپنی تحقیق وتدوین کے ساتھ شائع کیا۔

معلومات کی جانچ:

1- مستشرقین نے لہجوں کو اہمیت کیوں دی۔

2- فورٹ ولیم کالج کہاں تھا۔

3- عربی، فرانسیسی لغت کس مستشرق نے تیار کی۔

12.6 خلاصہ

دوسرے تمام عربی اسلامی علوم وفنون کی طرح مستشرقین نے تاریخ اور زبان ادب کے موضوع پر بھی متنوع اور وسیع کام کیا ہے۔ ان موضوعات کے قدیم مخطوطات کی حفاظت وصیانت کی اور انہیں تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق شائع کیا۔ یوں تو تمام مدارس استشراق نے اس کام میں حصہ لیا ہے لیکن جرمنی کے مستشرقین اس میدان میں بھی سب سے آگے ہیں۔ مستشرقین نے ان موضوعات پر طبع زاد کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اور عربی اور دوسری مشرقی زبانوں کی لغات تیار کرنے میں خصوصیت سے دلچسپی لی ہے۔ اردو اور ہندوستانی زبانوں اور ان کے آداب پر فورٹ ولیم کالج کولکاتا اور ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی نمایاں کام کیا ہے۔ یورپ میں عربی زبان کی نشر واشاعت میں سلوسٹر ڈی ساسی کے قائم کردہ مشرقی زبانوں کے اسکول نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

ان علوم میں مستشرقین کی خدمات کے کچھ پہلو قابل تنقید بھی ہیں۔ انہوں نے یا ان میں سے بعض نے فرقہ واریت اور طائفیت کو فروغ دیا۔ مسلم قائدین کی غلط تصویر کشی کی۔ اور مسلم تاریخ کے روشن اور تابناک رخ کو نظر انداز کر کے اس کے صرف تاریک پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ زبان وادب میں بھی مقامی لہجات کا ساتھ دیا اور فصیح عربی کی صلاحیتوں اور اس کے نحوی وصرفی قواعد کی بے جا تنقید کی۔ اور ادب کے منفی یا کم مفید جوانب پر زیادہ توجہ کی اور انتحال جیسے موضوع کو مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کر کے قدیم عربی شاعری کے حوالے سے شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔

12.7 نمونے کے امتحانی سوالات:

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1- اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مستشرقین کے مناہج کو بیان کیجیے۔

2- اسلامی تاریخ پر مستشرقین کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3- عربی اسلامی ادب کے بارے میں استشراقی مواقف اور خدمات کا ذکر کیجیے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1- اسلامی تاریخ کی خدمات کے حوالے سے جرمن مدرسہ استشراق کا تعارف کرائیے۔

2- لغت نویسی میں مستشرقین کی خدمات کو بیان کیجیے۔

3- فریتاگ، فلوگل اور وسٹنفیلڈ کے چند کارناموں کا تعارف کرائیے۔

4- ادب میں انگریز مستشرقین کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

5- مستشرقین کی تحقیق کردہ چند اہم اسلامی تاریخ کی کتابوں کا ذکر کیجیے۔

12.9 مطالعے کے لیے معاون کتابیں:

1- المستشرقون — نجیب العقیقی، ۳ حصے، دائرہ معارف مصر 1964ء

2- موسوعۃ المستشرقین — عبدالرحمان بدوی، دار العلم للملائین بیروت، بار سوم 1993ء

3- اجنحۃ المکر الثلاثۃ — عبدالرحمان حبنکۃ میدانی، بار ہشتم، دار العلم، دمشق

4- المستشرقون والتراث — عبدالعظیم دیب، بار سوم دار الوفا مصر

اکائی 13 : مستشرقین کی خدمات کا تنقیدی جائزہ: غلط فہمیاں اور تحریفات، اسباب ونتائج

اکائی کے اجزا

13.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد مستشرقین کی خدمات کا تنقیدی جائزہ لینا ہے۔ ان کی غلط فہمیوں کے اسباب پر روشنی ڈالنا اور ان کی جانب سے کی جانے والی تحریفات کے نتائج واثرات کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ مستشرقین کی خدمات کی قدر و قیمت کا تعین کر سکیں گے۔ ان کی غلطیوں کے اسباب سے واقف ہو سکیں گے۔ اور اسلامی افکار وعلوم پر مستشرقین کے اعمال کے اثرات کی گہرائی اور وسعت سے باخبر

ہوسکیں گے۔عام لوگوں میں اسلام کے تعلق سے پھیلنے والی غلط فہمیوں اوران کے اضافے میں مستشرقین کی تحریروں کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔

13.2 تمہید

استشراق ایک ایسی انسانی علمی تحریک ہے جسے ایک مخصوص خطے اور مخصوص ذہن اور ایک خاص دین وثقافت کے حامل افراد نے چلایا ۔اور یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ انسان کی کوئی بھی تحریر اس کے عقیدے،افکار اور اس کی ثقافت کے اثرات سے خالی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ مذہبی' سیاسی' سماجی اور اقتصادی دوافع اور محرکات نے استشراقی تحریروں کو بھی متاثر کیا۔ یوروپ میں اسلام کے خلاف صدیوں کے پروپگنڈوں نے ان مستشرقین کو بھی متاثر کیا جنہوں نے بالقصد اسلام یا مسلمانوں کی مخالفت نہیں کی۔اور وہ بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوئے

بغیر نہیں رہ سکے۔ یہ ایک فطری قانون ہے اور اس کا انطباق استشراق کی تنقید کرنے والوں پر بھی ہوتا ہے۔ یہ حضرات بھی اپنے عقیدے اور افکار کے زیر اثر استشراق کی تنقید میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔اس جہت سے نہ استشراق قابل مذمت ہے اور نہ اس کی تنقید کرنے والے۔البتہ اگر یہ کام قصد وارادے کے ساتھ کیا جائے تو بلاشبہ قابل مذمت اور لائق نکیر ہے۔البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جس نے بالقصد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لکھا اور اس ضمن میں تمام علمی اور اخلاقی قدروں کو پامال کیا۔

استشراق کے بعض تاریک گوشوں کے ساتھ کئی روشن پہلو بھی ہیں۔جن کا اعتراف اوران کی ستائش بھی ہونی چاہیے۔استشراق کی تنقید میں اس امر کا بھی لحاظ ہونا چاہیے کہ ہم ان سے اس بات کی توقع اور اس کام کا مطالبہ نہیں کرسکتے جو اہل ایمان سے کیا جاتا ہے۔ استشراق کی تنقید میں اس بات کی بھی رعایت ہونی چاہیے کہ یہ ایسے افراد کی جماعت ہے جو اسلام' اسلامی تہذیب وثقافت اور زبانوں سے بڑی حد تک ناواقف ہیں۔استشراق کے عروج کا عہد مذہب بیزاری اور مادی فلسفوں کے عروج کا زمانہ تھا اور استشراق بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ۔یہ عہد مغرب کے عروج واقتدار کا بھی عہد تھا۔ چنانچہ استشراقی مطالعات میں استعلائی اسالیب کا در آنا بھی بڑی حد تک فطری ہے۔اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ نہ مشرق جنت ہے اور نہ یہاں صرف اور صرف فرشتے رہتے ہیں۔عرب' مسلمانوں اور مشرقیوں سے بھی فکری اور عملی غلطیاں ہوئی ہیں۔اوران غلطیوں کی نشاندہی نہ برائی ہے اور نہ کسرشان کی بات ہے۔لہٰذا'' اپنے بھائی کی حمایت مظلوم ہونے کی صورت میں کرنا چاہیے ظالم ہونے کی صورت میں نہیں'' اور مستشرقین کی مثبت تنقیدات کی پذیرائی ہونا چاہیے۔

13.3 مستشرقین کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کے اسباب

مستشرقین کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کے کئی اسباب ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں ان مستشرقین کی بات نہیں کی جارہی ہے جو محض استعماری اور تبشیری اداروں کے ایجنٹ تھے۔ ابتدا میں تحریک استشراق میں انہیں کی اکثریت تھی بلکہ استشراق کا آغاز ہی عیسائی مذہبی اداروں اور مذہبی شخصیات سے ہوا۔اور یہ صورت حال اٹھارویں صدی کے خاتمے تک برقرار رہی، بلکہ یہاں مستشرقین سے مراد وہ حضرات ہیں جن سے غیر ارادی غلطیاں ہوئیں ایسے مستشرقین کی غلط فہمیوں اور غلطیوں کے اہم اسباب کو مندرجہ ذیل نقاط میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

1. اسلام پر ایمان نہ ہونا: ظاہر ہے کہ جو شخص اسلام کو من جانب اللہ نہیں سمجھتا ہے نہ وہ حضرت محمد ﷺ کو خدا کا رسول مانے گا اور نہ قرآن کو اللہ کی کتاب تسلیم کرے گا۔ وہ اپنی فکر و عقیدے کے مطابق نزول وحی کی مادی توجیہات کرے گا اور قرآن میں مذکورہ تاریخی واقعات کو ورقہ بن نوفل، بحیرہ راہب اور ان جیسے دوسرے عیسائی اور یہودی افراد کی تعلیم قرار دے گا۔ اور قرآن کریم کی بلاغت کو نبی اسلام ﷺ کی بادیہ میں پرورش کا نتیجہ سمجھے گا۔

2. مسلمانوں اور عربوں کی تہذیب و ثقافت اور سیاسی و سماجی احوال سے ناواقفیت: بہت سارے مستشرقین کی غلطیوں کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کو مغربی تہذیب و ثقافت پر قیاس کرتے ہیں اور یہ قیاس انہیں غلط نتائج تک پہنچاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی قوم میں زبانی اور شفوی روایات کا ایسا نظام نہیں ملتا ہے جو عربوں کے یہاں تھا، نہ صرف ان کی زبان میں فصاحت و بلاغت کے غیر معمولی عناصر تھے بلکہ یادداشت اور حافظے کی قوت میں بھی عرب دوسروں سے ممتاز تھے۔ چونکہ عرب عموماً لکھنا نہیں جانتے تھے لہذا حافظے پر بھروسہ کرنا ان کی ضرورت بھی تھی اور مجبوری بھی۔ لیکن اسی چیز نے ان کے حافظوں کو غیر معمولی طور پر مضبوط اور قوی بنادیا اور یہ طبیعت کے مسلمات میں سے ہے کہ جن اعضا کا زیادہ استعمال ہوتا ہے ان کی قوت و صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مستشرقین نے اپنے ظروف و احوال پر قیاس کرتے ہوئے۔ جاہلی شاعری اور حدیث کی روایتوں میں شبہ کا اظہار کیا مگر یہ قیاس مع الفاسد تھا۔

3. عربی زبان سے بھرپور واقفیت نہ ہونا: یہ بھی ایک اہم سبب ہے جس نے مستشرقین کو غلط نتائج تک پہنچایا۔ عربی زبان کی فہم کے لیے زیادہ تر مستشرقین نے غیر عربی اساتذہ اور مصادر پر اعتماد کیا۔ غیر اہل زباں اساتذہ اور انہیں کی تیار کردہ کتابوں اور لغات سے عربی زبان کو سیکھا۔ چنانچہ عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان پر پوری طرح قدرت نہ ہونے کے سبب نصوص شرعیہ کو سمجھنے میں بہت سارے مستشرقین سے غلطیاں ہوئیں اور ان غلطیوں نے انہیں غلط نتائج سے ہمکنار کیا۔

4. مادی مناہج اور اصولوں کا استعمال: اسلام ایک آسمانی مذہب ہے جو وحی، الہام، آخرت اور دوسرے امور غیبیہ پر مشتمل ہے۔ جن کا اثبات مادی وسائل و ذرائع سے نہیں ہوسکتا۔ اور جن قاعدوں اور مناہج کی اتباع کر کے طبیعیات اور سماجی علوم کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ انہیں غیبیات میں استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے۔

یہ تو ان مستشرقین کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کے اسباب ہیں جو علمی وسائل و آلات کی کمی کے سبب ان میں گرفتار ہوئے۔ لیکن ایسے مستشرقین کی بھی کمی نہیں ہے جنہوں نے قصداً اسلام کی صورت بگاڑنے اور اس میں شک وشبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ صلیبی جنگوں میں مغرب اور عیسائیت کی بدترین شکست اور ہزیمت نے انہیں جنون میں مبتلا کردیا۔ اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف علمی محاذ قائم کیا۔ اور انہیں جنگ کے میدان کے بجائے علم کے میدان میں شکست دینے کا ارادہ کیا۔ کئی مفکرین کا خیال ہے کہ استشراق کی ابتدا اسی نفسیات کے زیر اثر ہوئی۔ اس ضمن میں شہنشاہ فرانس لوئس نہم کی ایک وصیت کا ذکر بھی گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے جب اس شہنشاہ نے خود ایک صلیبی جنگ کی قیادت کی تھی اور شکست کھا کر گرفتار ہوا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے اسے رہا کردیا تھا لیکن وہ اپنی ہزیمت کے احساس اور ذلت کے شعور کی قید سے کبھی آزاد نہ ہوسکا۔ اور اس نے بستر مرگ پر مسلمانوں کے خلاف علمی اور فکری جنگ شروع کرنے کی وصیت کی تھی اور اس وصیت پر عمل آوری کے

طور پر استشراق کا آغاز ہوا۔

ڈاکٹر محمد البہی نے اپنی کتاب ''الفکر الاسلامی'' میں فرانسیسی مستشرقین کے تعصب کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق کیتھولک مستشرقین اسلام دشمن ہیں۔ اگر اس اطلاق کو پوری طرح صحیح نہ بھی مانا جائے تو بھی اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ فرانس کے کیتھولک مستشرقین اسلام اور مسلمانوں سے تعصب میں سب سے آگے ہیں۔ ڈاکٹر حسین مونس نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ فرانسیسی مستشرقین اسلام اور رسول اسلام کے خلاف تعصب میں زیادہ شدید ہیں۔

نیچے کی سطروں میں تعصب کے شکار مستشرقین کی غلطیوں کے بعض اسباب کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس تعصب کی وجہ دینی بھی ہو سکتی ہے اور قومی اور سیاسی وغیرہ بھی ہو سکتی ہے۔

1. عیسائیت کے غلبے اور نشر و اشاعت کی خواہش جس کی راہ میں اسلام سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے وہ تشکیک، مغالطہ اور افتراء وغیرہ تمام وسائل سے کام لیتے ہیں۔ ایک طویل عرصے تک رسول اللہ ﷺ کو طرح طرح کی صفتوں سے متصف کیا گیا اور ان کی عجیب وغریب اور اہانت آمیز تصویر کشی کی گئی جس کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں آج تک چل رہا ہے۔

2. اسلام کے محاسن سے توجہ ہٹانے کے لیے اس کی تمام خوبیوں کو عیسائیت اور یہودیت سے منسوب کرنے کی کوشش۔ جس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں سوائے بعض ان مشابہتوں اور مماثلتوں کے جو تینوں مذاہب کے آسمانی ہونے کی وجہ سے ہیں نہ کہ اس لیے کہ ایک نے دوسرے سے نقل کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں بھی بہت سی مشابہتیں ہیں مگر ان کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے ماخوذ نہیں قرار دیا جاتا۔

3. استعماری طاقتوں کے ساتھ کام کرنے والے مستشرقین کا فریضۂ منصبی تھا کہ وہ اسلامی وحدت واجتماعیت، اسلامی غیرت، حمیت اور مسلمانوں کے دینی افتخار کے شعور کو کمزور کریں تا کہ استعماری قوتوں کے راستے صاف اور آسان ہو سکیں لہٰذا فرقہ وارانہ منافرت اور علاقائی تعصب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تا کہ مسلمانوں میں اختلاف وانتشار پیدا ہو۔ نو آبادیاتی نظام اور استعماری اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے عربی زبان اور اسلامی تہذیب سے مسلمانوں کا تعلق کمزور ہونا اور مغربی تہذیب زبان سے رشتے استوار ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے کبھی اسلامی تہذیب کو مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بتایا گیا تو کبھی عربی زبان پر تہمت لگائی گئی کہ یہ زبان علمی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتی ہے۔

4. بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب تمام مشرقی ممالک یوروپ کے چنگل سے آزاد ہو گئے ان میں عرب اور اسلامی ممالک بھی تھے۔ تو سیاسی اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے انہیں وسائل کا استعمال کیا گیا جن کا استعمال دینی اور استعماری مقاصد کے حصول کے لیے کیا گیا تھا۔

معلومات کی جانچ:

1. مستشرقین نے کس بنیاد پر اسلام کو عیسائیت اور یہودیت سے ماخوذ بتایا۔

2. اسلام کے خلاف کون سا عیسائی فرقہ زیادہ متعصب قرار دیا گیا۔

3. کس عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کے خلاف علمی وفکری محاذ کھولنے کی وصیت کی تھی۔

13.4 مستشرقین کی غلطیوں کے نمونے

اسلام اور اسلامی عقیدے اور شریعت کے بارے میں مستشرقین عجیب وغریب مناہج کا استعمال کرتے ہیں۔ایک مخلص محقق کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے متعلقہ نصوص اور عبارتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔پھر مقدمات تیار کرتا ہے ان مقدمات کو منطقی ترتیب دیتا ہے اور پھر نتیجے پر پہنچتا ہے۔جبکہ متعصب مستشرقین کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے وہ ایک متعین فکر اور نتیجے کے ساتھ اپنی بحث وتحقیق کو شروع کرتے ہیں اور پھر اسی فکر ونتیجے کو ثابت کرنے والے مقدمات ونصوص تلاش کرتے ہیں اور ایسے مقدمات ونصوص کو فوراً قبول کر لیتے ہیں جو ان کے مفروضہ نتیجے تک پہنچانے والے ہیں خواہ وہ کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں اور ایسے نصوص اور مقدمات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ان کی فکر اور مزعوم نتیجے سے متصادم ہوں خواہ وہ کتنے ہی مضبوط اور قوی کیوں نہ ہوں۔وہ قیاس علمی کے معمول بہ طریقے یعنی مقدمات سے نتائج تک پہنچنے کے بجائے نتائج سے مقدمات تک پہنچتے ہیں۔اس حقیقت کو مندرجہ ذیل سطور میں چند مثالوں کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

1. گولڈ زیہر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حدیثیں مجموعی طور پر قرون ثلاثہ اولی میں وضع کی گئی ہیں اور صدر اول میں مسلمان احکام شریعت سے پوری طرح واقف نہیں تھے اور نہ سیرت رسول کو اچھی طرح جانتے تھے اور اس کی دلیل کے طور پر دمیری کی کتاب الحیوان سے یہ نقل کیا ہے کہ ابوحنیفہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ بدر کی جنگ پہلے ہوئی تھی یا احد کی جنگ۔

یہ دعویٰ اور اس کی دلیل سبھی کچھ حیرت انگیز ہے۔دنیا جانتی ہے کہ امام ابوحنیفہ ان ائمہ اسلام میں سے ہیں جنہوں نے اسلام میں جنگ کے قوانین پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔بھلا یہ کام وقائع سیرت اور مغازی سے بھرپور واقفیت کے بغیر کیونکر ممکن ہے۔امام صاحب کے شاگردوں اور خوشہ چینوں نے بین الاقوامی قوانین پر کتابیں لکھی ہیں اور جنگ کے احکام پر مستقل تصنیفات کی ہیں۔جیسے امام یوسف کی کتاب ''الرد علی سیر الاوزاعی'' اور امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب ''السیر الکبیر'' اور امام سرخسی کے ذریعے کی جانے والی اس کی شرح جو نہ صرف اسلام بلکہ بین الاقوامی تعلقات سے متعلق قوانین پر دنیا کی پہلی کتاب ہے۔

امام صاحب کے شاگردوں کی یہ کتابیں گولڈ زیہر کے رد کے لیے کافی تھیں۔علاوہ ازیں -بقول عبدالرحمان حبنکہ میدانی- گولڈ زیہر کے لیے ان کتابوں تک پہنچنا دشوار نہ تھا لیکن حدیث وسیرت کو بعد میں زمانے میں وضع کیے جانے کے دعووں کو ثابت کرنے کے لیے گولڈ زیہر نے دمیری کی کتاب پر اعتماد کیا جو نہ مورخ ہیں اور نہ فقیہ اور ان کی اس کتاب میں بغیر کسی تحقیق وتمحیص کے معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔

2. اس کی دوسری مثال امام محمد بن مسلم بن شہاب زہریؒ متوفی 124 ھ پر گولڈ زیہر کی جانب سے حدیث وضع کرنے کا الزام ہے۔گولڈ زیہر کا دعویٰ ہے کہ امام زہری نے حدیث'' لاتشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد ......'' کو اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے

لیے وضع کیا تھا۔ اور اس بڑے دعوی کے لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ امام زہری اور عبدالملک بن مروان ہم عصر تھے۔ ایک دوسری طرف گولڈزیہر نے درجنوں ائمہ جرح وتعدیل کے ان اقوال کو ایک سرے سے نظر انداز کر دیا جنھوں نے امام زہری کی امانت صداقت اور دیانت کی شہادتیں دی ہیں۔ اور انہوں نے ان درجنوں سوانح نگاروں اور مورخین کو بھی قابل اعتبار نہیں سمجھا جنھوں نے امام زہری کے تقوی اور ورع کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

3. مستشرقین میں بہت سے ایسے ہیں جو اس بات کو ثابت کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ عرب اپنے عجمی مفتوحین کے ساتھ انسانی سلوک نہیں کرتے تھے اور ان کی تذلیل وتحقیر کرتے تھے۔ مشہور مستشرق بروکلمان اپنی کتاب ''مسلم قوموں کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''عرب چونکہ حاکم طبقے کی تشکیل کرتے تھے لہذا وہ عجمیوں کو رعیت سمجھتے تھے۔ رعیت یعنی جانوروں کا ریوڑ جس کی جمع رعایا آتی ہے۔ اور عرب عجمیوں کو رعایا کہہ کر ہی بلاتے تھے اور یہ ایک قدیم سامی تشبیہ ہے جو اشوریوں تک معروف ومتداول تھی۔''

یہ لکھتے وقت بروکلمان نے ان تمام تاریخی روایتوں کو نظر انداز کر دیا۔ جو مفتوحین کے ساتھ مسلمانوں اور عربوں کی عدالت بلکہ احسان کی گواہی دیتی ہیں اور ایک لفظ رعیت کے صرف ایک معنی کو لے کر پورا نظریہ قائم کرنے کی کوشش کر ڈالی۔

عربی میں یہ لفظ صرف جانوروں کے ریوڑ کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ راعی کے معنی نگراں اور والی کے بھی آتے ہیں اور عربی معاجم ولغات میں رعیت کا معنی عوام بھی لکھا ہوا ہے۔ عربی میں راعی رئیس القوم کے لیے بولا جاتا ہے جس کے اندر نگرانی ہمدردی اور حفاظت وغیرہ کے معنی بھی ہیں اور یہ بھی غلط ہے کہ عربوں نے اس کا استعمال صرف عجمیوں کے لیے ہی کیا ہے۔ بلکہ یہ لفظ عربی عوام کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ صرف یہی ایک بات بروکلمان کے استدلال کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے۔

حدیث ''الا کللم راع و کلکم مسئول عن رعیته .... والی حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس لفظ کا استعمال تحقیر وتذلیل کے لیے نہیں ہوتا ہے۔ امام ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ ''الراعی: الحافظ المؤتمن'' یعنی راعی کا مطلب نگراں اور امانت دار کے ہیں۔ (فتح الباری)

4. چوتھی مثال ولیم میور کا یہ خیال ہے کہ عرب کے بدو بلاغت اور طلاقت لسانی میں بہت آگے تھے اور نبی اسلام نے یہ فن بدوؤں سے سیکھا تھا۔ یہ ایک مضحکہ خیز اور وہمی استدلال ہے۔ کیونکہ عربوں کے پاس خاص کر بدوؤں کے پاس ایسا کوئی نظام نہ تھا اور نہ کوئی ایسی روایت ہے جو اس فرضی دعویٰ کی تصدیق کر سکے۔ اور نہ ہی نزول قرآن سے قبل نبی کریم ﷺ کی فصاحت وبلاغت کا کوئی ذکر اور اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔ نبی کریم ﷺ یقیناً افصح العرب تھے لیکن انہوں نے جو سیکھا تھا وہ سب ان کے رب نے سکھایا تھا۔

مستشرقین واقعات کے فرضی اسباب وعلل وضع کرنے میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ اسلامی تہذیب اور سوسائٹی کو مغربی معیار پر جانچنے کی غلطی کرتے ہیں۔ سیرت محمدیہ اور ظہور اسلام کا تجزیہ اور تحلیل مغربی ذہنیت کی بنیاد پر کرتے ہیں اور بقول ناصرالدین اتیان ڈینٹ: مغربی منطق مشرقی انبیاء کی تاریخ میں صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتی ہے۔

13.5 استشراق کے ایجابی وسلبی آثار

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ استشراق کے ایجابی اور سلبی دونوں پہلو ہیں چنانچہ استشراق کے نتائج اور آثار بھی ایجابی اور سلبی دونوں نوعیت کے ہیں:

ایجابی آثار

1. مختلف علوم فنون سے متعلق ہزاروں ہزار مخطوطات کی حفاظت وصیانت اور ان کی نگہداشت۔
2. ان مخطوطات کی تحقیق وتدوین اور ان کی نشر واشاعت۔
3. علمی مناہج، بحث وتحقیق کی ترویج واشاعت اور مشرق سے تعلق رکھنے والے طلبہ اور محققین کی تعلیم وتربیت۔
4. قدیم مشرقی زبانوں کا انکشاف اور ان کی بازیافت اور ان زبانوں میں ملنے والی تحریروں کو سمجھنا اور حل کرنا۔ جیسے سنسکرت' پالی' بابلی' اشوری اور فینیقی زبانیں۔

جرجی زیدان لکھتے ہیں کہ:

''عہد جدید میں عربی زبان کے احیا اور اس کی نشاۃ ثانیہ کے عوامل میں فرنگیوں کے ذریعہ اس زبان کے قدیم مخطوطات کی تحقیق و تدوین اور ان کی نشر واشاعت بھی ہے۔''

5. قدیم تہذیبوں کے مطالعات کے ذریعے ان تہذیبوں کی معاشی وسیاسی و دینی وثقافتی زندگی کے احوال کا انکشاف۔
6. مشرقی مخطوطات اور علمی نوادرات کے لیے ایسے کتب خانوں کا بندوبست جہاں دوسرے ان سے استفادہ کرسکیں۔
7. ان مخطوطات وآثار کی تفصیلی تعارفی فہرست تیار کرنا اور ان فہرستوں کی اشاعت جس سے ان علمی خزانوں سے دور دراز کے لوگ بھی واقف ہوسکیں۔
8. مشرقی علوم وفنون میں بحث وتحقیق کے قواعد کو وضع کرنا اور اپنی کتابوں میں انہیں عملی طور پر تطبیق دینا۔
9. استشراقی کانفرنسوں کا انعقاد اور ان کی تنظیم۔
10. استشراقی رسائل ومجلّات کا اجراء تا کہ ان کانفرنسوں اور رسائل کے ذریعہ استشراقی اعمال میں توحید وتنسیق بھی ہو اور ان کاموں کی بڑے پیمانے پر تشہیر واشاعت بھی ہے۔ یہ ایک صحت مند علمی طریقہ تھا جس سے مشرق اور اہل مشرق نے بہت کچھ استفادہ کیا۔
11. مستشرقین کے ذریعے لکھے گئے بے شمار علمی مقالات' مقدمات' مضامین اور ریویوز وغیرہ اور ان کی تصنیف کردہ کتب' موسوعات اور دائرہ معارف وغیرہ۔ جن میں لسانی فہم اور مشرقی احساس وشعور وجذبات کی سمجھ کی کمی اور مشرقی ادیان وتحریکات اور اداروں سے واقفیت کی قلت کے باوجود تحقیقی مناہج کی مضبوطی، علمی اصولوں کی رعایت اور تحریر وکتابت کی پختگی پائی جاتی ہے۔
12. مستشرقین کے استشراقی مطالعات اور علمی کارناموں کا مشرقی اقوام کے اندر علمی وسیاسی بیداری پیدا کرنے میں گرانقدر حصہ اور

بہت اہم کردار ہے۔

سلبی آثار

استشراق کے سلبی آثار بھی کثیر اور متنوع ہیں۔ان سلبی آثار کے پس پشت دینی' سیاسی اور اقتصادی اور شخصی عوامل ہیں۔سیاسی برتری اور علمی تفوق کا احساس بھی ان عوامل میں سے ایک ہے۔استاد عبدالرحمٰن حبنکہ میدانی نے اپنی مشہور کتاب ''اجنحۃ المکر الثلاثۃ'' میں اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔لکھتے ہیں کہ:مشہور برطانوی مستشرق اینڈرسن (Anderson A.B.) نے ازہر سے فارغ ایک عربی طالب علم کو لندن یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے امتحان میں اس لیے فیل کر دیا کہ اس نے اسلام میں عورتوں کے حقوق پر مقالہ لکھا تھا اور اس میں یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام نے عورتوں کو کامل حقوق دیے ہیں۔میدانی لکھتے ہیں کہ میں نے اس مستشرق سے پوچھا کہ آپ لوگ تو آزادیٔ رائے کی بات کرتے ہیں پھر آخر اس کو فیل کیوں کر دیا؟ تو اینڈرسن نے جواب دیا کہ وہ کس طرح اسلام میں عورتوں کے حقوق کا دعویٰ کرتا ہے' کیا وہ اسلام کا رسمی اور سرکاری ترجمان ہے؟ کیا وہ ابوحنیفہ اور شافعی ہے کہ یہ بات کرے اور اسلام کی ترجمانی کرے؟ اور اس نے اسلام میں عورتوں کے جن حقوق کی بات کی ہے وہ تو قدیم فقہاء نے بھی نہیں کی لہذا اسے کیا حق پہنچتا ہے؟ یہ طالب علم مغرور اور خود پسند ہے اور اس بات کا مدعی ہے کہ وہ اسلام کو ابوحنیفہ اور شافعی سے زیادہ سمجھتا ہے۔

اسے مذہبی تعصب کہا جائے، علمی وفکری تفوق و برتری کا احساس کہا جائے یا قومی جانبداری کا نام دیا جائے۔اس جواب کو کسی بھی طور پر علمی نہیں کہا جا سکتا ہے اور نہ اس کی غیر معقولیت کو کسی شرح و بیان کی حاجت ہے۔

استشراق کے سلبی آثار کا ایک مظہر مشرقی ممالک کے وہ نام نہاد دانشور حکماء اور ادباء ہیں جنہوں نے مستشرقین یا ان کی کتابوں کے زیر سایہ تربیت پائی اور مستشرقین کے افکار و نظریات سے متاثر ہوئے ،عربوں میں اس کی مثال احمد امین' طٰہٰ حسین' سلامہ موسیٰ' احمد لطفی سید اور محمد مندور وغیرہ ہیں۔

استشراق کے سلبی آثار میں سے یہ بھی ہے مشرقی ملکوں میں ایک پوری ایسی نسل تیار ہوگئی ہے جس کا اپنے ماضی اور علمی وفکری میراث پر کوئی بھروسہ نہیں ہے اور وہ ہر معاملے میں مغرب کی طرف ہی دیکھتی ہے۔چنانچہ پورا مشرق مغربی افکار اور تہذیب کا گہوارہ بن گیا ہے۔

13.6 استشراقی اغلاط و تحریفات

استشراق نے مشرقی فکر و خیال کو گہرائی تک متاثر کیا ہے اور اتنے طویل عرصے تک کاروان علم و تحقیق کی قیادت کرنے کے سبب مشرقی اقوام مین نہ صرف مرعوبیت کے جذبات پیدا کر دیے بلکہ انہیں اپنی علمی وراثت سے بھی دور کر دیا اور اس کے تئیں ان کے عقیدے کو متزلزل کر دیا، اب جو استشراق کی تبعیت اور اس کی اقتداء نہیں بھی کر رہا ہے وہ بھی معذرت خواہانہ لہجے میں بات کر رہا ہے۔لیکن اب صورت حال بدل رہی ہے۔پورے استشراقی ورثے کی جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ اور معروضی انداز میں عرب کی کئی جامعات اور اداروں میں ان پر کام ہو رہا ہے۔ اور مستشرقین کی تحریفات اور بے جا تاویلات سے روز بروز پردہ اٹھ رہا ہے۔

مندرجہ ذیل سطروں میں مختلف علوم فنون سے متعلق استشراقی اغلاط و تحریفات کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے۔

قرآن وحدیث وفقہ

1. جارج سیل نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمے میں لکھا ہے کہ یہ محمد (ﷺ) کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ رچرڈ بیل (Rechard Bell) کا خیال ہے کہ نبی اسلام نے قرآن کو یہودی مصادر سے اخذ کیا ہے۔
2. مستشرقین نے قرآن کے ترجے اور تفسیر میں لفظی اور معنوی تحریفات کی ہیں۔
3. حکایت غرانیق وغیرہ پر غیر معمولی توجہ دی ہے جب کہ علماء اسلام کی بھاری اکثریت اس واقعہ کو موضوع بتاتی ہے۔ لیکن مستشرقین کا اس واقعے کی صحت پر ''اجماع'' ہے۔
4. گولڈ زیہر وغیرہ نے تمام حدیث کے ذخیرے کو موضوع اور جعلی قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں ان حدیثوں کو مختلف فقہی اور کلامی جماعتوں نے گڑھا ہے۔ اور وضع حدیث کا کام عہد صحابہ ہی میں شروع ہو گیا تھا۔
5. شاخت کے مطابق پہلے حدیث حجت نہیں تھی۔ حدیث کی حجیت کا قاعدہ امام شافعی نے ایجاد کیا ہے۔
6. مستشرقین نے متواتر احادیث کو موضوع قرار دے دیا ہے چنانچہ پروفیسر گب نے حدیث ''من کذب علی متعمدا......'' کو اور ونسنک نے حدیث ''بنی الاسلام علی خمس......کو موضوع قرار دیا ہے۔
7. مستشرقین کے خیال میں پہلی صدی ہجری میں سند کا وجود نہیں تھا۔
8. اسلامی فقہ کو رومن قوانین سے مستنبط مانتے ہیں۔
9. اسلامی فقہ پر تلمودی اثرات مانتے ہیں۔
10. کتاب وسنت کو اسلامی فقہ کا مصدر نہیں مانتے ہیں۔

سیرت، سوانح اور تصوف

1. واقعات سیرت کی حسب دلخواہ تفسیر و تاویل کرتے ہیں۔
2. یہ خیال کہ پیغمبر اسلام کا نام مکہ میں قثم تھا اور مدینہ میں آ کر آپ کا نام محمد ہو گیا۔
3. یہ موقف کہ یہود بنو قریظہ اور بنو نضیر کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی۔
4. مستشرقین کا خیال ہے کہ خیبر کے یہودی مظلوم تھے۔
5. سیرت نبوی میں اپنی پسند کی روایت کے لیے ضعیف ترین مصدر کو قبول کرنا اور ناپسندیدہ کے لیے قوی ترین روایات کا انکار کر دینا۔
6. ان کا یہ کہنا کہ نبی اسلام کے فکر و عمل میں آسمانی ہدایات کے بجائے زمینی حالات کے سبب تبدیلیاں آئیں۔
7. سوانح نویسی میں بھی مستشرقین نے اپنی پسند اور خواہشات کا ہی خیال رکھا۔
8. قائدین اسلام کی صورت مسخ کرنے کی کوشش کی۔
9. منحرف اور انتہا پسندانہ شخصیت رکھنے والے افراد پر توجہ مرکوز کی۔

10. منحرف صوفی شخصیات اوران کے ذریعے کی جانے والی غیر شرعی رسوم و معمولات کو موضوع بنایا۔

11. اسلامی تصوف کے غیر اسلامی اصل ہونے کا دعویٰ کیا۔

12. تصوف کی خوبیوں کو عیسائیت سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔

تاریخ، ادب و لغت

1. تاریخ لکھنے میں غیر تاریخی کتابوں پر اعتماد کیا۔

2. فرقہ وارانہ تاریخ اور منحرف جماعتوں اور افراد کی تاریخ پر توجہ دی۔

3. تفسیر بالاسقاط سے کام لیا یعنی قدیم تاریخی واقعات وحوادث کو موجودہ صورت حال کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔

4. انتقائی منہج کو اختیار کیا یعنی جو پسند آیا اسے لے لیا اور جو نہیں آیا اسے چھوڑ دیا۔

5. تاریخی واقعات وشخصیات کی صورت عمداً مسخ کی۔

6. ایسے مصادر ومراجع پر بھروسہ کیا جو مسلمانوں کے نزدیک بھروسے مند نہیں ہیں۔

7. قطعی دلیل کو مشکوک قرار دینا۔

8. بغیر دلیل کے قطعی حکم صادر کر دینا۔

9. عہد عباسی کی ایسی صورت گری جیسے اس عہد میں عیش وعشرت اور شراب وکباب کے سوا کچھ نہیں تھا۔

10. ایسی تاریخی غلطیوں کو ہائی لائٹ کرنے کی کوشش جو سبھی قوموں میں مشترک ہیں۔

11. جزئی تاریخی احکام سے کلی نتائج اخذ کرنا اور اس کے حوالے سے پوری امت پر حکم لگانا۔

12. عربی زبان کی اصالت سے انکار کرنا۔

13. اس کی صلاحیتوں اور امکانات کو کم کرنے کی کوشش کرنا۔

14. عربی قواعد کو یونانی قواعد سے ماخوذ قرار دینا اور اس کے لیے ابوالاسود دؤلی اور خلیل فراہیدی وغیرہ کے یونانی نحو کے ماہرین جیسے حنین بن اسحاق اور یعقوب رہاوی وغیرہ سے تعلقات یا ملاقات کو دلیل بنانا۔

15. جدید علوم وفنون کے لیے عربی زبان کو نااہل سمجھنا۔

16. عوامی لہجات کو فروغ دینے کی کوشش کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

معلومات کی جانچ:

1. السیر الکبیر کس کی تصنیف ہے۔

2. "مسلم قوموں کی تاریخ" کس مستشرق نے لکھی ہے۔

3. نبو قریظہ کا دین کون سا تھا۔

4 نبو نصیر کا کیا مذہب تھا۔

13.7 خلاصہ

مستشرقین نے تمام اسلامی علوم وفنون کو اپنا موضوع بنایا اور اس میں تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین کا کام کیا۔ اسلامی مخطوطات وآثار کی حفاظت وصیانت اور اس کی نشر واشاعت کی۔ مشرقی قوموں کو ان کے آثار اور ان کی زبانوں میں لکھے گئے مخطوطات اور وثائق کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور انہیں بحث وتحقیق کے مناہج اور تصنیف وتالیف کے اصول سکھائے۔

اس جہت سے مستشرقین کا کام قابل تعریف ولائق تحسین ہے۔ دوسری طرف انہوں نے تحریف وتخریب اور دسیسہ کاری سے کام لیا۔ مشنریز کی خدمت کی اور نوآبادیاتی نظام کی مضبوطی اور استحکام کے لیے کام کیا۔ مشرقی قوموں میں اپنے تہذیب وتمدن اور دینی ورثے کے بارے میں شک وشبہ پیدا کیا اس کی غلط تصویر کشی کی اس حیثیت سے بعض مستشرقین کے کام اور طریقے دونوں لائق مذمت ہیں۔

تاریخی اختلافات اور صلیبی جنگوں کے زیراثر استشراق نے اسلام اور مسلمانوں پر کچھ زیادہ توجہ کی۔ اور اکثر مستشرقین نے اسلام کے ساتھ زیادتی اور مسلمانوں کی حق تلفی کی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ لیکن ایسے بھی مستشرقین رہے ہیں جنہوں نے انصاف سے کام لیا ہے اور قصداً غلطیاں اور تحریفات نہیں کی ہیں سوائے ان غلطیوں کے جو مسلمانوں کی زبان اور ان کی تہذیب وثقافت سے ناواقفیت اور مشرق ومغرب کے مزاج وطبیعت کے اختلاف کے سبب صادر ہوئیں۔

13.8 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1- مستشرقین کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔

2- مستشرقین کی علمی وفکری غلطیوں کو مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے۔

3- استشراق کے ایجابی اور سلبی آثار کا جائزہ لیجیے۔

4- علوم اسلامیہ عربیہ میں مستشرقین کی تحریفات اور غلطیوں پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

مندرجہ ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں تحریر کیجیے۔

1- مستشرقین کی غلطیوں کے پانچ اسباب کا جائزہ لیجیے۔

2- علمی وسائل کی کمی کے سبب ہونے والی مستشرقین کی غلطیوں کو بیان کیجیے۔

3- تعصب کے سبب ہونے والی تین غلطیوں کو وضاحت کے ساتھ ذکر کیجیے۔

4- تاریخ وادب اور لغت کے حوالے سے مستشرقین کی غلطیوں پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

13.9 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

1- ظاہرۃ انتشار الاسلام وموقف بعض المستشرقین منہا، فتح اللہ الزیادی، کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ، لیبیا

2- أجنحہ المکر الثلاثۃ، عبدالرحمان حبنکۃ میدانی، دارالقلم، دمشق

3- المستشرقون والسیرۃ النبویۃ، عمادالدین خلیل، دار ابن کثیر، بیروت

4- الفقہ الاسلامی فی دراسات المستشرقین، بان حسین السنجری، مجلۃ کلیۃ التربیۃ للبنات الجامعۃ المستنصریۃ، بغداد

5- استشراق، ایڈورڈ سعید ترجمہ: ڈاکٹر محمد عنانی، بیروت

بلاک : 4 اسلامی علوم میں ہندوستانی غیر مسلموں کی خدمات

فہرست

اکائی 14 : ہندوستان میں اسلام کا مطالعہ: آغاز وارتقاء

اکائی کے اجزاء

14.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طالب علم کو اس بات سے واقف کرانا ہے کہ برصغیر میں اسلام اور اس سے جڑے علوم وفنون کا غیر مسلموں پر کب، کیسے اور کتنا اثر ہوا۔ ہندوستان کے غیر مسلم حکمرانوں اور عوام کو اسلامی علوم سے جو دلچسپی ہوئی اس کا کیا نتیجہ رہا اس کا مختصر تعارف بھی کرانا مقصود ہے۔

14.2 تمہید

ہندوستان میں ہمیشہ سے مختلف مذہبوں کے لوگ دور دراز علاقوں سے آتے رہے ہیں۔ عرب اور ایرانی قبائل کا ہندوستان سے تعلق تاریخ کے قدیم دور سے رہا ہے۔ عرب قبائل کے ذریعہ اسلام کی آمد برصغیر میں ہوئی ہے۔ ترکستان اور افغانستان کے مسلمانوں سے بھی

ہندوستان میں اسلامی تعلیم، فارسی و عربی زبانیں اور ان کی تہذیب، تمدن اور ثقافت کی اشاعت ہوئی۔ اسلامی تعلیم کے دروازے ہندوستان کے سبھی لوگوں کے لیے کھلے رہے۔ اور اعلیٰ تعلیم کے مختلف ذرائع سے استفادہ مسلمان اور غیر مسلمان سبھوں نے کیا۔

14.3 ہندوستان اور اس کے باشندے

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ ہمالیہ کے پہاڑوں کے سلسلہ کے ذریعہ ایشیا کے باقی حصوں سے وہ الگ تھلگ ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کو چار خطوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ جو شمال میں مشرق سے مغرب تک ایک لمبی اور اونچی دیوار کی طرح کھڑا ہے۔ ایک روشن دن میں یہ ایک پہاڑ نہیں بلکہ آسمان سے لٹک رہی ایک سفید دیوار کی طرح لگتا ہے۔
2. گنگا کا چورس میدان جو سب سے زرخیز علاقہ ہے۔
3. صحرائے عظیم کا علاقہ۔
4. جنوب کا سطح مرتفع جو برصغیر کا سب سے قدیم ارضیاتی حصہ ہے۔

اس کی جنوب مغربی اور جنوب مشرقی سرحد ساحلی علاقہ پر مشتمل ہے۔ اور شمال میں مشرق سے مغرب تک ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ ہندوستان کی ساحلی سرحد ہمیشہ سمندری مسافروں کے لیے کھلی رہی ہے۔ سویز کنال (Suez Canal) کے افتتاح (1869ء) کے بعد سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان کا فاصلہ 7,000 کیلومیٹر کم ہوگیا۔

شمال میں بھی ہمالیہ میں درے موجود ہیں جہاں سے ایشیا اور یورپ کے مختلف قبائل یہاں آتے رہتے ہیں۔ برصغیر کے دروں میں سے ایک "درۂ خیبر" (Khybar Pass) کو بڑی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

ہندوستان میں ہمیشہ سے مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ دور دراز کے علاقوں سے آتے رہے ہیں۔ متعدد ماہرین اسکالرس نے ہندوستان میں بسنے والے باشندوں کے نسلی اور ثقافتی حالات پر تفصیل سے ریسرچ کا کام کیا ہے۔ حسب ذیل ڈاکٹر بیراجا سنکر گوہا (1894-1961ء) کا مشہور مقالہ "Racial Elements in the Population" کے مطابق ہندوستان کی خاص نسلیں درج ہیں:

1.	نگریٹو	Negrito
2.	پروٹو اسٹرولوید	Proto Austroloid
3.	منگولوید	Mongoloid
4.	میڈیٹرینین	Mediterranean
5.	چوڑے سر والے لوگ	Western Brachycephals
6.	نورڈک	Nordic Race

ہندوستان کی آبادی عظیم الشان ہے' اور دنیا کی اہم نسلوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں سدا سے بہت سارے مذاہب' زبان' تہذیب' رنگ اور نسل کے لوگ آتے گئے۔ اس وجہ سے ہندوستان کو نسلوں کا میوزیم کہا جاتا ہے۔

گزشتہ صدیوں کے دوران ملک کی تمام نسلیں Inter Marriages کی وجہ سے ایک دوسرے سے مخلوط ہو گئیں۔ لہذا حقیقی معنوں میں ان نسلوں کو صحیح طور پر علحدہ کرنا ممکن نہیں اور یہی وجہ سے اس ملک کو نسلوں کے پگھلنے کا برتن (Melting Pot of Races) بھی کہا جاتا ہے۔

ان سب نسلوں کی تفصیل لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی ثقافت' تمدن اور تہذیب بہت سارے فرقوں' ذاتوں' نسلوں اور مذہب کے ماننے والوں کی مشترکہ وراثت ہے جس میں سبھوں کا اہم حصہ رہا ہے۔

14.4 ہندوستان میں اسلام کی آمد

ابتدا میں عرب قبائل ہندوستان کے جنوب مغربی علاقوں میں' عہد رسالت سے قبل آباد ہوتے چلے گئے اور ان کے سواحل ہند و ملا بار کے مقامی لوگوں کے ساتھ اچھے تجارتی معاشی اور سماجی تعلقات تھے۔ ہندو حکمراں ان کے ساتھ رواداری سے پیش آتے رہے۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی جب صحرائے عرب میں رسالت محمدی ﷺ کا نور پھیلا۔ اور جہاں جہاں مسلمان عرب تاجروں کی آمد و رفت ہوتی رہی وہاں کے مقامی لوگوں کو اسلام سے تعارف ہونے لگا۔ اور اسلام ایک جانا پہچانا مذہب بن گیا۔ عرب مسلمانوں نے خلافت کی توسیع کے دوران ہی برصغیر پر پہلی مرتبہ قدم رکھا۔ سیاسی استحکام سندھ سے شروع ہوا' بالخصوص خلفائے بنی امیہ کے ولید بن عبدالملک کے دور میں' بنی امیہ کے زوال کے بعد 750ء میں سندھ خلافت عباسیہ کا ایک صوبہ بن گیا اور اسلامی ثقافت و تمدن کا اثر سندھ کے لوگوں میں نظر آنے لگا۔

عرب قبائل کا ہندوستان سے تجارتی اور سماجی تعلق تاریخ کے نامعلوم دور سے رہا ہے لیکن عرب اور ہندوستان کا سیاسی تعلق مسلمانوں کے سندھ میں قدم رکھنے کے بعد قائم ہوا۔ اس کے بعد افغانستان' ترکستان اور دوسرے مغربی ایشیائی ممالک کے لوگوں سے بھی ہندوستانی سماج قریب آیا۔

اس ملک میں عربی' ایرانی' افغانی اور ترکی بولنے والے اپنے ساتھ اپنا ثقافتی اور اسلامی ورثہ بھی ساتھ لائے۔ ان قبائل نے اس ملک کو اپنا وطن سمجھا اور پھر یہیں اپنے مکان بنا کر آباد ہو گئے۔ سبھوں نے اس ملک میں اپنے مختلف نقوش چھوڑے ہیں۔

اس طرح مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کو تین واضح مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔:

1. جنوبی ہند کے ساحلوں پر عرب اور ایرانی لوگ بطور تجار اور مبلغین پہنچے۔
2. بنی امیہ کی فتوحات کے دور میں آئے۔
3. ایشیا کے ترکوں اور افغانوں کی فتوحات و ہجرت کی تحریک کے سلسلہ میں ہندوستان پہنچے۔

عرب تاریخ، جس کا اہم مصدر'' دور جہالت'' کی شاعری ہے' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت ﷺ سے پچھلے عربوں کو ہندوستان کے بارے میں کچھ حد تک معلومات تھیں۔ عرب کے شعر جاہلی میں'' ہندی''، '' مہند'' (یہ دونوں نام ہندی تلوار کے لیے استعمال کیے گئے ہیں' جو اہل عرب میں بہت مشہور تھے) '' قسط'' '' قُطر'' (ہندوستانی بخور کے نام) اور دوسرے کئی الفاظ ملتے ہیں۔

رسول اللہ کی احادیث اور اشعار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ بھی ہندوستان اور وہاں کے باشندوں سے واقف تھے۔

14.5 فارسی تمدن اور ثقافت کا ہندوستان پر اثر

ہندوستان اور فارس کے تعلقات 500 قبل عیسوی سے قائم رہے ہیں۔ فارس کا حملہ سندھ سے شروع ہوا اور فارسیوں کی حکومت اس علاقہ پر 325 قبل عیسوی تک رہی۔ موریں حکومت (Maurya Empire) 185-322 قبل عیسوی کے دوران فارسیوں کا ہندوستان پر بڑا اثر رہا' خاص طور پر آرٹ اور فن تعمیر میں' یہ اس دور کی کچھ باقی عمارتوں اور دیگر قدیم آثار سے واضح ہوتا ہے۔

یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان کے لوگوں کو فارسی سے جو شغف ہوا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سنسکرت اور قدیم فارسی (Proto-Iranian) ایک ہی (Indo-Europian) نسل کی زبانیں تھیں۔ فارسی تہذیب' تمدن اور ثقافت (جو کہ ساتویں صدی سے اسلامی رنگ لے چکی تھی) کا اثر شمالی ہندوستان میں غزنوی دور سے شروع ہوا۔ اور ہندوستان میں فارسی زبان کا اچھا خاصا چرچا ہوگیا۔ بس یہاں سے صدیوں تک فارسی زبان اور ثقافت کا ہندوستانیوں پر گہرا اثر رہا۔ فارسی زبان ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد کا ایک محکم ذریعہ بنی رہی۔ دھیرے دھیرے ہندوؤں میں ایک فارسی داں طبقہ پیدا ہوگیا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ فارسی تعلیم کے پھیلانے کی پہلی موثر کوشش سکندر لودھی کے عہد میں ہوئی۔ اس بادشاہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو تصنیفات کا بڑا شوق تھا۔ وہ علم کی مختلف شاخوں میں کتابیں علماء سے تصنیف کراتا۔ ہندو مذہب اور ہندوستان میں طب کی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کراتا تھا۔

مورخ محمد ذکاءاللہ (تاریخ ہندوستان' جلد 2 صفحہ 379) اس کے کارنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تھوڑے ہی دنوں میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے علوم سے ایسی آگاہی ہوگئی کہ وہ ان علوم کا درس دینے لگے''

دوسری طرف مورخین کے ایک اور گروپ کا کہنا ہے کہ مغلوں سے پہلے کی تاریخ میں جو فارسی تعلیم کے حالات ملتے ہیں ہندوؤں میں یہ مستثنیات ہیں۔ اور ہندوؤں نے بحیثیت مجموعی مغلوں سے پہلے فارسی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کافی پہلے ہی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین معاشرتی اور مذہبی میدانوں میں بڑی حد تک اختلاط پیدا ہوگیا تھا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے چند اہم عوامل کو پیش کیا ہے جن کے سلبی اثرات فارسی زبان کی رفتار پر پڑے جو حسب ذیل ہیں:

1. اسلامی حکومت کی ابتدا سے مالگزاری کا محکمہ ہندوؤں کے ذمہ تھا جس کی زبان ہندی تھی۔ اس طرح فارسی تعلیم حاصل کیے بغیر ہندوؤں کو ملازمتیں مل جاتی تھیں۔ دیکھا گیا کہ جب راجہ ٹوڈر مل (جو اکبر کے وزیر خزانہ تھے) نے ہندی کی جگہ فارسی کو دفتری زبان بنا کر اس کو حصول ملازمت کے لیے ضروری قرار دیا تو ہندو حضرات تھوڑی ہی مدت میں اس زبان کے اچھے خاصے ماہر بن گئے۔

2. مسلمانوں نے ہندوستان میں لوگوں پر اپنے علوم یا زبان کو بالجبر ٹھونسنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اسلامی حکومت کی جانب سے بھی ہندوؤں میں تعلیم عام کرنے کی کوئی جدوجہد عمل میں نہیں آئی۔

3. ہندوؤں کے اعلیٰ طبقات بھی علیحدگی پسند اور قدامت پرست تھے۔ اور بقول علامہ البیرونی یہ اجنبیوں کے ساتھ روابط و تعلقات قائم کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔

4. بارہویں صدی عیسوی تک کا زمانہ مذہب اور تصوف کی تحریکوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کے مسلمان مصلحین اور صوفیوں نے فارسی یا عربی کے بجائے عوام کی بولیوں کو اختیار کیا۔ اس عہد میں ہندی کے بڑے بڑے مصنف مسلمان ہی تھے۔ ہندی کے اس رواج عام نے اس عہد میں فارسی اور عربی کے قبول عام کو نقصان پہنچایا۔

5. افغانوں اور بیجاپور کے حکمرانوں کے عہد میں ہندی کی سرپرستی رہی۔ ان میں سے کئی حکمرانوں نے فارسی کو ہٹا کر ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا۔

14.6 عہد اسلامی میں تعلیمی نظام کا قیام

اسلام کی ابتدا ہی علم اور معرفت سے ہوئی ہے۔ ''طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر: 224) علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے۔ مختلف ادوار کی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان جہاں کہیں سکونت پذیر رہے تو نماز گاہ کی تعمیر، تعلیمی نظام کے احیاء اور علم کی اشاعت کو انہوں نے ضروری سمجھا۔ یہ بات تو معروف ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ساتویں صدی عیسوی کے ابتداء میں عرب مسلمان تجار نے جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں بالخصوص مالابار میں قدم رکھا۔ پھر آٹھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں سندھ میں عربوں کے ادارہ کے قیام کے بعد یہ سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس کے تقریباً تین سو برس بعد جب شمالی ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس تعلیمی نظام کی توسیع و ترقی کے مزید مواقع فراہم ہوئے۔ آنے والے ادوار میں مسلمان حکمرانوں کی معارف پروری اور علماء کی دلچسپی و لگن کا اس نظام کو مستحکم بنانے میں بہت اہم کردار رہا ہے۔

سلطان محمود غزنوی فن حرب کے ماہر اور عظیم منتظم ہونے کے علاوہ علم و فن کے محب اور اہل علم کے قدرداں اور مربی بھی تھے۔ ابو ریحان البیرونی (المتوفی 1048ء) جیسے مشہور اور ممتاز اسکالر اور ہندوستانیات کے ماہر (Indologist) ان کے مصاحبین میں سے تھے۔ مورخین کے بیان کے مطابق قنوج کی فتح کے بعد غزنی واپسی پر سلطان محمود نے (تقریباً 410ھ میں) ایک مسجد و مدرسہ کی بنیاد رکھی اور اس میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں سلطنت کے مختلف حصوں سے قیمتی کتابیں مختلف زبانوں کی جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ مدرسہ کے مصارف کے لیے بہت سے دیہات اور مواضع وقف کیے۔ سلطان محمود کے بھائی امیر نصر نے ایک مدرسہ بنوایا جو سعیدیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

14.7 اعلیٰ تعلیم کے معتمد ذرائع

معلوم ہونا چاہیے کہ عہد وسطیٰ کے دوران ہندوستان میں تعلیم کے سب سے اہم ذرائع مدارس اور تدریس کے انفرادی مراکز تھے۔

درحقیقت سلاطین دہلی کے زمانہ میں کثیر تعداد میں مدرسے شہروں میں وجود میں آئے۔ پھر مغل بادشاہوں کے عہد میں علمی اور تمدنی سرگرمیاں بڑھیں۔قدیم مدارس کی توسیع وترقی کے ساتھ بہت سے نئے مدارس قائم ہوئے۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تعلیم کا اہتمام کئی طریقوں سے ہوا ہے۔ان میں دو طریقے کافی مشہور تھے:

الف) حکمرانوں اور امراء کے قائم کردہ مدارس کے توسط سے۔اس نظم کے تحت مقررہ اوقات، متعینہ نصاب اور مراحل تعلیم کی تقسیم کے ساتھ تعلیم دی جاتی تھی۔

ب) تعلیم کے انفرادی مراکز کے ذریعہ۔ان کے تحت مختلف فنون کے اساتذہ اپنے اپنے مقام پر یا مسجد میں اپنے اختصاصی مضمون پر درس دیتے تھے۔

14.7.1 امراو حکام کے قائم کردہ مدارس

عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع میں عام طور پر سب سے زیادہ معروف واہم ذریعہ مدرسہ کو سمجھا جاتا ہے۔ان مدارس کو خاص اہمیت حاصل تھی، اس کی عمارت ان عمارتوں میں شامل تھی جنہیں ''بقاع خیر'' (مراکز خیر) کہا جاتا تھا۔بعض مصنفین کی رائے یہ ہے کہ ''بقاع خیر'' میں مسجدیں، دینی تعلیم گاہیں وخانقاہیں شامل تھیں۔

عہد وسطیٰ کے چند مشہور اسلامی مدارس کا ذکر:

1. **مدرسہ معزی:** یہ مدرسہ سلطان التمش (1235-1210ء) کے دور میں دہلی میں تعمیر کرایا گیا تھا۔اور یہ سلطان معزالدین محمد بن سام (شہاب الدین غوری) کے نام سے موسوم تھا۔اس مدرسہ کے اساتذہ میں ممتاز عالم مولانا بدرالدین اسحاق خویش وخلیفہ خواجہ فریدالدین گنج شکر بھی شامل تھے۔بعض اسکالرس نے مدرسہ معزی کا قیام سلطان قطب الدین ایبک کے زمانہ سے منسوب کیا ہے۔بعد میں سلطانہ رضیہ (1239-1236ء) کے عہد میں دہلی کے مدرسہ معزی نے کافی ترقی کی۔

2. **مدرسہ ناصریہ:** یہ مدرسہ سلطان ناصرالدین محمود (1265-1246ء) نے دہلی میں تعمیر کرایا تھا۔بعض مصنفین کا یہ کہنا ہے کہ ان کے نام پر ہی یہ مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔اتنا تو ضرور ہے کہ سلطانہ رضیہ نے قاضی منہاج السراج کو 735ھ/1238ء میں اس کا ذمہ دار مقرر کیا تھا۔

3. **مدرسہ فیروز شاہی:** یہ مدرسہ سلطان فیروز شاہ تغلق (1383-1351ء) کے دور میں تعمیر کرایا گیا تھا۔یہ پورے طور پر اقامتی ادارہ تھا اور اس کی عمارت دو منزلہ، وسیع وکشادہ تھیں۔مدرسہ فیروز شاہی کے ممتاز اساتذہ میں مولانا جلال الدین رومی (یہ صاحب مثنوی کے علاوہ ہیں) اور مولانا نجم الدین سمرقندی شامل تھے۔ان کے علاوہ بیرونی علماء وفضلاء بھی شامل تھے۔اس کے نصاب میں علوم نقلیہ وعقلیہ دونوں کی درسیات داخل تھیں۔مدرسہ میں متعدد لکچر ہال کے علاوہ طلبہ اور اساتذہ کے لیے علیحدہ علیحدہ رہائش گاہیں بنی ہوئی تھیں۔اس مدرسہ میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب، علم معانی و بلاغت منطق وفلسفہ، علم کلام وتصوف، ہئیت وریاضی، علم نظر، علم طبیعی، علم الٰہیات، علم طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔مدرسہ میں درس وتدریس کے علاوہ بحث ومباحثہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

مدرسہ فیروز شاہی پوری طرح حکومت کے زیر انتظام تھا اور اس کے اخراجات شاہی حکومت کے وسائل سے پورے کیے جاتے تھے۔

مدرسے کی شہرت نے شائقین علم کو ملک کے مختلف حصوں سے راغب کیا اور یہ اس سے مستفیض ہوئے۔ مدرسہ کے فیض سے آس پاس کے علاقوں میں بھی ایسی چہل پہل ہوگئی تھی اور علمی و دینی ماحول پیدا ہوگیا تھا کہ شہر کے مختلف حصوں سے لوگ منتقل ہوکر مدرسہ کے قریب سکونت اختیار کرنا پسند کرنے لگے تھے۔

عہد وسطیٰ میں مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا اور بعد کے دور میں وہ اور وسیع اور مضبوط ہوتا گیا۔ ان مدارس کے ذریعہ جن علوم کی اشاعت ہوئی ان کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اقامتی اداروں کی تاریخ بڑی قدیم رہی ہے

14.7.2 تعلیم کے انفرادی مراکز

اعلیٰ تعلیم کے ذرائع میں تدریس کے انفرادی مراکز کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ معاصر علماء وفضلاء کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات میں مدارس سے تعلیم حاصل کرنے یا ان سے فراغت پانے کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ عام طور پر ان اساتذہ کا ذکر آتا ہے جن سے انھوں نے درسی کتب پڑھیں یا مختلف علوم وفنون حاصل کیے۔ کسی استاد سے حدیث کا درس لینے کا ذکر ملتا ہے تو کسی سے فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کا اور علوم عقلیہ کے باب میں فیض یاب ہونے کا۔ عہد وسطیٰ کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل میں مدارس سے زیادہ اہمیت علماء واساتذہ فنون کے انفرادی مراکز کو حاصل تھی۔ یہ نظام صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عہد وسطیٰ میں مسلم ممالک میں عام طور پر یہی طریقہ معمول بہ تھا۔

اس زمانہ میں تدریسی مشغلہ کو دین کی خدمت اور علم کی اشاعت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور اسی لیے علماء کے حلقہ میں اس کام میں عام طور سے دلچسپی پائی جاتی تھی۔ یہ علماء پورے سکون واطمینان کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ پھر دوسری طرف ایسے بھی علماء تھے جو علمی زندگی میں کسی دوسرے مشغلہ کو اختیار کرنے کے باوجود درس وتدریس کے لیے بھی اپنے اوقات فارغ کر لیتے تھے اور علم کی اشاعت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

ان کے علاوہ اس عہد میں درس وتدریس کے ذریعہ علم کی اشاعت کی روایت اتنی مستحکم تھی کہ بہت سے علمی ذوق رکھنے والے مسلمان اور غیر مسلمان اپنی سرکاری یا دوسری قسم کی مصروفیات کے ساتھ اس کام میں بھی اپنی دلچسپی جاری رکھتے تھے۔

درس اور تدریس کا مشغلہ اختیار کرنے والے یا حکومت کے وظائف وعطایا کے ساتھ اس کام میں مصروف رہنے والے باقاعدہ کسی مدرسہ یا تعلیمی ادارہ کے پابند نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنی سہولت وافادۂ عام کے نقطۂ نظر سے کسی بھی مقام پر یہ خدمت انجام دے سکتے تھے۔ کہیں مسجد یا کسی استاد کا اپنا گھر مدرسہ بن جاتا تو کہیں شاہی دربار یا امراء کی حویلی اور ڈیوڑھی میں پڑھنے پڑھانے کا ماحول شروع ہوجاتا، بعض اوقات خانقاہ یا اس سے متصل کسی عمارت میں بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوجاتا تھا۔

معلومات کی جانچ

1- ہندوستان میں اسلام کی آمد پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

2- فارسی تمدن کے ہندوستان پر کیا اثرات مرتب ہوئے لکھیے۔

3- عہد اسلامی میں تعلیم کے نظام پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیجیے۔

14.8 اعلیٰ تعلیم کے ثانوی ذرائع

اعلیٰ تعلیم کے فروغ یا مطالعہ کے ذوق کو پروان چڑھانے میں مدارس وانفرادی مراکز کے علاوہ اور بھی ذرائع تھے ان کا ذکر یہاں قابل ذکر ہے۔

14.8.1 علمی مجالس

علمی مجالس حکومت کے زیر اہتمام منعقد ہوتی تھیں۔ ان میں سے جو مجلس خاص طور سے کسی اختلافی مسئلہ یا نازک معاملہ میں سربرآوردہ علماء ومشائخ کی رائے جاننے کے لیے منعقد کی جاتی تھیں وہ اس وقت کی اصطلاح میں ''محضر'' کہلاتی تھیں۔ ان سے آزادانہ ماحول میں بحث ومباحثہ ہوتا تھا اور زیر بحث موضوع سے متعلق شرکاء کی علمی وفنی کاوشیں اور ان کے نتائج فکر سامنے آتے تھے۔ ان رسمی علمی مجالس و مذاکرات کے علاوہ علماء میں خود اپنے طور پر مختلف مسائل پر اجتماعی غور وفکر اور مباحثہ کا رواج عام تھا۔

14.8.2 صوفیاء کرام کی مجالس وخانقاہیں

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں غیر رسمی ذرائع میں صوفیاء کرام کی مجالس اور خانقاہوں کا بڑا اہم حصہ تھا۔ ان خانقاہوں میں مخصوص کتابوں کا درس دیا جاتا تھا' یہ کتابیں تصوف' تفسیر' فقہ' حدیث' ادب عربی اور منطق جیسے موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ کبار صوفیہ یا مشائخ کی تذکیری وتربیتی مجالس میں مختلف فنون کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور اہل خانقاہ اور عام شائقین علم ان سے مستفید ہوتے تھے۔ ان مجالس میں بعض اوقات زیر بحث مسئلہ پر قرآنی آیات واحادیث کی تشریح وترجمانی ہوتی تھی' کبھی حاضرین کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے قرآن وحدیث کے حوالہ سے دریافت طلب امور واضح کیے جاتے تھے۔ بعض اوقات ضروری فقہی مسائل بیان کیے جاتے اور حاضرین مجلس کے استفسارات اور ان کے جوابات کا سلسلہ بھی رہتا تھا۔

14.8.3 سائنسی علوم اور عصری تعلیم کی اشاعت کے مراکز

عہد اسلامی کے ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے دینی تعلیم کے ساتھ اس زمانے کے اعتبار سے عصری تعلیم کی اشاعت کی خدمت بھی انجام دی۔ عقلی وسائنسی علوم کے ماہرین کی سرپرستی فرمائی اور بعض علوم بالخصوص ہیئت وطب کے میدان میں تجربہ وتربیت کے مراکز بھی قائم کیے

اس عہد میں جو شفاخانے یا ہسپتال قائم کیے گئے تھے ان میں نہ صرف علاج ومعالجہ کی سہولتیں مہیا تھیں بلکہ وہاں طلبہ کے لیے طب کے مختلف پہلوؤں پر لکچرس وعملی تجربہ کا اہتمام ہوتا تھا۔ تاریخی مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد فیروز شاہی کے مختلف دارالشفاء یا بیمارستان علاج و معالجہ کے علاوہ طب کے میدان میں تعلیم وتربیت کے مرکز کا بھی کام دیتے تھے۔

دوسری طرف جہاں تکنیکی ومیکانکی تعلیم وتربیت اور ان کے مراکز کا تعلق ہے یہاں چند نقطے اصولی طور پر ضروری معلوم ہوتے ہیں:

i- یہ کہ عہد سلطنت میں اس ملک میں کثیر تعداد میں فن کار' دستکار' کاریگر اور اہل حرفت وصنعت موجود تھے۔

ii- شاہی خاندان واہل حکومت کے استعمال میں آنے والی چیزوں کے علاوہ مختلف قسم کے سامان' اوزار اور اسلحہ اس ملک میں تیار ہوتے

تھے۔

iii- مختلف چیزوں کو بنانے وتیار کرنے اور ان سے متعلق فن و ہنر کو سکھانے کے لیے ان کے انفرادی اور گھریلو مراکز کے علاوہ حکومت کی نگرانی میں کام کرنے والے ''کارخانے'' بھی قائم تھے۔

مغل دور میں بادشاہ وامراء کی شاہانہ زندگی میں ترقی اور حکومت کی ضروریات میں اضافہ کے ساتھ کارخانہ کے نظام میں اور بہتری و وسعت آئی'اس کے لیے اکبر کا دور زیادہ مشہور ہے۔

14.8.4 ذاتی مطالعہ وتحقیق

اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مذکورہ ذریعوں کے علاوہ ایک اور چیز جس کا عہد وسطیٰ میں بہت سہارا لیا جاتا تھا وہ ذاتی مطالعہ یا کتابوں سے استفادہ تھا۔اس دور میں مختلف موضوعات پر ضروری واہم کتابوں کی کمی نہ تھی۔علماء اور شائقین علم ایک دوسرے سے کتابیں مستعار لے کر پڑھنے کے علاوہ اہم کتابوں کی تلاش میں دور دراز کا سفر کرنا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔کتابوں کی نقلیں تیار کرنے کی علماء میں عام دلچسپی پائی جاتی تھی۔اس انفرادی تگ ودو کے علاوہ اس زمانہ میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو اس کام کو پیشہ کے طور پر اہم ومعروف کتابوں کی کاپیاں تیار کرکے فروخت کیا کرتا تھا'ان کو''نساخ'' کہا جاتا تھا۔اس دور میں شاہی کتب خانے کافی تعداد میں موجود تھے۔سلاطین وامراء کے علاوہ علماء کے اپنے ذاتی کتب خانے بھی ہوتے تھے۔علوم اسلامیہ کی کتابوں سے قطع نظر اس زمانہ کی تاریخ کی کتابوں میں تفسیر'حدیث'فقہ واصول فقہ کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق قدیم کتابوں کے اقتباسات یا حوالے بھی ملتے ہیں (تاریخ'طب'منطق'فلسفہ وریاضی وغیرہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ ان موضوعات پر اہم کتابیں بآسانی دستیاب تھیں۔اس طرح عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں علم کے کسی بھی میدان میں مہارت پیدا کرنے یا اپنی صلاحیت کو جلا بخشنے کے لیے ذاتی مطالعہ وتحقیق کی راہ بھی اپنائی جاتی تھی۔

14.9 اسلامی علوم وفنون میں غیر مسلموں کی تحریریں اور خدمات

14.9.1 اسلامی تاریخ

1. لب التواریخ : مصنف بندرابن داسی بہادر شاہی
2. خلاصۃ التواریخ : مصنف سبحان رائے کھتری بٹالوی
3. سلطان التواریخ : مہاراجہ رتن سنگھ زخمی۔
4. فتوحات عالمگیری : ایشر داس ناگر
5. تنقیح الاخبار : منولال فلسفی دوسرا نام منولال صفا
6. قسطاس : کندن لال اشکی

7.	مآثر آصفی اور حالات حیدر آباد	:	مصنف لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی
8.	تذکرہ الکاملین	:	مصنف ماسٹر رام چند
9.	تاریخ پرگنات ٹونک	:	پنڈت رام کرن جوشی
10.	چہار چمن	:	مصنف چندر بھان برہمن
11.	احسن التواریخ	:	مصنف منشی رام سہائے تمنا لکھنوی
12.	بدائع وقائع مرآۃ الاصطلاح	:	مصنف آنند رام مخلص
13.	امیر نامہ	:	مصنف منشی بساون لال شاداں
14	اکبر بادشاہ	:	مصنف منشی دیبی پرشاد بشاش

14.9.2 سیرت نبوی

آنحضور ﷺ کی شخصیت اور آپ کی تعلیمات پر ہندو اسکالرس نے بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس میدان میں ان کی چند تصنیفات حسب ذیل ہیں:

1.	حضرت محمد ﷺ اور اسلام	:	مصنف سندر لال
2.	عرب کا چاند	:	سوامی لکشمن
3.	نراشنس اور آخری رسول ﷺ	:	مصنف پنڈت وید پرکاش اپادھیائے

14.9.3 قرآن کریم کے تراجم

برصغیر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی مختلف زبانوں میں قرآن کے ترجمے موجود ہیں۔ غیر مسلم ہندوستانی علماء کی ایک اچھی خاصی تعداد نے ایمانداری کے ساتھ نہ صرف قرآنی تعلیمات و افکار کو سمجھنے میں دلچسپی ظاہر کی بلکہ اپنے اپنے علمی انداز میں انہوں نے قرآن مجید کی آیتوں کا ترجمہ بھی کیا۔ اس سلسلہ میں اہم ترجموں کا ذکر ذیل میں پیش ہے۔

1.	قرآن شریف۔ تفسیر مجیدی	:	نند کمار اوتھی
2.	ترجمہ	:	ونود چند پانڈے (1994ء میں شائع ہوا)
3.	ترجمہ	:	کنھیا لال لکھداری (1882ء میں شائع ہوا)
4.	ترجمہ	:	وشنداس (سندھ میں شائع ہوا)
5.	بنگالی ترجمہ	:	گریش چندر سین (1881ء میں شائع ہوا)

6. پوتر قرآن درشن : دھن پرکاش (ہندی ترجمہ)

7. ہندی ترجمہ : پنڈت رام چندر دہلوی (1943ء میں شائع ہوا)

8. ہندی ترجمہ : پریم سرن پرنت (1940ء میں شائع ہوا)

9. ہندی ترجمہ : رگھوناتھ پرساد مشرا

10. ہندی ترجمہ : سیتا دیوی جی (1914ء میں شائع ہوا)

11. سنسکرت ترجمہ : سیتا دیو ورما (1990ء میں شائع ہوا)

12. تلگو ترجمہ : ڈاکٹر چلوکوری نرائن راؤ (1930ء میں مکمل ہوا)

13. تلگو ترجمہ : رمیش لاکیش واراؤ (1974ء میں شائع ہوا)

14. تلگو ترجمہ : ونیکاتا (یہ اب نایاب ہے)

15. ملیالم ترجمہ : سن۔ن۔کرشنان راؤ (یہ بھی نایاب ہے)

16. ملیالم ترجمہ : کونیور رکھون نیر

14.9.4 تصوف

1. مجمع البحرین : مصنف پنڈت درگا پرشاد عاجز بھرتپوری (1876ء میں یہ کتاب شائع ہوئی)

2. بادۂ عرفان : مصنف آنند کمار عرفانی سرور (یہ کتاب 1969ء میں شائع ہوئی)

3. بوستان معرفت : مصنف بابو مادھو داس

4. رہنمائے دیدار حق : مصنف ہری سنگھ گورکھ (یہ کتاب 1935ء میں شائع ہوئی)

5. عرفان حافظ : مصنف چرن داس شرما (1964ء میں شائع ہوا)

6. بابا فرید حالات زندگی اور تعلیمات: مصنف گربجن سنگھ (1973ء میں شائع ہوا)

7. نغمۂ سرمد مترجمہ عرش ملسیانی : یونین پرنٹنگ پریس، دہلی

8. نغمہ درویش : مصنف بگانگ سنگھ درویش (1896ء میں شائع ہوا)

9. تحفۃ الموحدین : مصنف راجا رام موہن رائے۔ یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی اور سنہ 1804 عیسوی میں شائع ہوئی۔

14.9.5 ہندو علماء و مفکرین کی انگریزی زبان میں اہم تصنیفات

1. "The Historical Role of Islam : An Essay on Islamic Culture" :
مصنف مانابندرا ناتھ روئے M.N. Roy۔سن ولادت 1887 عیسوی
2. "Sufis of Sindh" : مصنف موتی لال جتوئی
3. "The Prophet of the East" : مصنف ڈی۔سی۔شرما (یہ کتاب 1935ء میں شائع ہوئی)
4. "Influence of Islam on Indian Culture" : مصنف تاراچند۔یہ کتاب 1922ء میں شائع ہوئی۔
5. "Society & State in the Mughal Period" منصف تاراچند۔یہ تحریر سن 1979ء میں شائع ہوئی۔
6. "Muslim Political Identity" : مصنف ام۔ای۔جین جو اسلام پر لکھنے والے معاصر مؤرخین میں سے ہیں۔
7. "Khuda - Qur'anic Philosophy" : مصنف آر۔بی۔ہرش چند' 1979ء میں شائع ہوئی۔
8. "Congruencies of Fundamentals in the Quran & the Bhagwat Gita" :مصنف موکندن۔
سمکلین پراکاش'نیو دہلی 1990ء
9. "The Essence of Qur'an" :مصنف ونوبا بھاوے۔اکھل بھارت سیوا سنگھ' 1962ء
10. "Ethics of the Qur'an" : مصنف مگنلال اے۔بوچ۔یہ کتاب 1977ء میں شائع ہوئی۔

14.9.6 نعت گو ہندو شعراء

مسلمان شاعروں کی طرح ہندو شاعروں نے آپ ﷺ کی سیرت و نعت میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔کچھ مشہور ہندو نعت گو شعراء کے نام اس طرح ہیں:

1. منشی شنکر لال ساقی
2. منشی بلا سہائے متصدی
3. پنڈت شیو ناتھ چک کیف
4. منشی لچھمی نرائن سخا
5. چاند بہاری لال ماتھر صبا
6. منشی للتا پرشاد شاد
7. پربھو دیال رقم
8. پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی
9. تربھون شنکر عارف
10. شیو پرشاد وہبی لکھنوی
11. مہاراجہ سرکشن پرشاد
12. دلو رام کوثری
13. پنڈت بالمکند عرشی
14. کنور مہندر سنگھ بیدی
15. مہر لال سونی ضیا
16. ساحر ہوشیار پوری
17. منشی روپ چند
18. ہرگوپال تفتہ
19. پیارے لال رونق
20. چندی پرشاد شیدا
21. دوارکا پرشاد وقف
22. مہاراج بہادر برق
23. منوہر لعل بہار
24. راجہ لعل راجہ پردیسی

25. پنڈت ہری چند اختر
26. تلوک چند محروم
27. امر چند قیس
28. فراق گورکھپوری
29. جگن ناتھ آزاد

معلومات کی جانچ

1- اسلامی علوم وفنون میں غیر مسلموں کی تصنیفی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2- ہندوستان میں مسلم عہد حکومت میں اعلیٰ تعلیم کے ثانوی ذرائع کیا تھے لکھیے۔

3- ہندو علما کی اسلام پر انگریزی زبان میں تصنیف کردہ اہم کتابوں کے بارے میں اپنی معلومات لکھیے۔

14.10 خلاصہ

اوپر کے مباحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا صرف ایک ذریعہ (مدرسہ) نہ تھا۔ بلکہ اس کے مختلف ذرائع تھے جن میں سب سے زیادہ اہمیت انفرادی مراکز کو حاصل تھی۔ یہ مراکز عام طور پر کسی نہ کسی خاص مضمون میں درس کے لیے معروف ہوتے تھے۔شاذ و نادر ہی ایسی کوئی مثال ملے گی کہ کسی ایک مدرسہ یا انفرادی مرکز سے مستفید ہوکر کوئی شخص مختلف علوم وفنون یا علوم نقلیہ وعقلیہ کا ماہر بن گیا ہو بلکہ تعلیم کے مختلف ذرائع اختیار کرنے کے بعد ہی یہ جامعیت نصیب ہوتی تھی۔ یہ واضح ہو کہ عہد وسطیٰ کے تعلیمی نظام میں مراحل کی واضح تقسیم، درجات کی حد بندی اور مدت تعلیم کا تعین مفقود نظر آتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ درس وتدریس کے لیے کوئی باقاعدہ نصاب متعین نہیں کیا جاسکتا تھا، بلکہ درس وتدریس کے لیے ہر مضمون سے متعلق کچھ کتابیں منتخب کی جاتی تھیں۔ انفرادی مراکز میں اساتذۂ فنون اپنی دلچسپی کے خاص مضمون میں درس دیتے تھے اور طلبہ و شائقین علم اپنی دلچسپی و رجحانات کے مطابق ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ ایک میدان میں امتیاز پانے کے بعد طالب علم کی دوسرے میدان میں محنت شروع ہوجاتی تھی۔ موجودہ دور میں دینی علوم وعصری علوم کی تعلیم کے نظام میں جو بُعد پیدا ہوگیا ہے یہ عہد وسطیٰ میں نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ ایک ہی نظام کے تحت مختلف علوم وفنون کی تعلیم کا اہتمام کرنا یا علوم عقلیہ ونقلیہ دونوں سلسلوں کو ایک ساتھ جاری رکھنا آسان تھا۔

مسلمان اس ملک میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے علمی خزانوں کے دروازے اہل ملک کے لیے کھلے چھوڑ دیے۔ اور ان زبانوں کی تعلیم عام کردی تھی۔ چنانچہ اس دور میں ہندو حضرات ان زبانوں میں ماہر نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں نے اسلامی تعلیم کے دروازے بھی اہل ملک کے لیے کھلے چھوڑ رکھے تھے اور اسلامی علوم کی تعلیم کی اجازت پورے ملک میں عام کردی تھی۔ اسلامی علوم وفنون کو ملکی زبان میں تحریر کرانے کا کام شروع ہوا۔ قرآن پاک اور احادیث نبویہ کے مختلف ملکی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ ترجمہ کے اس کام میں ہندو اسکالرس نے کافی حصہ لیا۔

اس طرح اسلامی ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا میدان سبھی مذاہب کے لوگوں کے لیے قابل رسائی تھا۔ صراحت کے ساتھ یہ تفصیل نہیں ملتی کہ اعلیٰ تعلیم کے مختلف ذرائع سے ہندوؤں نے کتنا استفادہ کیا۔ البتہ ہر شخص کی کتابیں اور تحریریں اس کی تعلیمی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں

اوراس سے اس شخص کے تعلیمی رجحانات اور فکری میلانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسی لیے اگر ہندوؤں کی مختلف تصنیفات کو ان کی اسلامی تمدنی و ثقافتی ترقی اور علمی میلانات کا بیرومیٹر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ واقع یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم دور حکومت میں ''ہندوؤں میں اسلامی تعلیم کا اثر'' پر کوئی مبسوط و مفصل تصنیف سامنے نہیں آسکی ہے۔ اور اس کی اصل وجہ اس موضوع پر مواد کی قلت اور معاصر تاریخی مآخذ میں متعلقہ معلومات کی کمیابی ہے۔ جو کچھ معلومات معاصر تاریخی کتب میں اس موضوع پر ملتی ہیں وہ خاص کر برہمن طبقہ کے اسلامی حکومت میں درباری ہندو یا ہندو مصنفین سے تعلق رکھتی ہیں۔ عام ہندوؤں میں اسلام کے مطالعہ کی بابت بہت کم مواد ملتا ہے اور جو ملتا ہے وہ بھی بکھرا ہوا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اس عہد میں لسانیات (خاص طور پر فارسی، اردو، عربی) اور اسلامی تعلیم کے میدان میں دلچسپی لینے والے ہندوؤں کی بھی کمی نہ تھی۔ یہ ان علوم میں حصول مہارت کے لیے اساتذہ سے استفادہ کے علاوہ ذاتی مطالعہ، تجربہ و مشق کی راہیں بھی اپناتے تھے۔

مشہور مورخ عبدالقادر بدیوانی (متوفی 1615ء) نے ایک برہمن ہندو شاعر کا ذکر کیا ہے (پنڈت ٹوڈرمل) جو سلطنت کے عہد میں فارسی، عربی کتابوں کا درس دیا کرتا تھا اور فارسی زبان میں شعر کہا کرتا تھا۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مشہور اور مرجع عوام سادھوؤں اور سنتوں کے فرمودات اور مذہبی دعاؤں اور مناجاتوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت سی ایسی تعلیمات مل جاتی ہیں جو اسلام سے متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ پروفیسر شیث اسماعیل اعظمی کا ماننا ہے کہ نویں صدی کے بعد سے جنوبی ہند کے افکار میں بعض خصوصیات ملتی ہیں جو اسلامی اثرات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں اس عہد کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک عام ہندو بیوہ فارسی زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ اس واقعہ کو اگر درست سمجھا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ فارسی زبان کو اس عہد میں عام ہندو مردوں کے علاوہ ہندو عورتیں بھی سمجھ اور بول سکتی تھیں۔

14.11 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. فارسی تمدن اور ثقافت کے ہندوستان پر اثر کا جائزہ لیجیے۔
2. عہد اسلامی میں اعلیٰ تعلیم کے معتمد ذرائع تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
3. عہد اسلامی میں اعلیٰ تعلیم کے ثانوی ذرائع پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے

4. عہد وسطیٰ کے چند مشہور اسلامی مدارس پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. اعلیٰ تعلیم کے ذرائع میں سے ذاتی مطالعہ و تحقیق پر روشنی ڈالیے۔
6. ہندوستان کے باشندوں پر ایک مضمون لکھیے۔

14.13 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں : ظفر الاسلام اصلاحی
2. مسلم ثقافت کے اثرات : ڈاکٹر سید اسد علی
3. ہندو پاک میں اسلامی کلچر : پروفیسر عزیم احمد (ترجمہ جمیل جالبی)
4. ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ : ڈاکٹر سید محمد عبداللہ
5. ہندوستانی سماج: ساخت اور تبدیلی : ضیاء الدین احمد
6. دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات : پروفیسر شیث محمد اسماعیل اعظمی

***

اکائی 15 : قرآن کریم کے غیر مسلم مترجمین، غیر مسلم نعت گو شعراء

اسلامی موضوعات پر لکھنے والے غیر مسلم مصنفین

اکائی کے اجزاء

15.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ طلبہ کو اسلامی علوم وفنون کی دیگر شاخوں میں غیر مسلموں کی کی گئی تحریری کاوشوں سے آگاہ کرایا جائے' نیز ہندوؤں میں جن حضرات نے اسلامی علوم میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے ان پر روشنی ڈالی جائے۔

15.2 تمہید

غیر مسلم ہندوستانی علماء ومفکرین کی ایک بڑی تعداد نے اسلامی مذہب اور اس کے پیغمبر او رکتاب کو نہ صرف عزت کی نگاہ سے دیکھا بلکہ انہوں نے اسلامی تعلیمات وافکار کو سمجھنے میں دلچسپی کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ ان میں سے بہت سوں نے اسلامی علوم وفنون سے متعلق منصفانہ اور غیر جانبدارانہ کام کیا۔ ذیل میں ان علماء' مفکرین وشعراء کی چند اہم اور مشہور تحریروں پر گفتگو کی جارہی ہے۔

15.3 قرآن کریم کے غیر مسلم مترجمین

عالم اسلامی کا غالب حصہ غیر عرب اقوام سے مل کر بنتا ہے جن کی زبان عربی نہیں ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے انہیں کسی نہ کسی تعلق سے ترجمہ کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔ ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے حکمرانوں اور عوام دونوں نے قرآن کو سمجھنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلا کام پنجاب وسندھ کے راجہ مہروک بن رائق نے 883 عیسوی میں سورہ یٰسین تک ایک عالم سے ترجمہ کروایا۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے قرآن کے پڑھنے اور اس پر کام کرنے میں دلچسپی لی۔ ان میں مترجمین و مصنفین دونوں شامل ہیں۔ ہمارا مطالعہ صرف غیر مسلم علماء و مفکرین کی قرآن خدمات اور تراجم تک محدود ہے۔ اس مضمون کے بارے میں بیشتر معلومات جناب وزیر حسن کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان مختلف زبانوں کے مترجمین میں سے زیادہ تر عربی زبان سے بخوبی واقف نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے انگریزی یا اردو سے ترجمہ کیا۔ دراصل قرآن کا عربی زبان سے گہرا تعلق ہے۔ بغیر معرفت زبان کے صحیح ترجمانی مشکل ہے۔ مگر اس کے باوجود ان ہندو اسکالرز نے پوری کوشش کی ہے کہ صحیح معنی تک رسائی ہو سکے اور مناسب متبادل لفظ پوری احتیاط کے ساتھ تلاش کیا جا سکے۔

15.3.1 ونئے کمار اوستھی

ان کے ترجمہ کا نام ہے "قران شریف۔ تفسیر مجیدی" جیسا کہ عنوان سے واضح ہے یہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر کو شامل ہے۔ یہ 1983ء میں مطبع رانی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔

ترجمہ کی ابتداء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ ہے۔ جسے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں تحریر کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس مقدمہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی کاوش کو کافی سراہا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ مولانا دریابادی کا یہ کام قرآنی فکر کا ایک آئینہ اور سنی اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کو سمجھنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ان کے مطابق اس کی وجوہات یہ ہیں کہ مولانا نے نہ صرف پرائمری عربی تفاسیر کی طرح رجوع کیا ہے بلکہ قرآنی فکر کی وضاحت میں جدید علوم و ماڈرن سائنسز جیسے جغرافیہ، تاریخ، ثقافت، مذہب اور فلسفہ کا کافی حوالہ دیا ہے۔ مولانا صاحب نے مستشرقین کی غلط فہمیوں کی وضاحت بھی کی ہے۔

مقدمہ کے اختتام پر مولانا ابوالحسن ندوی نے ونئے کمار اوستھی کے ذریعہ کی گئی مولانا دریابادی کی قرآنی تفسیر کے ہندی ترجمہ کی کوشش کو کافی سراہا ہے اور اس پر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے۔ جناب ونئے کمار اوستھی مولانا دریابادی کی تفسیر سے کافی حد تک متاثر تھے۔ انہوں نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اسے ہندی میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

15.3.1.1 اس ترجمہ کی اہم خصوصیات

1. قرآنی نصوص کو عربی زبان میں بھی باقی رکھا گیا۔
2. قرآنی نصوص کے دیوناگری تلفظ کو جگہ ملی کہ پڑھنے میں آسانی ہو سکے۔

3. قرآنی نصوص کے پڑھنے کے قواعد واشارات بیان کیے گئے تاکہ ہندی خواں قاری اسے بہ آسانی صحیح انداز سے پڑھ سکے۔

4. موضوعات اور سورتوں کی ایک فرہنگ تیار کی گئی ہے۔

5. عربی زبان کے مختصر قواعد بیان کیے گئے ہیں۔

6. اس کی زبان آسان اور عام ہندی خواں قاری کے لیے قابل فہم ہے۔

ترجمہ نگاری کی یہ ایک انمول کوشش ہے۔ یہ ترجمہ ہر معنی میں مکمل ہے اور علماء کا کہنا ہے کہ کوئی ترجمہ اس اہتمام احتیاط اور انداز سے اب تک نہیں آیا ہے۔

15.3.2 پریم سرن پرنت

ان کا قرآن کا ہندی زبان میں ترجمہ ہے۔ اس کے صرف دو اجزاء پہلا اور تیسرا' کاشی آریا سماج لائبریری' بنارس میں موجود ہیں۔ ترجمہ سورہ الانعام کے آخری تک ہی ہے۔ اس کے علاوہ لائبریریوں میں کچھ مزید نہیں نظر آتا ہے۔ موجودہ حصوں میں سنہ اشاعت مذکور نہیں لیکن جناب وزیر حسن کی رائے کے مطابق یہ 1940 میں شائع ہوا۔

مترجم نے پہلے جزء کے مقدمہ میں یہ لکھا ہے کہ یہ ترجمہ مہاتما گاندھی کے افکار سے متاثر ہو کر سوامی برہمانند سرسوتی کے حکم پر تیار کیا گیا ہے۔ اس کا اصل مقصد ہندوؤں کے درمیان قرآنی تعلیمات سے واقفیت پیدا کرنا ہے۔ مترجم نے رواں ہندی زبان میں قرآن کا ترجمہ عام ہندوؤں کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ ہر ایک قرآن کے افکار سے ایک حد تک واقف ہو سکے۔

15.3.2.1 ترجمہ کی اہم خصوصیات

1. ترجمہ کی ابتداء سے قبل حرکات' تلفظ اور تجویدی اصول کو بتایا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ایسا قاری جو عربی سے نابلد ہو قرآنی آیات کو صحیح طور سے پڑھ سکے۔

2. ترجمہ قرآن کی تقسیم' منزل اور پارہ کے حساب سے کی گئی ہے۔

3. پہلے قرآنی آیات کو دیوناگری رسم الخط میں تحریر کیا گیا ہے پھر ان کا ترجمہ تحریر کیا گیا ہے۔

4. ترجمہ کی زبان رواں اور بامحاورہ ہے۔

5. تقریباً ہر صفحہ پر حاشیہ دیا گیا ہے جو مشکل الفاظ اور علمی اصطلاحات کی توضیح کرتا ہے' لیکن ان حواشی کے مصادر و مراجع کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے

15.3.3 چلوکوری نرائن راؤ

ڈاکٹر چلوکوری نرائن راؤ نے قرآن کا تلگو زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ سنہ 1915 عیسوی میں شروع کیا گیا اور 1930 عیسوی میں مکمل ہوا۔ مقدمہ میں انہوں نے اپنے کام سے متعلق پوری معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1930 عیسوی میں شائع ہوا اور اسی سال اس کے

تمام نسخے ختم ہوگئے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1938 عیسوی میں عوام کی درخواست پر دوبارہ شائع ہوا۔ انہوں نے یہ کام تنہا نہیں کیا بلکہ ان مسلمانوں کی بھی مدد لی جو عربی زبان اور احادیث نبوی سے واقف تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میں نے دو مولویوں کا انتخاب کیا جو عربی زبان کا اچھا علم رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآن کا عربی نسخہ لیا اور میں نے حوالہ کے لیے انگریزی ترجمہ سامنے رکھا۔ ہر جگہ میں ان علماء سے مباحثہ کرتا۔ اس پورے کام میں میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے عبارت کا اصلی معنی لوں۔ اختتام کے بعد میں نے مترجم نسخہ کو اپنے ان مسلمان دوستوں کے سامنے پیش کیا جو احادیث سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے ضروری مقامات پر اصلاح کی۔ اس طرح میں نے تلگو ترجمہ' قرآن کی نشر واشاعت کی جرأت کی''۔

مترجم نے اپنی اس تقصیر کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں روح معنی کا انتقال مشکل ہے۔ عربی کا اسلوب تلگو سے ذرا مختلف ہے اور کبھی کبھی تلگو کے الفاظ عربی کلمات کی روح کو نہیں بتا پاتے۔ اس طرح کے حالات میں تلگو زبان کے قریب تر الفاظ لیے گئے ہیں جو اصلی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عربی زبان کے متعلق انہوں نے فرمایا ''یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اجنبی زبان میں ترجمہ کے وقت اس کا رنگ جاتا رہتا ہے۔ ہمیں صرف اس کی روح سے تعلق ہے جو اگر صحیح طور پر سمجھی جا سکی تو یہ اس دنیا میں انسانیت کے پر امن بقاء کے لیے کافی ہے۔''

15.3.3.1 ترجمہ کی چند اہم خصوصیات

1. اس میں پورے قرآن کا تلگو زبان میں آیت بعد آیت ترجمہ کیا گیا۔
2. اس کے شروع میں تعارفی کلمات ہے جو کافی معلوماتی اور دلچسپ ہے۔

   مقدمہ کے کل تین ابواب ہیں:

   i) عرب جاہلیت' تاریخ وعادات
   ii) سیرت محمد ﷺ
   iii) اسلام
3. آخری باب میں مترجم نے عربی جملوں کو تلگو رسم الخط میں لکھا ہے اور اس ہی میں انہوں نے تلگو میں اسلامی عقیدہ اور عادات کی وضاحت کی ہے۔
4. پہلے ایڈیشن کی بہ نسبت دوسرے ایڈیشن کی تلگو زبان زیادہ صاف ہے۔ اور مطبعی یا ترجمہ کی غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

15.3.4 ستیا دیو ورما

انہوں نے یہ قرآن کا سنسکرت زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا نام ہے ''سنسکرتم قرآنم'' یہ لکشمی پبلی کیشن' نئی دہلی سے 1990ء میں شائع ہوا ہے۔ مقدمہ میں ترجمہ نگار نے مختلف مذہبی موضوعات جیسے توحید' صفات الٰہی' عروج دینی' خاتمہ' فجور' عذاب اور تناسخ ارواح کی فہرست

پیش کی ہے۔ان موضوعات کوقرآن اورویدوں میں بیان کیا گیا ہے۔دونوں مذہبی مراجع کا حوالہ دیتے ہوئے ترجمہ نگار نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

خودترجمہ نگار کے قول کے مطابق یہ ترجمہ محمد فاروق خان کے ہندی ترجمہ اور مارماڈیوک پکتھال کے انگریزی ترجمہ پرمبنی ہے۔

15.3.5 کونیورگھون نیر

یہ ملیالم زبان میں قرآن کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ نگار پوری طرح سے یوسف علی کے انگریزی ترجمہ قرآن کی پیروی کرتا ہے۔چونکہ وہ ملیالم اورسنسکرت کا اسکالر ہے۔اسی لیے اس نے شعری انداز میں ترجمہ کیا ہے۔عربی زبان سے اس کی قلت واقفیت اس کام کی قیمت کے لیے ایک روک ہے۔اس وجہ سے اس کے ہاں قرآن کی فصاحت وبلاغت جاتی رہتی ہے۔جابجا مطبعی یاغیر احتیاطی غلطیاں جیسے''البکرۃ'' بجائے ''البقرۃ'' نظر آتی ہیں۔

15.3.6 گریش چندرراسین

یہ جدید بنگالی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ہے۔ترجمہ نگار نے قرآن کا بنگالی زبان میں ترجمہ کرکے تین جلدوں میں 1881-1886ء کے دوران شائع کیا۔ترجمہ میں عربی نصوص کا فقدان ہے۔گریش چندرراسین برہموسماج کے ایک مبلغ تھے۔انھیں کشب چندراسین نے اسلام پرمطالعہ کے لئے منتخب کیا تھا،جنھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اہم مذاہب پرتالیف کا کام کیا جائے۔۔بیالس سال کی عمر میں وہ لکھنؤ گئے۔وہاں انہوں نے عربی اورفارسی کی تعلیم حاصل کی۔بعد میں انہیں ''مولوی گریش'' کے نام سے جانا گیا۔

15.4 قرآن سے متعلق دیگر تصانیف

15.4.1 آر۔بی۔ہرش چندر:

ان کی کتاب کا نام ہے "Khuda-Quranic Philosophy" جو کے 1979 عیسوی میں مطبع پرپہچایا اوورسیز ریٹا پریس،نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ہرش چندر مختلف قرآنی مفاہیم کا خالص فلسفیانہ اسٹڈی پیش کرتے ہیں۔مولف نے ذات الٰہی،روح کی پیدائش،حکمت،علم،توحید،صفات الٰہی وغیرہ مضامین پر،اپنے آزادفکر کی روشنی میں،معائنہ کیا ہے۔اوراپنی تائید میں قرآنی آیات کا حوالہ بھی دیا ہے۔

مولف کی رائے ہے کہ قرآن کے تعلق سے ہرچیز چاہے ذہنی ہو یا روحانی،خدا کا حصہ ہے۔خدا اپنی رحمت سے ارادہ کرتا ہے وہ ایک فعال ذات ہے۔روح سے متعلق ان کا خیال ہے کہ روح کو وجود میں ایک کامل شئے یا مستقل وحدت کے طور پرنہیں لاجاتا بلکہ ہرایک وجود ایک تاریخ اورمیراث رکھتا ہے جواس کی اپنی ہے۔ہرروح کوخدا کے ارادہ سے اختیار وآزادی کا امتیاز حاصل ہے،چند حدود وقیود کے ساتھ،اوریہی امتیاز ایک آدمی کواپنے اعمال کا ذمہ دار قرار کرتا ہے۔ہرش چندر کا خیال ہے کہ روح ہے جوموت کا مزہ چکھتی ہے نہ کہ جسم۔انہوں نے موت کا مطلب ایسا سمجھایا کہ حرکت،شعور،عمل اورخواہش کا رک جانا۔حکمت کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ حکمت [illegible] اپنی ذات کی تعلیم ہے اوراس کی انتہا خودکی معرفت ہے۔

ہرش چندر کا خیال ہے کہ ایک آدمی پیدائش کے وقت مذہبی کائنات کا کوئی حقیقی علم رکھتا ہے نہ ہی خود [illegible] وہ صرف علم حاصل کرنے کی

اہلیت رکھتا ہے جو احساسات کے ذریعہ آتی ہے۔

توحید یا وحدت اللہ کے تعلق سے مصنف کا خیال ہے کہ حقیقت ایک ہے جسے قرآن ''ھو'' (اردو میں ''وہ'') کے نام سے ذکر کرتا ہے۔ اس قسم کی تمام قرآنی آیات ''ھو'' سے شروع ہوتی ہیں۔ جہاں تک اس حقیقت کی معرفت کا تعلق ہے' آدمی ہمیشہ اپنے خیال اور سمجھ کے مطابق اس کا تصور کرتا ہے۔

''رب العالمین'' کی تعریف بیان کرتے ہوئے جناب ہرش چندر کہتے ہیں کہ ''عالم'' کا مطلب وہ جو معلوم ومعروف ہو۔ ''عالمین'' جمع ہے۔ اس کا مفہوم مولف کے پاس کافی وسیع ہے۔ یہ صرف اجرام اور زمینوں کی دنیا کے بارے میں نہیں اشارہ کرتا بلکہ دماغ کی دنیا خود ایک الگ اکائی ہے۔ دراصل ہر وہ شئے جسے انسان کا دماغ پہچانتا ہے وہ ایک دنیا یا کائنات ہے۔ ''رب'' کا معنی ''بنیادی اصول'' ہے۔ اس لحاظ سے پوری کائنات اور اس کا ہر حصہ اپنا ایک اساس مادہ رکھتا ہے جو اس کے ساتھ اس کی مدت بقا تک رہتا ہے۔

''قرآن ایک سخت نظام ہے اور ہر قوم کے لیے مناسب نہیں'' اس بات کو انہوں نے ہرگز نہ مانا۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن ہر وقت اور ہر قوم کے لیے مناسب ہے۔ ہر امیر وغریب' وضیع وشریف' فرد وقوم کے لیے۔ جو اس کے برخلاف پر جمع ہوئے ہیں وہ قرآن کے فلسفہ سے اچھی طرح واقف نہیں۔ قرآنی فلسفہ پوری طرح سے منطقی ہے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ اس کے اصول اخلاق اس محکم اصول پر مبنی ہیں کہ ہر وہ چیز جو رفاہیت انسان کے لیے مضر ہے غیر اخلاق ہے۔

15.4.2 آچاریہ ونوبا بھاوے

کتاب کا نام ہے "The Essence of Quran" یہ اکھل بھارت سیوا سنگھ سے 1962 عیسوی میں شائع ہوئی۔ اپنی کتاب کا مقصد' مصنف نے مقدمہ میں عرض کیا ہے کہ لوگوں کے دلوں کو ملانا ہے۔ یہ کتاب مولف کے پچیس سالہ قرآن کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ آیات کا انتخاب انہوں نے اصل عربی متن سے کیا ہے۔ اور انگریزی پکتھال کے ترجمہ سے ماخوذ ہے۔ اچاریہ ونوبا نے ان آیات کو مناسب عناوین میں تقسیم کرکے قرآن کے پیغام کو واضح کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ یہ کام روحانی معرفت کے میدان میں ایک اہم اضافہ ہے۔

مصنف نے کتاب کو کل نو حصوں میں کرکے ہر حصہ کو مختلف موضوعات پر شامل کیا ہے۔ پہلا حصہ قرآن کی ابتدائی آیات سے شروع ہوتا ہے یہاں قرآن کا ایک تعارف خود قرآنی آیات کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ خدا سے متعلق ہے' توحید' شرک' خدا کی فطرت' اس کا علم' رحمت الٰہی' نعمت الٰہی' قدرت الٰہی وغیرہ آیات الٰہی۔ تیسرا حصہ قربانی پر مشتمل ہے۔ چوتھا حصہ مختلف عناوین کے تحت قرآن کی روشنی میں عابد و کافر کی پہچان وخصوصیات کو پیش کرتا ہے۔ پانچواں حصہ مذہبی عقیدہ پر مشتمل ہے۔ چھٹا حصہ بنیادی اخلاقی اصول پر دلالت کرتا ہے۔ آٹھواں حصہ انبیاء کرام سے متعلق بیان پر مشتمل ہے۔ نواں اور آخری حصہ بھیدوں پر شامل ہے جس میں مختلف موضوعات درج ہیں جیسے فلسفہ' عالم' روح' اصول سبب واثر وغیرہ۔

15.4.3 او۔پی۔گھائے

او۔پی۔گھائے صاحب کی کتاب "Selections from the Quran" قرآن کریم کو مختصر انداز میں پیش کرتی ہے۔ مصنف

کا یہ کام ان کے کئی سال کے دینی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ان کو مذہبی مطالعہ کا شوق 1930ء سے شروع ہوا جب وہ طالب علم تھے۔ اور بالخصوص قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کا جذبہ ان پر غالب ہوا۔ مولانا محمد علی کی کتاب "Selections from the Holy Quran" پڑھنے کے ساتھ۔ یہ کتاب ان کو بطور ہدیہ ملی تھی۔ 1940ء کی دہائی میں آٹھ سال انہوں نے تدریس اور عائلی ذمہ داریاں نبھانے میں گزارے۔ 1948ء کے بعد انہیں دوبارہ مطالعے کا موقع ملا تو انہوں نے چند اور کتابیں مذہب سے متعلق پڑھیں۔ ان میں سے دو کا نام ہے "The Sacred writings of the World's Great Religions" اور "The Bible of the World"۔ اس مطالعہ کے بعد انہوں نے مذہب پر لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی کتاب "Unity in Diversity" کافی مشہور ثابت ہوئی۔ اور تیرہ (13) ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب دنیا کے مختلف بڑے مذاہب کے اخلاقی اصولوں کی ایک مختصر مگر جامع گائیڈ ہے۔ اس کامیابی کے بعد انہوں نے مذہبی اصولوں کی تسہیل فہم کے پروجیکٹ پر کام شروع کیا۔ جس کے نتیجہ میں "Bhagvad Gita" , "Japji" اور "Selection from the Quran" سامنے آئیں۔ اس کتاب کی ابتدا پروفیسر رشید الدین خان کے مقدمہ (Forward) سے ہوئی ہے۔ انہوں نے گھائے صاحب کی کتاب کی اہمیت کو بیان کیا ''معاصر معاشرہ (Contemporary Socieities) میں روشن خیالی پھیلانے کے لیے نہ صرف معاصرانہ علم کا مطالعہ کافی ہے بلکہ مذہب، فلسفہ، سائنس اور ادب کا ایک تنقیدی (Critical) اور عقلی (Rational) مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔''

پروفیسر خان نے کتاب کے مولف کی تعریف کی خصوصاً منتخب قرآنی آیات کے آسان انگریزی ترجمہ کی جو عام قاری کے لیے کافی مفید ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کام عام قاری کے لیے علم، روشن خیالی اور الہام (Inspiration) کا ایک ذریعہ ثابت ہوگا اور اسلام اور اس کے پیغام کی بہتر سمجھ کو فروغ دے گا۔ اس پیش لفظ کے بعد پروفیسر سید اوصاف علی، سابق ڈائرکٹر ہمدرد ریسرچ سنٹر، جامعہ ہمدرد، دہلی کا ایک نوٹ درج ہے۔ جس میں انہوں نے مصنف کے قرآنی آیات کے اسلوب انتخاب کو جانبدارانہ بتایا۔ اس کے بعد گھائے صاحب کا دیباچہ (Preface) آتا ہے۔ اس میں مولف نے مختصر الفاظ میں بیان کیا کہ ان کا یہ کام وجود میں کیسے آیا۔ کتاب کے آخر میں اصغر علی انجینئر صاحب کا "Afterward" نام کا ایک خلاصہ بھی ہے۔

اصلی کتاب ایک تعارف (Introduction) سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں مصنف نے پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت اور سلسلۂ وحی کا تذکرہ کافی اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب نزول کو انہوں نے ایک جدول میں واضح کیا جس میں مکی سورتوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا: علماء کے اختلاف آراء کو ملحوظ رکھتے ہوئے:

1. ابتدائی مکی دور : 114-111, 109-67, 56-50, 21-17, 1
2. وسط مکی دور : 46-40, 39-34, 32-29
3. آخری مکی دور : 28-25, 23, 22, 16-10, 7, 6

مدنی دور میں سورتوں کی ترتیب نزول ہجری سن کے حساب سے چار ادوار میں تقسیم کیا گیا:

1-2 ہجری : 64, 62, 61, 47, 8, 2

3-4 ہجری : 59, 58, 3

5-8 ہجری : 65, 63, 60, 57, 48, 33, 24, 5, 4

9-10 ہجری : 110, 66, 49, 9

اس کے بعد مولف نے اسلام اور اس کے مبادی کو دو صفحات میں پیش کیا ہے۔ یہاں انہوں نے اسلام کے پانچ ارکان کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر ان کا ماننا ہے کہ ''ان بنیادی فرائض کے سوا اسلام چند اور فرائض رکھتا ہے اپنے ماننے والوں کی رہنمائی کے لیے۔'' یہ مزید لکھتے ہیں کہ ''شراب اور دیگر مسکرات کا استعمال یا بتوں کی پوجا حرام ہے۔ تصاویر اور مجسموں کی کراہیت، خطاطی اور مختلف آرائش، فنی تعمیر اور اسلامک آرٹ کی ترقی کا باعث بن گیا۔''

اس مقدمہ کے فوری بعد مولف نے پورے قرآن سے سورتوں کے تسلسل کے مطابق آیات کا ایک حسین اور خوشگوار انتخاب پیش کیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو مکمل اور دیگر سورتوں سے اہم اور مرکزی آیات کو لیا گیا ہے۔ یہ آیات روزانہ کی زندگی کے کام اور عام فلسفۂ دین اور اس کے اصول سے متعلق ہیں۔ یہ انتخاب کے تعلق سے پروفیسر سید اوصاف علی لکھتے ہیں: ''بالعموم انتخاب میں زیادہ تر ذاتیت کا دخل ہوتا ہے مگر گھائے صاحب نے اتنے بہتر انداز سے یہ کام انجام دیا ہے کہ جانبداری اور غیر جانبداری کے درمیان کی حد فاصل پوری طرح غائب ہے۔''

اس مقدمہ کے فورا بعد مولف نے پورے قرآن سے سورتوں کے تسلسل کے مطابق آیات کا ایک حسین اور خوشگوار انتخاب پیش کیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو مکمل اور دیگر سورتوں سے اہم اور مرکزی آیات کو لیا گیا ہے۔ یہ آیات روزانہ کی زندگی کے کام اور علم فلسفۂ دین اور اس کے اصول سے متعلق ہیں۔ اس انتخاب کے تعلق سے پروفیسر سید اوصاف علی لکھتے ہیں ''بالعموم انتخاب میں زیادہ تر ذاتیت کا دخل ہوتا ہے مگر گھائے صاحب نے اتنے بہتر انداز سے یہ کام انجام دیا ہے کہ جانبداری اور غیر جانبداری کے درمیان کی حد فاصل پوری طرح غائب ہے۔''

جناب او۔ پی۔ گھائے کی یہ مخلصانہ کوشش قرآن کریم کو مختصر انداز سے پیش کرتی ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے کہ قرآن میں سے آیات کو انتخاب کر کے اسلام کے مبادی کو ایک نمایاں شکل میں پیش کیا جائے، مگر مصنف نے ''اس کام کو اس میدان کا سب سے بہتر اور مناسب کام گردانا ہے۔''

معلومات کی جانچ

1- قرآن کے غیر مسلم مترجمین پر ایک نوٹ لکھیے۔

2- غیر مسلم مترجمین قرآن کے ترجے کی خصوصیت تحریر کیجیے۔

3- ونو بھا بھاوے، گریش چندر، او پی۔ گھائے کی اسلام کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں پر تبصرہ کیجیے۔

15.5 غیر مسلم نعت گو شعراء

15.5.1 نعت کا آغاز و ارتقاء

نعت رسول ﷺ عقیدت کی صداقت اور جذبات عشق کے وفور کے بغیر ناممکن ہے۔ دور نبوی میں نعت گو شعراء کو کافی قدر و منزلت حاصل تھی۔ اور عہد نبوی کے بعد بھی وہ ہر دور میں قابل احترام سمجھے گئے۔ عربی زبان کے علاوہ فارسی زبان میں نعتوں کا کافی رواج ہوا۔ اسکالرس کا کہنا ہے کہ فارسی نعتیں وفور جذبات میں عربی نعتوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اس کا سبب بتایا جاتا ہے کہ محبوب سے دوری پر عشق و محبت میں جو شدت آ جاتی ہے وہ قربت میں نہیں ہوتی۔ اردو شعراء فارسی و عربی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اسی لیے اردو زبان کا خیالات اور ہیئت میں فارسی و عربی زبانوں سے متاثر ہونا لازمی بات تھی۔ علماء اور خاص طور پر صوفیائے کرام نے ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں یہاں کے لوگوں کو اسلامی تعلیم دی، عربی اور فارسی کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ ان علماء اور بزرگان دین کا حصہ نعت کے آغاز و ارتقاء میں کافی رہا۔ اور ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ برصغیر کے ہر خطہ میں نعت کہنے کا رواج ہوا۔ ہندوستان میں اردو نعت کے ابتدائی دور میں نعتوں میں عربی و فارسی کے نعتیہ عناصر مکمل طور پر رواں تھے۔ اردو کے شعرائے نعت نے مقامی ماحول کی تشبیہات و استعارات کو کوئی جگہ نہ دی تھی۔ اس طرح اردو کی نعتیہ کاوشیں مقامی رنگ سے یکسر عاری تھیں۔ بلکہ اس دور میں اردو نعت مضامین کے تنوع میں بھی عربی و فارسی نعتوں سے متاثر ہوئی اور نعت گو شعراء نے وہی مضامین نظم کیے جو عربی و فارسی کے شعراء اس سے قبل نظم کر چکے تھے۔

زمانے کے ساتھ نعت کے مضامین اور ان کی پیش کشی پر ہندوستانی طرز معاشرت، تہذیب و تمدن اور ہندو مت کے اثرات بھی پڑے۔ اس طرح مضامین نعت کے ساتھ ساتھ نعت کے فن پر بھی مقامی اثرات پڑے۔ اور نعت کی ہیئت میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ اردو کا پہلا نعت گو شاعر ملا داؤد ہے۔ یہ شمالی ہند سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی مثنوی ''چندائن'' ہے جو 781 ہجری مطابق 1379 عیسوی کی اردو زبان کا اولین لسانی و ادبی نمونہ ہے۔ مثنوی چندائن میں شامل نعت کو اردو کی پہلی نعت ہونے کا فخر حاصل ہے۔

1857 کے انقلاب نے ہندوستان میں ہمہ جہتی انقلاب برپا کر دیا۔ پرانے اقدار و معاییر کی جگہ نئے قدروں اور نئے معیاروں نے لے لی۔ جدیدیت کی روایت بڑی حد تک اسی انقلاب کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ اس دور میں ہمیں متعدد ایسے غیر مسلم شاعر ملتے ہیں جنہوں نے مقدار اور معیار ہر اعتبار سے اس روایت کو آگے بڑھایا اس کے بہت سے سیاسی و معاشرتی عوامل ہیں جو اس مضمون سے تعلق نہیں رکھتے ہیں لہذا ان کا ذکر یہاں کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ پروفیسر شیث لکھتے ہیں۔: ''اس طرح ہندو شاعروں کے ہاں نعت رسول اکرم ﷺ اور بزرگان دین کی منقبت کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ہندو شاعروں کے ہاں نعت گوئی کے ذوق کو اسی ماحول میں جلا ملی، ان سیاسی و معاشرتی عوامل میں سب سے بڑھ کر رحمت للعالمین ﷺ کی ذات گرامی ہے جن کی سیرت و کردار اور پیغام نے اہل فکر کو خاص طور پر متاثر کیا۔''

غیر مسلم نعت گو شعراء میں پنڈت ہری چند اختر، تلوک چند محروم، امر چند قیس، منور لکھنوی، منشی شنکر لال ساقی، مہاراجہ سر کشن پرشاد اور کئی مزید ہندو شعراء کے اسمائے گرامی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اکثر مسلمان شعرائے نعت کی طرح ہندو نعت گو شعراء کے یہاں رسمی نعتوں کی فراوانی ہے۔ ان ہندو نعت گو شعراء میں کئی ایسے بھی ہیں جنہیں صحیح معنوں میں شاعر نعت کہا جا سکتا ہے۔

15.5.2 منشی شنکر لال ساقی

منشی شنکر لال نے جنگ آزادی سے قبل شاعری کا آغاز کر دیا تھا، مگر انہیں شہرت بعد میں نصیب ہوئی۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نعتیہ اشعار کہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں:

مرا ہر لفظ نعت احمدی سے دریکتا ہے
لکھا جو دائرہ ہے وہ مہ کامل کا ہالا ہے

جیتے جی روضۂ اقدس کو نہ آنکھوں دیکھا
روح جنت میں بھی ہوگی تو ترستی ہوگی
نعت لکھتا ہوں مگر شرم مجھے آتی ہے
کیا مری ان کے مدح خوانوں میں ہستی ہوگی

آیت لولاک سے ظاہر تھی عظمت آپ کی
سب سے پہلا تھا یہی نور نہاں قندیل میں

کیا کہوں جلوہ تھا کیا صلی علی صلی علی
رہ گئی تھی دیکھ کر حیران و ششدر چاندنی

15.5.3 دلّو رام کوثری

دلّو رام کوثری کی شخصیت ایک حقیقی نعت گو شاعر کی ہے۔ انہوں نے تقلیدی نعتوں سے ہٹ کر بہت سی جاندار نعتیں کہی ہیں جن سے ان کے شغف اور حب رسول عربی ﷺ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے تخلص ''کوثری'' کے تحت لکھا ہے اور جہاں گنجائش نہ ہوئی وہاں اپنا تخلص ''دلّو رام'' استعمال کیا ہے۔ زبان کی پختگی و جذبات کی پاکیزگی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ عشق محمدی کی سرشاری اور ذوق نعت سے سرشاری کا اظہار ان کی نعت گوئی کے نمایاں اوصاف ہیں۔

نئی نعت لکھوں نیا سال ہے ۔۔۔ کہ نوروز سے جی بھی خوشحال ہے
خدا ہے محمد ہے اور آل ہے ۔۔۔ سوا ان کے جو کچھ ہے جنجال ہے
مند قلم کی دم وصف شاہ ۔۔۔ نئی ہے روش اور نئی چال ہے
ہے نعت نبی ذکر پروردگار ۔۔۔ کہ یہ تو عمل حسن اعمال ہے
نمازوں میں شہ کا تصور رہے ۔۔۔ کہ یہ حال ہے اور وہ قال ہے
رسائی ہے جس کی در شاہ پر ۔۔۔ وہی صاحب جاہ و اقبال ہے
پیمبر کی انگلی کا ہے وہ نشاں ۔۔۔ رخ مہ پر سمجھا جسے خال ہے
ڈروں تیغ آفت کے کیوں وار سے ۔۔۔ کہ نام محمد مری ڈھال ہے
غم دین و دنیا مجھے کچھ نہیں ۔۔۔ ثنا خوان شہ فارغ البال ہے
نہیں کچھ مرے دل میں جز شوق نعت ۔۔۔ کہ ہر حسرت و حرص پامال ہے
میں عسرت میں لکھتا ہوں نعت نبیؐ ۔۔۔ خدائے جہاں کا یہ افضال ہے

ورق چند ہیں نعت کے میرے پاس　　یہی اپنی پونجی یہی مال ہے
ہے پائے محمدؐ سر دلّو رام　　یہ نسبت مرے اوج پر دال ہے

مدینے کے آنے لگے خواب روز
میاں کوثری نیک یہ فال ہے

عظیم الشان ہے شان محمد
خدا ہے مرتبہ دان محمد
کتب خانے کیے منسوخ سارے
کتاب حق ہے قرآن محمد

بتاؤں کوثری کیا شغل اپنا
میں ہوں ہر دم ثناخوان محمد

دلّو رام نے ہر قوم وملت کی شان میں نظم لکھی ہے اور ہر ایک قسم کی نظم کہی ہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں اور سب کی سب مؤثر ہیں۔ انہوں نے عہد کیا تھا کہ کوئی پامال شدہ مضمون نہ باندھیں گے اور ارباب سخن جس شعر کو نیا نہ تسلیم کریں گے اس کو وہ نکال دیں گے۔ شروع شاعری میں انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ وہ سخت تشنہ لب ہے انہوں نے اپنی والدہ سے پانی مانگا ان کی ماں نے پانی بتایا مگر وہ پانی سرخ رنگ کا تھا جس کو انھوں نے نہیں پیا اور اپنی والدہ صاحبہ سے عرض کیا کہ وہ دعا کریں کہ ابھی بارش ہو۔ چنانچہ بارش شروع ہوئی اور بڑے بڑے قطرے سفید رنگ کے آسمان سے گرے اور انہون نے دونوں ہاتھوں سے اوپر کا اوپر پانی لے کر خوب پیا اور سیر ہوگئے۔ ایک عالم نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ دلّو رام خوب تحصیل علم کریں گے اور رحمت الٰہی ان پر نازل ہوگی۔

15.5.4 منوہر لعل بہار

منوہر لعل کی پیدائش حیدرآباد میں 1913 عیسوی میں ہوئی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ محکمہ زراعت حکومت آصفیہ سے منسوب ہوئے اور منتظم نظامت زراعت کے عہدہ پر وظیفہ یاب ہوئے۔ حضرت فصاحت جنگ جلیل مانک پوری (1866ء) سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ اس طرح ان کا سلسلہ سخن حضرت امیر مینائی سے جاملتا ہے۔

اگر چہ بنیادی طور پر آپ غزل کے شاعر تھے لیکن حمد ونعت نبوی ومنقبت سے بھی شغف رکھتے تھے۔ حضرت صوفی اعظم کے سالانہ نعتیہ مشاعرہ کی نظامت کا اعزاز تاحیات آپ ہی کو حاصل رہا۔

منوہر لعل بہار کے شعری ورثہ میں جو مجموعے شامل ہیں وہ یہ ہیں: ''بہارستان''، ''تکرار تمنا''، ''افکار نورانی''، ''فردوسی بہار''، ''لہریں'' اور ''سخن در سخن''۔

غزلیات میں زبان وبیان کی سلاست ولطائف کے ساتھ شعری محاسن کی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں اور طرز ادا میں پختگی ہے۔ آپ کے نعتیہ اشعار جذب وشوق اور حب رسول ﷺ سے بھرے ہوئے ہیں۔

قلب و نظر کے منبعٔ دیدار ہیں حضور — روشن ضمیر صاحب معیار ہیں حضور
پیغمبروں کے سرور و سردار ہیں حضور — اس کارواں کے قافلہ سالار ہیں حضور
خیرالامم حبیب خدا بالیقیں ہیں آپ — خادم ہیں ہم غلام ہیں سرکار ہیں حضور
سائے کی کیا مجال زمیں پر جو پڑ سکے — نور الھدیٰ ہیں مرکز انوار ہیں حضور
سرتاج اولیا ہیں نبیوں کے ہیں امام — تخلیق کبریا کے وہ شہکار ہیں حضور
عقدہ کھلا ہے یہ شب معراج آپ ﷺ کا — سرتاپا نور پر تو غفار ہیں حضور

تعمیر دین حق نہ سنور جائے کیوں بہار
بنیاد لا الہ کے معمار ہیں حضور

15.5.5 مہاراجہ سرکشن پرشاد

مہاراجہ سرکشن پرشاد راجا ہری کرن کے فرزند تھے۔ انہوں نے اپنا نسب راجہ ٹوڈرمل' جو مغل بادشاہ اکبر کے وزیر خزانہ تھے سے بتلایا۔

مہاراجہ سرکشن میر محبوب علی خان آصف سادس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ آصف سادس نے انہیں راجا بہادر اور یمین السلطنت کے خطابات عطا کیے۔ 1895 عیسوی میں وزارت فوج کی خدمت پر ان کو فائز کیا گیا۔ اور 1901 عیسوی میں صدراعظم (Prime Minister) مقرر کیے گئے۔ 1926 عیسوی میں انہیں دوسری بار صدراعظم مقرر کیا گیا' اس بار تقریباً دس سال اس خدمت پر فائز رہے۔

اردو' فارسی' عربی اور انگریزی پر کافی حد تک عبور تھا۔ اردو ادب اور شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس لیے اردو کے بیشتر نامور شاعروں اور ادیبوں سے ان کی خط و کتابت تھی۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور پرگو شاعر تھے۔ انہوں نے نظم و نثر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اگر چہ مہاراجہ سرکشن پرشاد ہندو تھے لیکن وہ تمام مذاہب کے بنیادی عقائد کو مانتے تھے اور ان کی زندگی پر کسی ایک مخصوص مذہب و مسلک کی چھاپ نہیں دکھائی دیتی تھی۔ تمام مذاہب کے ماننے والوں میں مقبول و محترم تھے۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں — ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے — آزادی آزاد ہی جانے

مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نعتیہ کلام "ہدیہ شاد" کی اشاعت 1326 ہجری میں ہوئی۔ انہوں نے کثرت سے نعت نبوی کہی' ان کا مجموعہ نعت تقریباً 200 صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ نعت نہایت عقیدت کے ساتھ لکھتے ہیں' ان کی نعت حب رسول عربی ﷺ سے بھری ہوئی ہیں' محسوس تو ہوتا ہی نہیں کہ یہ کلام کسی غیر مسلم کا ہے۔

سازگار اپنا زمانہ ہوگیا — ہند سے طیبہ کا جانا ہوگیا
مدینہ کو چلو دربار دیکھو — رسول اللہ کی سرکار دیکھو

☆☆☆

کان عرب سے لعل نکل کر سرتاج بنا سرداروں کا

نام محمد اپنا رکھا سلطان بنا سرکاروں کا

روپ ہے تیرا رتی رتی ' نور ہے تیرا پتی پتی
مہر و مہ کو تجھ سے رونق نور بنا سیاروں کا
اس کو سب کہتے تھے ' علم لدنی کا تھا عالم
راز بھرا تھا سینے میں قرآن کے تیس پاروں کا
بادۂ عرفان ملتا ہے ساقی کے میخانے سے
شاد مقدر فضل خدا سے جاگا اب میخواروں کا

اسکالرس شاد کے کلام کی کثرت اور کیف کے باعث غیر مسلم نعت نگاروں کے دو تین بڑے شاعروں میں ان کا شمار کرتے ہیں۔

15.5.6 جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد دسمبر 1918 عیسوی میانوالی (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد تلوک چند محروم اردو کے مشہور شاعر تھے۔ شاعری انہیں وراثت میں ملی ہے لیکن اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور ذاتی کاوشوں سے انہوں نے اپنی شاعری کو سنوارا اور اردو کے شاعری سرمایے میں اہم اضافہ کیا۔

آزاد نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی۔ بڑے ہو کر جب کالج کے طالب علم ہوئے تو ان کی ذہنی تربیت اور شعری شخصیت کی تشکیل میں مولانا تاجور نجیب آبادی' ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (وائس پرنسپل اورینٹل کالج' لاہور) ڈاکٹر عبداللہ' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سید عابد علی عابد جیسے نامور اہل علم حضرات کا ہاتھ رہا۔ مزید ان کو اپنے عہد کے ممتاز ترین شاعروں سے قربت حاصل رہی' جس کی وجہ سے ان کا کلام زبان و بیان کی غلطیوں سے بالکل پاک ہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں' جن میں ''طبل و علم'' ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے' یہ 1948ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''بیکراں'' کے نام سے 1949 میں چھپا۔ 1951ء میں ''ستاروں سے ذروں تک'' دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''طلوع فردا'' اور ''نوائے پریشان'' کافی مشہور ہیں۔ آزاد مذہبی افکار کے اعتبار سے رنگ تصوف کا غلبہ ہے۔ انہوں نے ہر مذہب کے بنیادی عقائد اور اس کے پیغمبروں اور اوتاروں کے تعلق سے دل سے احترام ظاہر کیا ہے۔ انھوں نے اردو کو اپنی مادری زبان بتلایا۔ اردو کو وہ محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ ہند ایرانی تہذیب کا اعلیٰ ترین مظہر سمجھتے تھے۔

اردو کو مٹاؤ گے تو ٹوٹ جائے گی
خوشبو یہ فضا کو' پھر نہ مہکائے گی
لیکن یہ بھی ضرور ہے اے دیوانو
تہذیب میں کسی قدر کمی آئے گی

☆☆☆

غرض دنیا میں چاروں سمت اندھیرا ہی اندھیرا تھا
نشان نور گم تھا اور ظلمت کا بسیرا تھا
کہ دنیا کے افق پر دفعتہً سیلاب نور آیا
جہان کفر و باطل میں صداقت کا ظہور آیا
حقیقت کی خبر دینے بشیر آیا نذیر آیا
شہنشاہی نے جس کے پاؤں چومے وہ فقیر آیا
بھٹکتی خلق کو رستہ دکھانے رہنما آیا
سفینے کو تباہی سے بچانے ناخدا آیا
مبارک ہو زمانے کو کہ ختم المرسلین آیا
سحاب رحم بن کر رحمتہ للعالمین آیا

امام الانبیا آیا محمد مصطفیٰ آیا
محمد مصطفیٰ یعنی وہ محبوب خدا آیا
دلوں نے سرخوشی پائی کہ احمد مجتبیٰ آیا

15.6 اسلامی موضوعات پر لکھنے والے غیر مسلم مصنفین

15.6.1 تاریخ اسلامی

اسلامی علوم وفنون کی دیگر شاخوں کے مقابلہ میں اسلامی تاریخ پر ہندوؤں کی تحریریں زیادہ ملتی ہیں ۔فقہ' اصول فقہ' حدیث وغیرہ اسلامی علوم کے مقابلہ میں اسلامی تاریخ پر لکھنا ہندو مصنفین کے لیے نسبتاً زیادہ آسان تھا۔حقیقت تو یہ ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندو مورخین بہت سے واقعات کے عینی شاہد تھے'اور جس کی وجہ سے ان کے بیانات قابل اعتماد ہیں۔

اسی سلسلہ میں کئی معیاری تصنیفات نظر آتی ہیں'ان میں سے چند اہم کتابوں کا ذکر درج ذیل ہے:

15.6.1.1 لب التواریخ:

یہ کتاب بندر ابن داس بہادر شاہی نے لکھی ہے ۔مولف نے اس میں شہاب الدین غوری سے لے کر 1101 ہجری تک کے ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے۔سندر ابن داس' رائے بھارا مل داس کالڑکا تھا جو شاہ جہاں کے دربار میں ایک معمولی ملازم سے ترقی کرتے کرتے پنجاب کا دیوان مقرر رہوا۔اس کے نام میں بہادر شاہی کی نسبت کی وجہ یہ ہے کہ وہ معظم بہادر شاہ کی شہزادگی کے زمانے میں دیوان کے عہدہ پر فائز

تھا۔

اس کتاب کا سال تصنیف 1101 سے 1105 ہجری تک کا ہے۔اور اس میں ''تاریخ فرشتہ'' , ''اکبرنامہ'' اور ''جہانگیرنامہ'' سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

فصل اول	....	سلاطین دہلی
فصل دوم	....	فرمانروایان دکن
فصل سوم	....	سلاطین گجرات
فصل چہارم	....	فرمانروایان برہان پور
فصل پنجم	....	فاروقی سلطنت
فصل ششم	....	حکام بنگال
فصل ہفتم	....	شرقی حکومت جون پور
فصل ہشتم	....	امرائے سندھ
فصل نہم	....	فرمانروایان ملتان
فصل دہم	....	سلاطین وفرمانروایان کشمیر

لب التواریخ کی زبان سادہ وعام فہم ہے جس سے فارسی پر مولف کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔اور اس کے بیانات قابل اعتبار ہیں

15.6.1.2 خلاصۃ التواریخ

یہ تصنیف منشی سجان رائے بٹالوی نے 1107ھ بمطابق 1695ء میں تکمیل کی ہے۔سجان رائے کھتری بٹالہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ان کا خاندانی پیشہ منشی گیری تھا۔اس کتاب میں ابتدائے آفرینش سے عالمگیر تک کے حکمرانوں کے مختصر حالات اور تاریخی واقعات کے ساتھ اس عہد کی تمدنی اور معاشرتی جھلکیاں اور معاشی ومعاشرتی تبصرے بھی دلچسپ انداز میں ہیں۔

اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں اس کتاب میں سبکتگین سے لے کر لودھی تک کے واقعات کا تذکرہ ہے آخر میں بابر سے لے کر اورنگ زیب تک مغلیہ سلاطین کے حالات دیے ہیں۔کیوں کہ مصنف کا تعلق پنجاب سے تھا اس لیے صوبہ لاہور یا پنجاب کا حال زیادہ مفصل ہے۔یہ کام تاریخ فرشتہ سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔خلاصۃ التواریخ کی زبان پر اس عہد کی زبان کی عام روش کے اثرات ہیں۔نثر کے ساتھ کثرت سے اشعار استعمال کیے گئے ہیں۔

15.6.1.3 تذکرہ الکاملین

یہ کتاب ماسٹر رام چندرا نے لکھی ہے جو اکتوبر 1849ء میں مکمل ہوئی۔پروفیسر رام چندرا اس وقت ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتہ

تعلیمات تھے۔ بقول مولف یہ کتاب 1872ء میں مطبع نول کشور مقام لکھنؤ میں چھاپی گئی۔ اس میں مشہور مسلم شخصیات سے متعلق جو مضامین ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1. ابوعلی سینا
2. حکیم لقمان
3. جلال الدین رومی
4. حضرت نظامی (1200ء)
5. شیخ سعدی شیرازی
6. خواجہ حافظ شیرازی
7. مولانا عرفی
8. حافظ فردوسی
9. ابوالفضل (وزیر مغل سلطان اکبر)
10. شیخ ابوالفیض فیضی
11. حضرت نظام الدین اولیاء
12 امیر خسرو

ماسٹر رام چندر 1821 عیسوی میں پانی پت میں پیدا ہوئے' والد کا نام سندر لال تھا جو دہلی کی کائستھ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی' 1833ء انگلش اسکول میں داخل ہوئے۔ 1844ء میں دہلی کالج میں سائنس کی تدریس کی ملازمت ملی۔ اردو زبان میں یورپی سائنسی کتابوں کے ترجمے میں ان کا اہم کردار تھا۔

15.6.1.4 تاریخ پرگنات ٹونک

اس کتاب کے مصنف پنڈت رام کرن جوشی ٹونک کے غیر مسلم مصنفین میں بڑے پایہ کی شخصیت تھے۔ وہ فارسی و اردو کے علاوہ سنسکرت کے بھی بڑے عالم تھے۔ نواب صاحب ٹونک نے مفصل تاریخ مرتب کرنا تجویز کرکے یہ ذمہ داری پنڈت رام کرن کے شانے پر ڈالدیا۔ اس طرح یہ کتاب پوری ریاست ٹونک کی مفصل تاریخ ہے۔ مصنف نے یہ کام بڑی تحقیق و تدقیق اور محنت وعرق ریزی سے ماہرانہ انداز میں مکمل کیا ہے۔ اس میں تاریخی حالات وواقعات کے علاوہ ٹونک کی عمارتیں' محلے اور جملہ کتبوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بہت سی جگہ پنڈت رام نے خود جاکر حالات معلوم کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں پروفیسر شیث اعظمی لکھتے ہے۔''اس کی نقل فل اسکیپ کے چار سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے' نقل کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ 1961ء میں راقم الحروف نے اصل مبیضہ جوشی جی کے فرزند پنڈت دامودر جی کے پاس دیکھا تھا جو اردو رسم الخط میں تھا اور دامودر جی نے یہ کہتے ہوئے دکھایا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے بھی اردو کی خدمت کی ہے۔''

15.6.1.5 بدائع وقائع

یہ تحریر آنند رام مخلص متوفی (1164ھ۔1750ء) کی ہے۔ مخلص سودھرہ ضلع سیالکوٹ میں بڑے ہوئے۔ محمد شاہ (1161ھ۔1748ء) کے زمانے میں وزیر اعتمادالدولہ (قمرالدین) کے وکیل تھے۔ شاعری میں ابتدا میں مرزا بیدل کے شاگرد تھے' پھر سراج الدین علی خان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ فارسی زبان کے ماہر ہندو شاعروں میں سے ایک نام ان کا بھی ہے۔ بدائع وقائع تین ابواب پر مشتمل ہے' پہلے باب میں نادر شاہ کا ہندوستان پر حملہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے' دوسرے باب میں محمد شاہ کی مہم علی محمد خان روہیلا کے خلاف کا ذکر ہے۔ یہ مخلص کے عینی مشاہدہ پر مبنی ہے۔ تیسرے باب میں احمد شاابدالی کے ہندوستان پر حملے کا بیان ہے۔ اس کتاب کا اس دور سے متعلق لکھی گئی چند بنیادی تاریخی مآخذ میں شمار ہوتا ہے۔

ہندوستان میں فارسی کے معیار کو بہتر بنانے کی کوشش میں انہوں نے مرتب کیا ''مرآۃ الاصطلاح''۔ یہ مولف کی اہم تصنیف ہے اور بنیادی حیثیت سے یہ ایک ڈکشنری ہے جس میں مصنف نے معاصر فارسی استعمال کو حروف تہجی کے ترتیب کے مطابق تالیف کیا ہے۔ اس کتاب میں سرکاری اصطلاحات اور پروسیجرس' محاورہ اور امثال کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ یہ کام ایسے متنوع موضوعات پر معلومات فراہم کرتا ہے جیسے کہ شیشے کی انڈسٹری' معروف خطاط' تخت طاؤس' جمعہ بازار' فن تصویر کشی وغیرہ۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاصرین کا حال بھی ملتا ہے جیسے قزلباش خان امید' زاہد علی خان سخی' ہدایت اللہ خوشنویس' مرزا صائب' محمد احسن سامع' جہان آرا بیگم' ارادت خان' معزز خان' افسر ہاشم خان محزون' محمد علی حزیں' مرزا عبدالغنی بیگ قبول' میر شریف الدین پیان حشمت وغیرہ۔

بدائع وقائع کے بعض اجزا کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے بعض اجزا باڈلین لائبریری (آکسفورڈ)' رام پور اور علی گڑھ میں موجود ہیں۔ بدائع وقائع کا کامل نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے لیکن اس میں فصلوں کی ترتیب اوپر کے نسخوں کے مطابق نہیں ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے نسخہ میں 286 ورق ہیں' 15 سطور ہیں۔ کتاب کی پہلی فصل رجب 1145ھ کے واقعات سے شروع ہوتی ہے۔ اور خاتمے کی تاریخ 11 جمادی الثانی 1161ھ ہے (یاد رہے کہ مصنف 1164ھ میں فوت ہوئے)

مخلص نے شروع میں ایک مختصر سا دیباچہ دیا ہے جس میں انہوں نے حمد کے بعد اس تصنیف کی وجہ بیان کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علم تاریخ کے اساتذۂ سلف نے دوسرے لوگوں کی سوانح تو لکھی مگر اپنے احوال کو قلم بند نہ کیا۔ بس اسی خیال نے ان کو اس کام پر مجبور کیا اور انہوں نے یہ چند اوراق لکھ کر ان کا نام بدائع وقائع رکھا۔

15.6.2 ترجمہ

15.6.2.1 منشی گوپال کرشن تحسین

منشی گوپال کرشن تحسین کو اردو و فارسی دونوں زبانوں میں پوری مہارت وقدرت حاصل تھی۔ آپ مہاراجہ منگل سنگھ کے عہد میں الور کے حاکم عدالت تھے۔ ان کی کتاب '' چمنستان'' گلستان کا شستہ اور سلیس اردو ترجمہ ہے۔ دوسرے ترجموں کی موجودگی میں اس ترجمہ کی ضرورت کو مترجم نے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔ ترجمہ کو مفید تر بنانے کی غرض سے منشی گوپال نے ہر باب کے شروع میں اس کی حکایات سے متعلق ایک واضح نوٹ بطور مقدمہ تحریر کیا ہے تا کہ حکایات کا ماحصل وغرض اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ گلستان ایک صوفیائی تہذیب اخلاق پر کلام اور حکایات کا مجموعہ ہے نیز فارسی زبان میں کلاسیکی ادب کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

15.6.2.2 جانی بہاری لال راضی

جانی بہاری لال راضی خلق جانی نتھی رام ادباء میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ گجراتی برہمن تھے۔ انہوں نے نہ صرف عربی' فارسی' اردو' سنسکرت اور ہندی زبانوں کی تعلیم حاصل کی بلکہ انگریزوں کی فوج میں انگریز افسروں کو اردو و فارسی بھی پڑھایا۔ ان کے چند اہم ترجمے درج

ذیل ہیں:

i. نگارراضی: منظوم اردو ترجمہ گلستان، مطبوعہ 1868ء

ii. ارژنگ راضی: منظوم اردو ترجمہ انوار سہیلی سعدی، مطبوعہ 1872ء

iii. دلارام راضی: منظوم اردو ترجمہ روضۃ الصفا، مطبوعہ 1873ء

15.6.2.3 منشی مول چند لال

مول چند منشی ایک باکمال ادیب اور شاعر تھے۔ ان کا انتقال 1832ء میں ہوا۔ فارسی زبان کی مشہور کتابوں کو اردو زبان میں منظوم ترجمہ کرنے میں کافی شہرت حاصل کی۔ ان کی ادبی خدمات قابل قدر ہے۔ انہوں نے شمشیر فانی اور فردوسی کے شاہنامہ کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔

15.6.2.4 کچھ مزید مترجمین اور ان کے منظوم ترجمے

i. الف لیلیٰ (منظوم) : طوطا رام شایاں لکھنوی

ii. قصہ امیر حمزہ (منظوم) معروف بہ طلسم شایان: طوطا رام شایان

iii. اشرف المناقب، غوث شاہ قلندر کی سوانح : چرنجی داس

iv. ترجمہ دیوان حافظ : دلپت رائے

v. الف لیلیٰ (منظوم) : چھیدا لال صدق، مطبوعہ نول کشور 1868ء

vi. عرفان حافظ (ترجمہ دیوان حافظ) : شیاما چرن داس

vii. کلام حقانی (ترجمہ کلام بابا فرید) : جیت سنگھ شسیل 1973ء

viii. مجموعہ اخلاق (ترجمہ اخلاق ناصری) : سدا سکھ لال، مطبوعہ 1893ء

15.7 خلاصہ

ہندوستان میں غیر مسلموں کی خدمت علوم وفنون اسلامیہ کے میدان میں متنوع اور دلچسپ رہی ہے۔ تاریخ اسلامی کے میدان میں ان کا کام زیادہ نمایاں ہے۔ ساتھ ہی ترجمہ قرآن کریم اور نعت نبوی میں بھی ان کی خدمات بڑی عظیم رہی ہیں۔ ہندو علماء و مفکرین نے فارسی اور اردو میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ان دونوں زبانوں میں کتابیں تصنیف کیں۔ الگ الگ کتابیں خاص علوم اسلامیہ پر لکھی؛ جیسے سیرت نبوی، تصوف، مرثیہ وغیرہ۔

ترجمہ کے میدان میں کئی ہندوستانی غیر مسلم ادیبوں کے نام نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مول چند منشی لال اور منشی طوطا رام شایان کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ہندو علماء و مفکرین نے قرآن کو سمجھنے میں کافی دلچسپی لی۔ ترجمہ قرآن میں ان کی علمی و ادبی کاوشیں قابل ذکر ہیں۔ ان مترجمین نے بڑی حد تک اہتمام و احتیاط کے ساتھ کام کیا اور اپنی جانب سے پوری کوشش کی کہ ترجمہ صحیح معنی اور مناسب متبادل لفظ پر مبنی رہے۔
مسلم علماء اور خاص طور پر صوفیائے کرام کا نعت رسول ﷺ کے آغاز و ارتقاء میں کافی بڑا حصہ رہا۔ 1857 کی تحریک آزادی نے

مسلم شاعروں کو نعت و منقبت کی طرف راغب کیا۔اس ماحول میں نعت گوئی کے ذوق کو جلا ملی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی علوم کی دیگر شاخوں کے مقابلہ میں تاریخ اسلامی پر ہندوستانی غیر مسلم علماء و مفکرین کی تحریریں زیادہ ملتی ہے۔اسلامی سلطنت کے دور کے غیر مسلم مورخین بہت سے واقعات کے عینی شاہد تھے اس لیے ان کے بیانات قابل اعتماد ہیں۔

ہندوستان میں غیر مسلم علماء و مفکرین مسلم ثقافت سے بہت حد تک متاثر ہوئے اور اس اثر و ارتباط سے ان علماء نے اسلامی علوم کے میدان میں اہم خدمات پیش کیں۔اسی کے ساتھ تاریخ اسلام، نعت نبوی، ترجمۂ قرآن وغیرہ میں کافی قیمتی اضافہ بھی کیا۔

معلومات کی جانچ

-1 غیر مسلم نعت گو شعرا پر ایک نوٹ لکھیے۔

-2 مہاراجہ کشن پرشاد اور دلو رام کوثری کی نعتیہ شاعری پر تبصرہ کیجیے۔

-3 اسلامی موضوعات پر لکھنے والے مصنفین کی تصنیفی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

15.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. قرآن کریم کے غیر مسلم مترجمین پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. نعت کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے دو ہندو نعت گو شعراء کا تعارف کرائیے۔
3. تاریخ اسلام میں ہندوؤں کی تصنیفات کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے

4. کتاب "Khuda - Quranic Philosophy" پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. دلّو رام کوثری پر ایک مضمون لکھیے۔
6. چلوکوری نرائن راؤ کے تلگو زبان میں ترجمہ کا تعارف کرائیے۔

15.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. مسلم ثقافت کے اثرات : ڈاکٹر سید اسد علی
2. ہندو علماء و مفکرین کی قرآنی خدمات : وزیر حسن (ترجمہ اورنگ زیب اعظمی)
3. اردو شاعری میں نعت : ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری

4. دراسات سلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات : پروفیسر شیث محمد اسماعیل اعظمی

اکائی 16 : چند اہم غیر مسلم اسکالرس

اکائی کے اجزاء

16.1 مقصد

16.2 تمہید

16.1 مقصد

ہندوستانی قوم میں اسلام کا تعارف آخر دورِ نبوی میں ہی ہو گیا تھا اور ہندوستان میں اس کے ورود کا سلسلہ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے دور سے شمار کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسلام ہندوستانی زندگی میں ایک ایسا ثقافتی معیار بنتا گیا جو اپنے گرد و پیش کی تہذیب سے منفرد تو تھا لیکن ہندوستانی زندگی کو بہت قریب سے متاثر بھی کرتا تھا۔ اس ثقافتی بیگانگی اور سماجی تعامل کی ناگزیری نے رفتہ رفتہ ہندوستانی تہذیب کو ہند اسلامی تہذیب وثقافت کے روپ میں ڈھال لیا جس کی صورت گری میں ہندو دانشوروں نے بھی نمایاں رول ادا کیا ہے۔ زیرِ نظر مطالعہ میں ان اہم نمایاں غیر مسلم ہندوستانی دانشوروں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے ہند-اسلامی تہذیب وثقافت کے کسی پہلو کو اجاگر کیا ہے اور اس طرح اسلامیات کے لٹریچر میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ اس مطالعہ سے طلباء کو اسلام اور مسلمانوں کا مطالعہ ہندو نظر و فکر سے کرنے میں مدد ملے گی اور ہندوستان کی قومی تہذیب میں ہند-اسلامی ثقافت کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوگا۔

16.2 تمہید

اسلام کی آمد سے ہندوستان میں سماجی اور سیاسی انقلاب کے پہلو بہ پہلو ایک فکری انقلاب بھی برپا ہوا جس کی ترجمانی مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی کی۔ مغل دور آتے آتے یہ تہذیبی اشتراک اور زور پکڑ چکا تھا لیکن اس دور میں ترجموں کو اولیت دی گئی۔ بعد میں جب ہندوؤں نے مسلمانوں سے علم تاریخ سیکھ لیا تو انھوں نے بھی دراساتِ اسلامی میں اپنے فنِ تاریخ سے خاصا اضافہ کیا۔ انگریزوں کی آمد سے جب ہندوستان میں ایک نئے عہد کی شروعات ہوئی تو ہندو فکر کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ یہاں پر جدید دور کے دانشوروں میں سے چھ حضرات:

مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مالک رام، ڈاکٹر تاراچند، پنڈت سندر لال اور ڈاکٹر بی۔ این۔ پانڈے کا تعارف کرایا گیا ہے۔

16.3 مہاتما گاندھی

ہندوستانی شہریوں میں حریت اور وطن دوستی کی روح پھونکنے والے عظیم ہندوستانی پیشوا موہن داس کرم چند گاندھی نے ایک سناتن دھرمی پیشوا کی حیثیت سے قابل قدر مذہبی اور سماجی اصلاحات کی تھیں اپنی خاندانی روایات کے زیر اثر انھوں نے ہندوستان میں موجود دیگر مذاہب، بالخصوص اسلام اور عیسائیت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے ان کی شخصیت پر 'سرو دھرم سمبھاؤ' کی ایسی گہری چھاپ پڑی کہ وہ زندگی بھر ہندوستان کی قومی ثقافت کے گنگا جمنی روپ کی وکالت کرتے رہے اور تمام مذاہب کے دفاع میں سینہ سپر رہے۔ گاندھی جی نے اپنی تحریروں میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے بے باکانہ اور بے لاگ اظہار خیال کیا ہے اور ان کی پوری زندگی ان کے اسی رجحان کی شہادت دیتی ہے۔

حیات

گاندھی جی کی پیدائش کاٹھیاواڑ (گجرات) کے ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو گزشتہ 6 نسلوں سے مقامی حکمراں کے سیاسی انتظامیہ میں وزیر اعظم یا وزیر داخلہ رہ چکے تھے۔ اس گھرانہ سے مسلمانوں کی قربت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مقامی حکمراں سے گاندھی جی کے دادا کی چشمک میں ایک مسلمان نے ان کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان قربان کردی تھی جس کی یادگار گاندھی جی کے آبائی مکان کے قریب واقع ویشنو مندر میں آج تک قائم ہے۔ اسی خاندان کے ایک فرد کرم چند گاندھی جی ان کے والد محترم تھے جو ریاست پور بندر اور پھر راجکوٹ کے دیوان بنے۔ کرم چند صاحب مذہبی کلچر کی نمائندگی تو کرتے تھے مگر روایتی روحانیت سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، البتہ وہ جین منیوں، پارسی مذہبی رہنماؤں اور مسلمان عالموں سے تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔

گاندھی جی کی والدہ پتلی بائی پرنامی ویشنو فرقہ کی کٹر سناتن دھرم خاتون تھیں جن کے برتوں اور پوجا پاٹھ نے گاندھی جی کے معصوم ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ گاندھی جی اپنی والدہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان سے کیے ہوئے وعدوں کی بدولت گاندھی جی نے گوشت خوری اور بعض بری عادتوں سے نجات پائی۔ انھی خاتون کے زیر سایہ گاندھی جی نے پور بندر کے جیلر کے بیٹے شیخ مہتاب کے ساتھ مثالی دوستی قائم کی۔

اپنے والد کی لائبریری سے گاندھی جی کو 'منوسمرتی' کا جو نسخہ ملا تھا اس نے گاندھی جی میں لا مذہبیت کا باغیانہ رجحان پیدا کر دیا تھا۔ ان کے مذہبی رجحانات میں ایک مثبت تبدیلی اس وقت آئی جب وہ راجکوٹ جا بسے۔ یہاں دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کی ہندو روایت پر عمل کرنے کا موقع انھیں ملا اور مسلمان اور پارسی بھی ان کے دوست بنے، مثلاً الطیب (لطیف) اور عثمان بھائی کا انھوں نے خصوصی ذکر کیا ہے۔ عیسائیت ان کی پسند میں شامل نہ ہو سکی کیونکہ عیسائی مشنری شراب پلانے اور گائے کا گوشت کھلانے پر اصرار کرتی تھی۔

1888ء میں بیرسٹر کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گاندھی جی لندن جا پہنچے۔ وہاں وہ روزمرہ خورونوش کی خاطر سبزی خوروں کے قریب ہو گئے اور اس طرح روحانیت اور ہندوازم کے مطالعہ میں لگ گئے۔ لندن میں ہی گاندھی جی نے تھیوسوفی کا لٹریچر پڑھا جس میں ایڈون آرنلڈ کے نغمۂ غیبی یعنی گیتا کے ترجمہ کو وہ باقاعدگی سے پڑھنے لگے اور یہ ٹھان لیا کہ گیتا کی تعلیمات کو اپنی زندگی کے لیے نمونۂ عمل بنائیں گے۔ وہ

خوف یا طمع سے بے لوث عمل کو انسان کے اپنی منزل تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھنے لگے اور گیتا ان کی روحانی ڈکشنری بن گئی۔ گیتا کی تعلیمات کے مطابق تزکیہ نفس اور ریاضت گاندھی جی کے روزمرہ معمولات کا جزو بن گئی۔ گیتا سے ہی گاندھی جی نے اپنے سیاسی فلسفہ کی دو بنیادیں حاصل کیں: (1) عدم تشدد اور (2) ستیہ گرہ یعنی حق پر اصرار۔ لندن میں ہی گاندھی جی انجمن اسلامیہ کے اہم ممبران سے متعارف ہوئے جن میں سے مظہر الحق چمپارن ستیہ گرہ کے وقت سے ان کے قریبی ساتھی بنے رہے۔ انجمن اسلامیہ کا ماحول گاندھی جی کو اسلام کے قریب لانے کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ یہیں پر وہ کارلائل کا سیرت پر تاریخی مضمون پڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت کے معترف ہوئے۔

لندن سے بیرسٹری کرنے کے بعد گاندھی جی نے ہندوستان واپس لوٹ کر وکالت کرنا چاہی مگر یہ پیشہ انھیں مطمئن نہ کرسکا البتہ 1893ء میں وہ ٹرانسوال (افریقہ) کے ایک تاجر کے مقدمہ کے سلسلہ میں جنوبی افریقہ گئے جہاں وہ نٹال کانگریس کے ہم نوا بن گئے۔ اپنے موکل سیٹھ عبداللہ سے انھوں نے اسلام کی عملی واقفیت حاصل کی اور سیل (Seal) کا ترجمۂ قرآن اس حد تک پڑھا کہ وہ اپنی گفتگو میں قرآن سے استشہاد کرنے لگے۔ گاندھی جی مقامی مسلمانوں کے سے قربت کے باعث ٹالسٹائے فارم میں رہنے لگے جہاں وہ انھیں نماز کی پابندی اور روزوں کے اہتمام کی تلقین کرتے تھے وہ حمیدہ اسلامک سوسائٹی کے معاونین میں سے تھے اور چاہتے تھے کہ اسلام اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان بہتر رشتے قائم ہوں۔ ٹرانسوال میں گاندھی جی نے نٹال کانگریس اور انڈین فرنچائز ی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور 30 جون 1914ء کو کامیابی سے ہمکنار ہوئے جس کے بعد 18 جولائی 1914ء کو وہ انگلینڈ چلے گئے۔ ان کی نئی منزل تھی: ہندوستان کی تحریک آزادی۔

تحریک آزادی میں گاندھی جی کی جدوجہد کا آغاز تحریک خلافت کے ساتھ ان کے تعاون سے ہوا۔ حکومت پر یہ زور ڈالنے کے لیے خلافت بحال نہ کی گئی تو ہندوستان کے تمام مسلمان ہجرت کر جائیں گے۔ کانگریس اور خلافت کی مشترکہ میٹنگیں پورے ہندوستان میں ہوا کرتی تھیں، کچھ ہندو تحریک خلافت کی حمایت پر معترض تھے لیکن گاندھی جی اس حمایت کو ہوم رول کے مطالبہ سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد بھی گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ اگر انھیں پیغمبرانہ طور پر غیب سے معلوم ہو جاتا کہ اس تحریک کا یہ انجام ہوگا تب بھی وہ اس میں اسی تن دہی سے حصہ لیتے۔ وہ کہتے تھے کہ تحریک خلافت نے ہی قوم کو بیدار کیا ہے۔

یکم اگست 1920ء سے گاندھی جی نے تحریک عدمِ تعاون شروع کردی جسے خلافت کمیٹی نے تحریک ترک موالات کا نام دیا۔ 1920ء میں آل انڈیا کانگریس نے ترک موالات کے اشو پر کانگریس بلائی جس میں گاندھی جی نے ترک موالات ریزولیشن پیش کیا۔ اس کے بعد وہ تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندو-مسلم اتحاد کے لیے بھی سرگرم ہوگئے۔ گاندھی جی کا موقف یہ تھا کہ اگر ہندو چاہتے ہیں کہ مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد قائم ہو تو اقلیتوں پر اعتماد کرنے کی ہمت ان میں ہونی چاہیے۔ تحریکِ آزادی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد گاندھی جی نے اپنی شام کی پرارتھنا سبھاؤں میں تلاوت قرآن بھی شروع کی تھی لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ تقسیم ملک نے اتنا فرقہ وارانہ ماحول بنا دیا تھا کہ ایک انتہا پسند نے انھیں 1950ء کی ایک سبھا میں شہید کر دیا۔

خدمات

مہاتما گاندھی تحریک آزادیٔ ہند میں ہمہ وقت مصروف رہنے کے باوجود فکری سرگرمیوں سے زندگی بھر جڑے رہے۔ جنوبی افریقہ میں سیاسی جدوجہد کے دوران وہ انڈین اوپی نین، نامی رسالہ نکالتے تھے۔ ہندوستان میں انھوں نے 'ہریجن' نامی جریدہ شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ

انھوں نے متعدد کتابیں اور کتابچے بھی تصنیف کیے۔ ان کا ضخیم فکری سرمایہ ہندوستان میں مختلف کتابوں اور آڈیوں، ویڈیو کیسٹس کی شکل میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اس وافر سرمایہ کا خاصا حصہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی اسلام کی جزئیات کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے اور مذہباً ہندو عقائد کے پیرو ہونے کے باوجود اسلام اور اہل اسلام کے تئیں سچی ہمدردی رکھتے تھے۔ گاندھی جی بنیادی طور پر ایک مذہبی انسان تھے اور تمام انسانی اداروں کو مذہب کے پابند دیکھنا چاہتے تھے خواہ وہ ذاتی نوعیت کے ہوں یا عوامی نوعیت کے۔ وہ تمام مذاہب کے درمیان ایک ناگزیر وحدت کے داعی بھی تھے۔ ان کا موقف تھا کہ جب اپنا مذہب عزیز ہے دوسروں کا مذہب بھی اتنا ہی عزیز ہونا چاہیے۔ وہ آرزو کرتے تھے کہ ایک ہندو اور ایک بہتر ہندو ہو، ایک مسلم ایک بہتر مسلم اور ایک کرسچن ایک بہتر کرسچن ہو۔

گاندھی جی کی اسلامی فکر پر علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور سی ایف اینڈ ریوز کی اسلامی تحریروں کا اثر تھا، ان کا فلسفۂ حیات ذات باری سے وابستہ تھا اور وہ خدا کے تصور کو تمام مذاہب کی اساس قرار دیتے تھے۔ انھوں نے اسلام کی کھلے دل سے تعریف کی ہے۔ افریقہ میں جدوجہد اور تحریک خلافت وموالات کے تجربات سے انھوں نے یہ حقیقت تسلیم کی تھی کہ اسلام دوسرے مذاہب کے تئیں رواداری کی تعلیم دیتا ہے اور دوسروں کی بھلائی کرنا ہی قرآن کا اصول ہے۔ کارلائل کے زیر اثر گاندھی جی کے ذہن میں پیغمبر اسلامؐ کی تصویر ایک ایسے مذہبی نمائندہ کی تھی جسے تمام لوگوں کا اسوہ ہونا ہی چاہیے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندو عوام پیغمبر اسلام کو اسی حیثیت میں ایک قابل احترام شخصیت سمجھیں۔ وہ پیغمبر اسلام کے صبر وشکر اور ان کی قناعت سے بہت متاثر تھے۔ عبداللہ سہروردی کی کتاب The Saygs of Mohammad کے پیش لفظ میں انھوں نے فرمودات رسولؐ کو تمام نوع انسانی کے خزانوں میں شمار کیا ہے۔

گاندھی جی اپنی تقریر وتحریر میں موقع کی مناسبت سے قرآن کریم سے بھی استدلال کرتے تھے۔ گاندھی جی خاص مجلسوں میں آیات قرآنی کے معنی ومطلب بھی بیان کرتے تھے وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر قرآن بالخصوص سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے گرویدہ تھے۔ سورۂ فاتحہ میں انھیں گائتری منتر کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ مگر وہ اسلام کے تصور جہاد سے اس استدلال کی بناء پر اتفاق نہیں کرتے تھے کہ قرآن تو رحم دلی اور صبر وشکر کی دعوت دیتا ہے اور موعظت وحکمت سے لوگوں کو بلانے کے لیے کہتا تھا، پھر اس میں تشدد کہاں سے؟ وہ جہاد کی تعلیمات کو استعمار کا شاخسانہ بتاتے تھے۔

مہاتما گاندھی نے اپنی تحریروں میں اصحابِ رسول اور اہل بیت کا ذکر بھی بڑی عقیدت اور بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ وہ خلفائے راشدین بالخصوص حضرت عمرؓ سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی اس تمنا کا برملا اظہار کیا ہے کہ وہ بھی ابوبکر وعمر کی جیسی حکومت قائم کریں۔ مہاتما گاندھی خلیفۂ چہارم حضرت علی بن ابی طالبؓ کو ضبط وتحمل کا آئیڈیل قرار دیتے تھے۔ امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی تاریخی قربانیوں کو انھوں نے 'تپسیا چریہ' کا نام دیا تھا۔ امام حسینؓ کو مسلم طلبہ کے لیے مثالی کردار قرار دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے زندہ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ بہت سے صوفیوں کے ذریعہ۔ گاندھی جی اسلام کو اتنا پسند کرتے تھے کہ انھوں نے ایک جگہ ہندو عوام سے سوال کیا ہے کہ آخر ہندو لوگ قرآن کے کلام خدا ہونے میں یقین کیوں نہیں رکھ سکتے اور ہمارے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے اور محمدؐ اس کے پیغمبر ہیں۔

16.4 پنڈت جواہر لال نہرو

ملک کے اولین وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ممتاز دانشور اور معتبر تاریخ داں اور کثیر التصنیف صحافی تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں گاہے بہ گاہے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اظہار خیال کیا ہے جس سے ان موضوعات پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اگر چہ وہ ایک جدید متشکک ذہن رکھتے تھے لیکن ان کا طرز تحریر اور سلاست بیان ایک الگ ہی شان رکھتا ہے۔ نفاست و لطافت اور بانک پن اور بے ساختگی کا جتنا احساس ان کی حیات سے ہوتا ہے، اتنا ہی احساس ان کی خدمات سے بھی ہوتا ہے۔

حیات

پنڈت جواہر لال نہرو کی پیدائش 14 رنومبر 1889ء کو الہ آباد کے چوک علاقہ میں ہوئی تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو آپ کے والد اور سوروپ رانی آپ کی والدہ تھیں۔ آپ کی والدہ اور چچی بچپن سے ہی آپ کو رامائن، مہابھارت اور دیگر دیو مالائی کہانیاں سناتی رہتی تھیں کچھ بڑے ہوئے تو بدایوں کے محرر باگ منشی مبارک علی الف لیلہ اور دیگر کتابیں سنانے لگے۔ نہرو جی اس وقت گنگا اشنان اور پریاگ و بنارس کے مندروں اور سنیاسیوں کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے، لیکن پنڈت نہرو جس طرح دیوالی، دسہرہ اور جنم اشٹمی خوشی خوشی مناتے تھے اسی طرح عید کی سویوں اور محرم کے جلوس میں بھی شریک رہتے تھے۔ اس طرح ان کے گھر کا ماحول مذہبی مگر سیکولر رہتا تھا۔

بچپن میں موتی لال نہرو کا قلم چرا لینے پر پٹائی کی گئی تو باپ کا غصہ زندگی بھر یاد رہا۔ جب موتی لال نہرو نے آنند بھون خرید لیا تو نہرو بھی وہاں منتقل ہو گئے جہاں ان کی چھوٹی بہن سوروپ کی پیدائش 1900ء میں اور کرشنا کی پیدائش 1907ء میں ہوئی۔ ایک وڈوان نہرو جی کو ہندی پڑھاتا اور پنڈت گنگا ناتھ جھا انھیں سنسکرت پڑھاتے تھے۔ 1896ء میں نہرو جی کا داخلہ سینٹ میریز کونوینٹ میں ہوا۔ 1902ء میں آئرش نسل کے فرانسیسی فرڈینڈ بروکس ان کے اتالیق مقرر ہوئے جو تھیوسوفسٹ سوسائٹی کے ممبر تھے۔ ان کے توسط سے نہرو بھی تھیوسوفی کی ہفتہ واری میٹنگ میں شریک ہونے لگے اور تھیوسوفی کے اصول و نظریات میں دلچسپی لینے لگے۔ 1904ء میں بروکس کے جانے کے بعد موتی لال نہرو نے ان کا داخلہ 1905ء میں انگلینڈ کے ہیرو اسکول میں کرا دیا۔ جہاں انھیں ہندوستانی مہاراجوں کے صاحبزادگان کا قرب حاصل ہوا۔ 1907ء میں نہرو کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج کے طالب علم بنے۔

1905ء میں روس پر جاپان کی فتح سے نہرو بہت خوش تھے۔ وہ آئرلینڈ کی سن فین کے بھی مداح تھے۔ کیمبرج میں قیام کے دوران وہ انتہا پسند ہندوستانی لیڈروں سے بھی ملتے تھے لیکن ہندو احیاء پرستوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیمبرج میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان کے ساتھیوں میں سے تھے۔ کیمبرج سے گریجویشن کرنے کے بعد نہرو نے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن انٹر ٹمپل میں داخلہ لیا اور 1912ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہندوستان لوٹ کر الہ آباد ہائی کورٹ میں اپنے والد کے جونیئر بن گئے۔ 1916ء کی بسنت پنچمی کے دن نہرو جی کی شادی کملا کول سے ہوئی جن سے 9 رنومبر 1917ء کو ان کی بیٹی اندرا پریہ درشنی پیدا ہوئی۔

1917ء میں مسز اینی بے سینٹ کی گرفتاری کے بعد پر امن تحریک کے تحت موتی لال نہرو نے لکھنؤ میں ایک صوبائی کانفرنس بلائی۔ اس وقت وہ ہوم لیگ کے صدر تھے اور جواہر لال نہرو اس کے جوائنٹ سکریٹری۔ لیکن اگست 1917ء میں مانٹیگو نے ہندوستانیوں کی

نظم ونسق میں شمولیت کی پالیسی کا اعلان کر دیا اور مسز بے سینٹ جلد ہی رہا کر دی گئیں۔ اپریل 1919ء میں جلیان والا باغ کا سانحہ امرتسر میں پیش آیا اور مارشل لا لگا دیا گیا تو موتی لال نہرو نے اس کا شکار ہونے والوں کی پیروی کی پیش کش کی اور جواہر لال نہرو نے تحقیقاتی کمیٹی کی بڑی مدد کی۔ اس طرح یہ دونوں باپ بیٹے گاندھی جی کے قریب آئے۔ مئی 1920ء میں نہرو جی مسوری بدر ہو کر الہ آباد لوٹے اور ستمبر 1920ء میں گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک میں شامل ہوئے۔

فروری 1927ء میں جواہر لال نہرو نے برسلز میں نوآبادیات و امپیریلزم مخالف کانگریس کے ایک رسمی اجلاس کی صدارت کی جس میں انھوں نے ہندوستان سے متعلق قرارداد پیش کی۔ کانفرنس کے دوران نہرو نے مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، شمالی افریقہ، جنوبی وسط امریکہ، اٹلی، فرانس اور برطانیہ کے مندوبین سے ملاقات کی۔ دسمبر 1927ء کے مدراس اجلاس میں انھوں نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ 1930ء کے لاہور اجلاس میں وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ 1938ء میں نہرو یوروپ کے دورہ پر گئے اور فروری 1936ء میں کملا نہرو کے انتقال کے بعد ہندوستان لوٹے نہرو جی نے کیبنٹ مشن اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مذاکرات میں کلیدی حصہ لیا اور 1947ء میں ہندوستان کے اولین وزیر اعظم بنے۔ اسی عہدہ پر برقرار رہتے ہوئے ان کا انتقال 1964ء میں ہوا۔

خدمات

پنڈت نہرو کے افکار میموریل لکچرز، کانفرنسوں کے خطبات صدارت، سیاسی بیانات، مضامین اور منتخب تقاریر کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں جن میں انھوں نے دیگر موضوعات کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس فکری سرمایہ میں 'تلاش ہند' ان کی شاہکار کتاب ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کی ثقافتی اور سیاسی تاریخ عہد قدیم سے آزادیٔ ہند تک بیان کی ہے۔ یہ کتاب سائنسی طرز بیان اور معروضی انداز اظہار کا بہترین نمونہ ہے انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ انھیں مذہبی کتابوں سے ہمیشہ الجھن رہی کیونکہ مذہبی لوگوں کا عمل انھیں بہت مختلف اور متغائر نظر آیا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی مسائل، پر اسرار تحریروں اور ایسی کتابوں سے وحشت محسوس کرتے تھے جنھیں بے چون و چرا تسلیم کر لینا شرط اول ہو۔ فکر کی اس نہج نے نہرو جی کو اشتراکیت تک پہنچا دیا۔ جسے وہ ہندوستانی حالات میں ہندوستانی عوام کے لیے روح پرور سمجھتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب مذہب اور سائنس کی جنگ میں سائنٹفک نکتہ نظر کی فتح ہوگی۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستان میں چار بڑے مذاہب: ہندومت، بدھ مت، عیسائیت اور اسلام کی موجودگی تسلیم کی ہے۔ وہ دوسروں کے مذہب کی 'مناسب عزت' کرنے کو خود اپنے مذہب کی آبرو رکھنا قرار دیتے ہیں اور دوسروں کے مذہب کی مذمت سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ دراصل پنڈت نہرو مذہب کے مقابلہ میں روحانیت کو بڑھاوا دینا چاہتے تھے۔ انسان میں روحانی اوصاف پیدا کرنے کے مختلف طریقے وہ تسلیم کرتے ہیں لیکن ان میں سب سے مقدم طریقہ یہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی زبان کو قابو میں رکھے اور لا ابالی پن اور بے ضرورت گفتگو سے بچے تا کہ سعادت سے ہمکنار ہو۔

پنڈت جواہر لال نہرو شمال مغرب سے آنے والے مسلمانوں کو حملہ آور تو کہتے ہیں لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا یا اسلام کوئی غیر روادار مذہب ہے۔ انھوں نے ہندوؤں کی اس غلط فہمی کی طرف اشارہ کیا ہے جو مسلمان جابروں کی فہرست میں چنگیز

خاں، محمود غزنوی اور تیمور کا نام لیتے ہیں۔ حالانکہ چنگیز خاں تو سرے سے مسلمان ہی نہیں تھا اور محمود غزنوی نے تو خود خلیفۂ وقت کو دھمکی دی تھی اور تیمور مغربی ایشیا میں جو اس دور میں اشاعت اسلام کا مرکز تھا، انسانی سروں کا مینار بنایا کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ پنڈت نہرو نے اسپین کی تاریخ کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ وہاں کے عیسائی بادشاہ نے عربوں کے خلاف جو خاص الزامات لگائے تھے، ان میں یہ بھی تھے کہ یہ سامی مسلمان بہت زیادہ رواداری دکھاتے ہیں اور صفائی ستھرائی پر بڑا دھیان دیتے ہیں۔ نہرو لکھتے ہیں کہ کوئی بڑا مذہب لوگوں کا عقیدہ زبردستی بدل ڈالنے کی وجہ سے نہیں پھیلا۔ ہندوستان میں قبول اسلام کے لیے وہ ہندو سماج میں پھیلی برائیوں مثلاً ذات پات کی تفریق، چھوا چھوت اور مذہبی و سماجی غلو پسندی کو شمار کرتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے برعکس مسلمان اخوت اور علمی مساوات کا نظریہ رکھتے تھے جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اپنا مذہب ترک کر کے نئے مذہب کے پیرو بن گئے جن کی اکثریت نیچ ذات کے لوگوں پر مشتمل تھی، اگرچہ ان نومسلموں میں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے سیاسی اور اقتصادی مصالح کے پیش نظر اسلام قبول کیا تھا۔ بہر حال وہ اسلام کی خوبیوں میں سادگی، صفائی، جمہوری اصول، اخوت اور مساوات کو شامل سمجھتے ہیں۔

پنڈت نہرو حضرت محمدؐ کو اسلام کا بانی بتاتے ہیں جو دوسرے مذاہب کے بانیوں کی طرح اپنے عصر کی بہت سی سماجی برائیوں کے خلاف صف آراء تھے۔ نہرو جی نے ابوبکر و عمر کے دور تک کی اسلامی تاریخ مختصراً بیان کی ہے اور بہت سی اسلامی شخصیات پر اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن ان تاریخی شخصیات کے مقابلہ میں وہ جدید اور سیکولر لوگوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان میں سے تین افراد اکبر، سرسید اور اتاترک کا انھوں نے خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اکبر مطلق العنان تھا لیکن اس کی مذہب بیزاری اور عقل پسندی پنڈت جواہر لال نہرو کو بہت پسند تھی۔ ان کے نزدیک اکبر نے راجپوتوں سے شادیاں کر کے ہم آہنگی کی مثال قائم کی تھی۔ پنڈت نہرو سرسید کو حکومت برطانیہ کا 'آلۂ کار' سمجھتے ہیں مگر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم دلانے کے لیے تھیں جن کے بغیر جدید طرز کی قومیت کو پروان چڑھانا ممکن نہیں تھا۔ قومیت سے متعلق دوسرا اہم کردار تھا مصطفیٰ کمال پاشا جو اپنی قوم کا ہیرو بن گیا تھا اگرچہ وہ ٹھیٹھ دنیادار اور سیاسی چالوں کا ماہر تھا۔ پنڈت نہرو نے ستائش کے ساتھ لکھا ہے کہ اس نے کس طرح آغا خاں کے انگریزوں کا ایجنٹ ہونے کا پروپیگنڈا کرایا اور پھر آئین ساز مجلس سے انہدام خلافت کا بل منظور کر لیا۔

پنڈت نہرو قومیت کو تہذیب کی اساس بتاتے ہیں نہ کہ مذہب کو اور اس بناء پر وہ ہندوستان میں 'دو قومی نظریہ' کی سختی سے تردید کرتے ہیں اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے اٹل داعی ہیں۔ اس مسئلہ پر ڈاکٹر اقبال کے ساتھ مراسلت میں انھوں نے سوال کیا ہے کہ کیا مسلمانوں اور سکھوں یا ہندوؤں اور ہندوستانی عیسائیوں کے درمیان بایولوجی کے رو سے کوئی فرق پایا جاتا ہے؟ پنڈت نہرو مسلم قومیت کی سرے سے نفی کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عرب جو تہذیب اپنے ساتھ لے کر دوسرے ملکوں میں گئے، اس پر اسلامی عقائد کا نقش ضرور تھا مگر اسے اسلامی تہذیب کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ پنڈت نہرو مسئلہ فلسطین کو ایک اسلامی مسئلہ بھی نہیں سمجھتے بلکہ اسے عربوں اور یہودیوں کا مسئلہ کہتے ہیں۔

فرقہ واریت کا آغاز پنڈت نہرو کے نزدیک اس وقت ہوا جب اسلام کو سیاسی غلبہ حاصل ہوا۔ مغل بادشاہ اکبر نے فرقہ واریت کی جگہ یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہندو اور مسلم، دونوں فرقوں میں فرقہ واریت آج تک پائی جاتی ہے۔ وہ فرقہ واریت کے ازالہ کی ذمہ داری ہندوؤں پر زیادہ ڈالتے ہیں کیونکہ مہا سبھا جیسی فرقہ پرست پارٹیاں مسلمانوں میں ہندوؤں کے تئیں مسلمانوں کا اعتبار کم کر دیتی ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہے کہ وہ اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اقلیتوں کے لیے دستوری تحفظات کی حمایت کی۔

معلومات کی جانچ

(1) گاندھی جی کی شخصیت کی تشکیل کن کتابوں کی روشنی میں ہوئی؟

(2) گاندھی جی نے تحریک خلافت کا ساتھ کیوں دیا؟

(3) پنڈت جواہر لال نہرو کی پرورش اور تعلیم کیسے ماحول میں ہوئی؟

(4) تحریکِ آزادی میں نہرو جی نے کیا رول ادا کیا؟

3.5 مالک رام

مالک رام بویجہ غالبیات کے سب سے بڑے ماہر اور بلند پایہ محقق تھے۔ جنھوں نے اپنی تحقیقات سے اردو ادب کو پروقار بنایا، تذکرہ نگاری میں کئی سنگ ہائے میل قائم کیے اور اسلامیات پر بھی اس تحقیقی انداز سے کام کیا کہ بڑے بڑے علمائے اسلام نے ان کے تبحر علمی کا لوہا مان لیا۔ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ان کی نگارشات آج بھی ان موضوعات کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ عرش ملسیانی نے ان تصنیفات/تالیفات کی فہرست مرتب کی ہے جس میں گیارہ موضوعات کے تحت 139 کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اسلامیات کے میدان میں مالک رام کی دو کتابیں: 'اسلامیات' اور 'عورت اور اسلامی تعلیم' ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں اور اسلامیات کے طلبہ کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

حیات

مالک رام بویجہ کا سفر حیات پاکستان کے ضلع گجرات کی پھالیہ تحصیل کے ایک بویجہ کھتری گھرانہ میں 22 دسمبر 1906ء کو شروع ہوا تھا۔ ان کے والد لالہ نہال چند ایک تعلیم یافتہ شخص تھے اور ان کی والدہ منڈی بہاء الدین کی ایک تھانہ دار خاتون تھیں۔ جب مالک رام صرف بارہ دن کے تھے، ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو اس طرح ان کی زندگی کا سفر گاؤں والوں کے تعاون سے ماں کی ممتا کے سہارے شروع ہوا۔ مالک رام جب چار برس کے ہوگئے تو انھیں پھالیہ کے گورودوارہ میں داخل کیا گیا جہاں پرانے زمانہ کا مکتبی نظام رائج تھا۔ گرودوارہ میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے گھر پر رہ کر اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کر چکے تھے اور معمولی انگریزی سے بھی واقف تھے۔ گرودوارہ میں ہی مالک رام نے ابتدائی تعلیم کا مرحلہ پورا کیا۔ جس کے بعد وہ ضلع کے سب سے اچھے اردو میڈیم اسکول میں داخل ہوئے جو تحصیل کے صدر مقام پر واقع تھا۔ مالک رام چھ برس کی عمر میں مڈل اسکول میں داخل ہوئے اور انھوں نے 1912ء میں چودہ سال کی عمر میں مڈل کا امتحان پاس کر لیا۔

1922ء میں جونیئر اور سینئر اسپیشل امتحانات پاس کر لیے۔ حکومت پنجاب کے ایک فیصلہ کے تحت صدر ضلع گجرات کے گورنمنٹ ہائی اسکول کو انٹر کالج بنا تو مالک رام وزیر آباد سے گجرات پہنچ گئے۔ 1926ء میں مالک نے گجرات کے انٹر کالج سے اول درجہ میں انٹر کا امتحان پاس

کرلیا۔ گریجویشن کرنے کے لیے انھوں نے ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لے لیا جہاں سے انھیں 1928 میں بی اے کی اور 1930ء میں ایم اے کی ڈگریاں مل گئیں۔

مئی 1931 میں مالک رام کی شادی ایک گھریلو خاتون شریمتی وِدّیاوتی سے ہوئی۔ مالک رام چونکہ سیکولر ذہن رکھتے تھے اس لیے جب شریمتی وِدّیاوتی سے ان کی اولادیں پیدا ہوئیں تو انھوں نے ان کے نام بھی سیکولر رکھے، بیٹوں کے نام آفتاب اور سلمان اور بیٹیوں کے نام اوشا، ارونا اور بشریٰ۔ اس طرح وسیع المشربی ان کے خانگی ماحول کا جزو بن گئی۔ وہ ذاتی طور پر انتہائی خلیق اور متواضع تھے۔ اور غصہ پی جاتے تھے۔ مذہبی امور کی پاسداری کرتے تھے اور دروغ گوئی سے انھیں بے انتہا نفرت تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی کبھی بھی شراب نہیں پی۔ صبح کی چائے کے عادی تھے مگر سگریٹ سے انھیں کراہت تھی۔

مالک رام اپنی طالب علمی کے دور میں ادبی دنیا سے منسلک ہو چکے تھے۔ اس وقت ان کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز شہر گجرات کے بازار کی ایک دوکان تھی جہاں 'افکار'، 'ریاست'، 'نیرنگ خیال' اور دیگر ادبی رسائل کے گرد ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ادبی مذاکرے اور مباحثے ہوا کرتے تھے جن میں مالک رام بھی شرکت کرتے تھے۔ شعری اُپج کی آبیاری کے لیے شہر میں ایک ہفتہ واری طرحی نشست ہوا کرتی تھی جن میں مالک رام بھی غزلیں پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں ان کی بعض تحقیقات 'نیرنگ خیال' اور 'افکار' جیسے معیاری جرائد میں شائع ہوئی تھیں۔ 1946ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد لاہور گئے تو 'نیرنگ خیال' میں کام کرنے کی پیش کش کی گئی۔ مالک رام نے اس جریدے کے لیے انتخاب اور نظرِ ثانی کا کام کیا۔ اور اپنے حواشی کے ساتھ اقبال کی ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بیخودی'' کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ 1932ء تا 1936 کے عرصہ میں انھوں نے نیرنگ خیال کی ادارت بھی سنبھالی اور آریہ گزٹ کے مدیر بھی رہے۔ 1936 میں مالک رام روزنامہ 'بھارت ماتا' سے جڑے لیکن یہ اسی سال بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ساہتیہ اکادمی کے لیے مولانا آزاد کی تخلیقات کی ترتیب و تدوین کے کام میں لگ گئے۔

1932ء کے آس پاس مالک رام گھومنے کی غرض سے دہلی آئے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ 1936ء میں روزگار کی تلاش میں آئے۔ مالک رام نے دہلی میں 'علمی مجلس' نامی انجمن قائم کی تھی اور ادبی رسالہ 'تحریر' شروع کیا تھا۔ 1936ء میں مالک رام کو ہوم ڈپارٹمنٹ کے محکمہ اطلاعات میں ملازمت تو مل گئی لیکن کام مزاج کے موافق نہیں تھا۔ ایک سال بعد انھوں نے جالندھر کو ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر لی لیکن اس شہر کی بے کیفی راس نہیں آئی۔ 1938ء میں انھوں نے جب ظفر اللہ خاں سے ملازمت کی درخواست کی تو انھیں مصر کے لیے ایک اسامی کی خاطر درخواست کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ مالک رام اپنے تجربہ کی بنیاد پر اس کام کے لیے موزوں سمجھے گئے اور مقرر کر لئے گئے۔ یکم اگست 1939ء سے انھیں اسکندریہ میں حکومت ہند کے ٹریڈ کمشنر کے دفتر میں سپرنٹینڈنٹ بنا دیا گیا اور آزادیٔ ہند کے بعد جب انڈین فارن سروس کی تشکیل ہوئی تو مالک رام اس میں منتخب ہو گئے۔

فارن سروس کی ملازمت میں رہتے ہوئے مالک رام مصر، عراق، ترکی اور بلجیئم گئے۔ 1939ء سے 1950ء کا عرصہ انھوں نے مصر میں ملازمت کرتے ہوئے گزارا۔ اپریل 1964ء میں مالک رام دلّی واپس آ گئے۔ فارن سروس کے دوران مالک رام نے لبنان، فلسطین، افغانستان، فرانس، انگلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور سوئزرلینڈ کے دورے کئے۔ اور روس کے کتب خانوں اور عجائب گھروں کی سیر بھی کی۔ وہ حکومت

ہند کی ملازمت سے 1965ء میں سبکدوش ہوئے۔

مالک رام کا اصل جوہر تو تحقیق اور اسلامیات کے میدان میں کھلا۔ محققین کے حلقہ میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی اور مختار الدین احمد، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر محمد باقر ان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اسلامیات کے میدان میں ان کے تعلقات صباح الدین عمر اور پروفیسر آصف علی کے ساتھ بھی تھے۔ اسلام سے ان کا رشتہ بچپن میں جڑ گیا تھا۔ جماعت احمدیہ کے پیرو ملک احمد حسن روہتاسی نے انھیں اسلامی لٹریچر سے متعارف کرایا تھا۔ 'بھارت ماتا' چھوڑنے کے بعد وہ شملہ میں ظفر اللہ خاں کے مہمان بنے تھے جہاں انھوں نے قرآن کے سترہ پارے ترجمہ کے ساتھ پڑھے تھے۔ ملازمت کے دوران شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے اسلامی ممالک میں رہ کر انھیں عربی پڑھنے اور سیکھنے کے مواقع ملے۔ ذاتی مطالعہ اور فراست نے اسلامیات کا ماہر بنا دیا۔ وہ خود لکھتے ہیں: ''اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ تم نے تفسیر و حدیث کی کون کون سے کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، تو یہ حقیقت ہے کہ میں ان سب کتابوں کے نام بھی نہیں گنوا سکوں گا۔'' یہاں تو نصف صدی کا قصہ ہے۔

خدمات

مالک رام کی مشہور تصنیفات/تالیفات ہیں: (1) ذکر غالب (2) تلامذۂ غالب (3) عیار غالب (4) نذر عرشی (5) نذر ذاکر (6) افکار محروم (7) بابلی تہذیب (8) تذکرۂ ماہ و سال اور (9) ادبائے اردو وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ ان کی کل کائنات فکر و فن نہیں ہے۔ مالک رام متنوع المضامین اور ہمہ جہت مصنف اور مؤلف تھے۔ وہ ہمیشہ نئے میدان کار کی تلاش میں رہتے تھے اور ان کی یہ ذہنی تلون مزاجی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں ان کی بہت سی نگارشات پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔ پھر بھی ان کی 112 نگارشات کی فہرست موجود ہے۔ اس طویل فہرست میں درج تصنیفات/تالیفات میں ان کی کاوشوں کو تین اقسام کا ذکر ناگزیر ہے: (1) تحقیقات (2) تذکرے اور (3) اسلامیات۔ ان کے دائرۂ تحقیق میں ادبی اور تاریخی موضوعات خاص طور سے شامل تھے۔ مالک رام نے ادبی میدان میں غالب پر اتنی توجہ دی کہ ان کو عام طور پر غالبیات کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے غالب سے متعلق تقریباً چار درجن کتابیں تصنیف کیں۔ تاریخی تحقیقات کے میدان میں بھی مالک رام نے متعدد شاہکار پیش کئے ہیں جن میں بابلی تہذیب اور ہندوستان کے عہد عتیق کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ بابلی تہذیب سے متعلق ان کی چھ کتابیں اردو زبان میں بہترین حوالہ سمجھی جاتی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے قدیم ہندوستان سے متعلق چار گراں قدر کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔

مالک رام نے اردو تذکرہ نگاری کو ایک نئی جہت بخشی۔ ان کے تذکرے اس معنی میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں کہ ان سے جہاں تاریخ کے بہت سے واقعات کی یاد تازہ ہوتی ہے، وہیں مسلم سماج اور شخصیات نیز اردو تہذیب سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مالک رام نے ان تصنیفات میں ستر سے زائد مختلف نامور شخصیات کی وفات پر ان کے حالات زندگی اور اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔

اسلامیات مالک رام صاحب کا اختصاصی موضوع ہے اور یہ اسلام اور اسلامی تاریخ تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی جزئیات بھی اس میں شامل ہیں۔ ان کی علمیت اور ذہانت کے ساتھ ساتھ ان کی تحقیق کا بے لاگ انداز اور بے تعصبی ہر حلقہ میں مقبول و معتبر ہے۔ اسلامیات کا شوق تو اوائل عمر میں ہی پڑ چکا تھا، ملازمت کے دوران مالک رام نے اس کا علم بھی حاصل کر لیا اور اس کام میں انھوں نے دیگر مصنفین سے بھی استفادہ کیا۔ اس طرح مالک رام کے اندر خدا اعتمادی کے ساتھ خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ تقریباً نصف صدی کے ذاتی مطالعہ نے انھیں

آزادانہ غور وفکر کی منزل تک پہنچا دیا۔

اسلامیات کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ان کی دو کتابوں: ''اسلامیات'' اور ''عورت اور اسلامی تعلیم'' کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی اہل علم نے بڑے پیمانہ پر پذیرائی کی تھی اور آج بھی یہ کتابیں اسلامیات کے ادب عالیہ میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔ 'اسلامیات' صرف 184 صفحات پر مشتمل مختصر سا کتابچہ ہے جس کے کل چھ مضامین جو مالک رام صاحب نے اپنے احباب کی درخواست پر لکھے تھے، ہندوستان کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ 'اسلامیات' میں شامل ایک مضمون مالک رام کی دوسری کتاب 'عورت اور اسلامی تعلیم' کا تتمہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں کتابیں مل کر اسلام کی بنیادی واقفیت کی تکمیل کرتی ہیں۔

'اسلامیات' کا پہلا مضمون ہے 'لا الہ اللہ محمد رسول اللہ' جس میں مالک رام نے اسلام کے پہلے کلمہ یعنی کلمہ طیبہ کی بہترین تشریح سیدھے سادہ جملوں میں منطقی انداز سے کی ہے۔ پوری بحث کا مرکزی نکتہ رب العالمین کی وحدانیت ہے۔ کلمہ طیبہ کا دوسرا 'محمد رسول اللہ' دراصل یہ کہتا ہے کہ آج کے دن کے بعد وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہیں کرے گا حتی کہ محمد رسول اللہ کی بھی نہیں۔ مالک رام صاحب نے اس اسلام کے چھ اصولوں کی شناخت کی ہے: (1) ان دیکھے خدا پر ایمان (2) صرف اسی کی عبادت، (3) مادی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی صلاحیتیں اس کی راہ میں صرف کرنا (4) قرآن کی تعلیمات پر ایمان (5) ماضی نازل شدہ وحی پر ایمان اور (6) یوم آخرت کا یقین۔

'اسلامیات' کا دوسرا مضمون ہے 'اسلام' جو رب کی تشریح سے شروع ہوتا ہے۔ پورے عالم انسانیت کی وحدت کے لیے مالک رام صاحب نے تین اصول بتائے ہیں: (1) خدائے وحدہ لاشریک لہ کے علاوہ اور کسی کی بھی عبادت نہ کرنا، (2) اس معبود مطلق کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرنا اور (3) انسانوں کے باہمی برتاؤ میں کسی انسان کو اپنا پالن ہار نہ سمجھنا۔

اسلامیات کا تیسرا مضمون ہے 'اسلامی خلافت' جس میں انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اسلام جمہوریت ہے یا نہیں؟ مالک رام صاحب نے خلافت کی غرض وغایت کے ساتھ خلیفہ کے فرائض اور اس کی صفات اور خلفائے راشدین کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ خلافت کے ضمن میں ایک اہم بحث 'شوریٰ' کی ہے۔

اسلامیات کا چوتھا مضمون ہے 'خلق عظیم' جس میں رسول اللہؐ کے امتیازی اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ مالک رام صاحب نے رسول اللہؐ کے معاندین میں مشرکین مکہ، یہود اور منافقین کی نشاندہی کی ہے۔ جو اسلام کی بنیادی تعلیمات: توحید، یتیم ومسکین کی مدد اور آخرت کی ہر ممکن مخالفت کرتے تھے۔

اسلامیات کا پانچواں مضمون ہے 'وافصح العرب' اس مضمون میں رسول اللہؐ کے انداز ترسیل اور طریقۂ تعلیم وتربیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مالک رام صاحب نے احادیث رسول کی چار اصناف بیان کی ہیں۔ (1) قانونی دستاویزات (2) تبلیغی خطوط۔ (3) خطبات اور (4) روزمرہ کی عام باتیں۔

'اسلامیات' کا آخری مقالہ ہے 'عورت مذاہب عالم میں' جس میں مالک رام نے ہندو دھرم، یہودیت، نصرانیت اور اسلام میں خواتین کے وقار ومرتبہ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

مالک رام کی دوسری کتاب 'عورت اور اسلامی تعلیم' دراصل 'افکار' (لکھنؤ) کے لیے لکھے گئے ایک مضمون 'اسلام اور عورت' پر مبنی ہے۔ ان کی اس تصنیف کو بھی علمائے اسلام کے حلقوں میں ان کی وسیع النظری اور دقت تحقیق کی بناء پر پسند کیا گیا تھا۔ کتاب کے ترجمے انگریزی اور عربی زبان میں بھی ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے پانچ ابواب ہیں: (1) بیٹی (2) بیوی (3) ماں (4) مطلقہ بیوہ اور (5) وراثت جو گویا کہ خاتون اسلام کی تاریخی حیثیتیں ہیں جن میں اس کی ایک 'بہن' اور ایک 'دوست' ہونے کی حیثیت نظرانداز کر دی گئی ہے۔ کتاب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ہر باب سے متعلق فقہی احکامات براہ راست قرآن کریم یا احادیث صحیحہ کی روشنی میں درج کیے گئے ہیں۔ اگر چہ ان کی فکر میں بعض کمزور مقامات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ لیکن مالک رام کی بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ وہ کسی کا بھی احساس ہو جانے کے بعد بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کی اصلاح کرنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ ان کے قلم نے اسلامیات کو یقیناً مزید بارآور بنایا ہے اور بحث و نظر کی نئی راہیں کشادہ کی ہیں۔

16.6 ڈاکٹر تاراچند

ڈاکٹر تاراچند ایک معروف ماہر آثار قدیمہ اور معلّم تھے۔ انھوں نے قدیم تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے مطالعہ میں ممتاز مقام حاصل کیا تھا۔ ڈاکٹر تاراچند اشتراکی فکر کے حامل تھے لیکن ان کا نکتۂ نظر قوم پرستانہ اور علم دوست تھا۔ انھوں نے ایک سفارت کار اور ایک دانشور کی حیثیت سے بھی اپنا مقام پیدا کیا تھا۔ انھوں نے جس دانشوری کے ساتھ ہندو مذہب و ثقافت کو پیش کیا ہے، اتنی ہی فراست و دیانت کے ساتھ مسلم افکار و رجحانات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تاحیات اپنی تحریروں کے ذریعہ اس فکر کی ترویج کرتے رہے کہ ہندوستان مشترکہ کلچر کا نمائندہ ہے۔

حیات

ڈاکٹر تاراچند نے ایم اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تھی۔ ابتدا میں ان کا تقرر الہ آباد کے پاٹھ شالا کالج میں 1913ء سے لے کر 1918ء تک پروفیسر عہدہ پر رہے۔ جس کے بعد وہ اسی سال پرنسپل بنے اور 1940 تک اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر تاراچند ر1945ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ پولیٹیکل سائنس میں اپنے سینئر ڈاکٹر بنی پرشاد کے سبکدوش ہونے کے بعد اس شعبہ کے سربراہ بنے اور 1947 تک اسی عہدہ پر اپنے فرائض نبھاتے رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کا ایک ہوسٹل انہی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان کے نام سے یونیورسٹی کے سابق طلبہ کی تنظیم ہونہار طلبہ کو سالانہ اسکالرشپ بھی دیتی ہے۔

1948ء میں سفارتکاری اور بین الاقوامی تعلقات کی تربیت دینے کے لیے الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ سیاست کو ترقی دی گئی تو ڈاکٹر تاراچند کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ حکومت ہند کے تعلیمی مشیر مقرر ہوئے۔ جنوری 1948ء میں ڈاکٹر تاراچند نے حکومت ہند کی کمیٹی برائے ثانوی تعلیم کے سربراہ کی حیثیت سے ثانوی تعلیم کے مقاصد، مدت تعلیم، درجات، قومی زبان اور انگریزی سے متعلق اہم فیصلے کر کے کمیٹی کی رپورٹ پیش کی۔ 1951ء میں حکومت ہند کے سفیر ایران بن کر انھوں نے تہران اور دلی کے تعلقات بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے کئی کام کیے۔ اس کے بعد انھیں ہندوستانی راجیہ سبھا کے لیے منتخب کیا گیا۔

ڈاکٹر تاراچند اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف اور پبلک لکچرز میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی بہت سی

کتابوں اور لیکچرز کا ترجمہ اردو زبان کے مشہور دانشوروں نے کیا ہے۔ وہ اسلام کو ہندوستان کے مشترکہ کلچر کا ضروری عنصر سمجھتے تھے۔

خدمات

2003ء تک ڈاکٹر تاراچند کی تقریباً ایک درجن کتابیں طبع ہو چکی تھیں۔ جن میں اکثر کتابیں تعلیم اور نفسیات یا ہندوستانی کلچر سے متعلق تھیں۔ ان کی دو کتابیں: اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، اور تحریک آزادی ہند شہرۂ عام حاصل کر چکی ہیں ان دونوں کتابوں میں ڈاکٹر تارا چند نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے رول پر خصوصی زور دیا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند کی تحریروں کو ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودگی کے باب میں استناد اور قبول عام کا درجہ حاصل ہے۔

ڈاکٹر تاراچند بتاتے ہیں کہ قومیت کا تصور اگرچہ 15ویں صدی میں مغربی ممالک میں آنے والی سماجی، صنعتی اور سیاسی تبدیلیوں کے پس منظر میں ابھرا لیکن 18ویں صدی کے آخر تک اس نے انگلینڈ، فرانس، جرمنی اور اٹلی سے آگے بڑھ کر ایشیا کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا اور 20ویں صدی میں تو یہ ایک عالم گیر تصور بن گیا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند قومیت کو نسل و زبان سے ماوراء اور اعداد و شمار سے آزاد بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک قومیت کسی سماج کے افراد کی ذہنی ہم آہنگی سے تشکیل پاتی ہے۔ جو آپس میں مل جل کر رہنے، باہمی مفادات کو فروغ دینے اور آزاد متحدہ حکومت قائم کرنے کے جذبہ سے وجود میں آئی ہے۔ اس مطلوبہ اتحاد کی راہ میں تین طرح کی رکاوٹیں آتی ہیں: (1) قبائلی اور علاقائی خودمختاری (2) لسانی اور ثقافتی نیرنگی اور (3) مذہبی اکثریتیں۔ پہلا مسئلہ طاقت یا باہمی رضامندی کے ذریعہ حل کیا جاتا ہے۔ دوسرا مسئلہ وقت گزرنے کے ساتھ تحلیل ہو جاتا ہے۔ لیکن تیسرا مسئلہ سب سے مشکل ہوتا ہے اور سیاسی استحصال کا سبب بھی بنتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ قومی بیداری کا کوئی میکانزم موجود ہو اور حرکت میں رہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ مذہبی رکاوٹ کا حل ہے سیکولرزم، جس کی اساس اس عقیدہ پر قائم ہے کہ تمام مذاہب کو یکساں احترام کے قابل سمجھا جائے اور عوام میں امن، خیر سگالی اور اخوت کو فروغ دیا جائے۔

ڈاکٹر تاراچند ہندوستانی تمدن کو فطرتاً مرکب بتاتے ہیں جس کی تشکیل مختلف جماعتوں، عقائد، رسوم و رواج اور فنون و فلسفہ نے مل کر کی ہے ان عناصر کو متحد رکھنے سے ہی ہندوستانی نظام زندہ اور مائل بہ ترقی رہ سکے گا جبکہ آج کا ہندوستان مشترکہ قومیت کے تصور سے برسرپیکار ہے۔ جب قومی شعور جڑیں پکڑ لیتا ہے تو معاشرہ کا ہر رکن اپنی قوم کی ہیئت کے مطابق خود بخود اپنی ذمہ داری اور خودمختاری کی حدود طے کر لیتا ہے اور پھر پورا سماج جماعت کی آرزوؤں کی تکمیل میں لگ جاتا ہے۔ اس شعور کی بیداری کے لیے ترقی پسند سماجی قوتوں کا تعاون ناگزیر ہے۔

اپنی کتاب 'اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر' میں ڈاکٹر تاراچند نے ہندوستان کی ثقافتی تاریخ اسلام کی آمد سے قبل دور سے شروع کر کے سولہویں صدی کے ہندو مصلحین کی تاریخ تک بیان کی ہے۔ کتاب کے تین ابواب کو چھوڑ کر باقی مواد ہندو کلچر سے بحث کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تاراچند ہندو ذہن کو کائنات کی پہیلیوں میں الجھا ہوا وحدت کا متلاشی ذہن بتاتے ہیں جو حصول علم نہیں بلکہ حصول عرفان کے لیے سرگرم ہے۔ ہندو ذہن نے اس کام میں یوگ سے مدد لی ہے جس کا مقصد ورزش اور جس کے ذریعہ جسم کو مسخر کر کے پانچ نیکیوں: عدم تشدد، سچائی، تصوف بے جا سے پرہیز، شہوانی خواہشات سے بچاؤ، حرص و ہوس سے کنارہ کشی اور مراقبہ کے ذریعہ روحانی سرگرمیوں کو بڑھانا

ہے۔ یوگ ہندوستانی فلسفہ سے علاقہ رکھتا ہے اور فلسفہ فنون لطیفہ یعنی سنگ تراشی، مصوری، شاعری، موسیقی اور رقص سے۔ جب ہندو راجگان خود پسندی اور غرور کے شکار ہو گئے اور سماج میں ذات برادری کی دیواریں کھڑی ہو گئیں تو ہندو مصلحین نے اس صورت حال کی اصلاح کی کوشش کیں اور ہندو مذہب کا پھر سے احیاء کیا۔

ڈاکٹر تاراچند ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودگی 7 ویں صدی عیسوی سے بتاتے ہیں۔ اس وقت مسلمان ہندوستان کے مشرقی گھاٹ پر آباد تھے۔ جہاں آج بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسلمان مغربی کنارے تک 8 ویں صدی میں پہنچے اور تیزی کے ساتھ پورے ساحلی علاقے میں پھیل گئے۔ یہ مسلمان عربی النسل تھے۔ انہوں نے مسجدیں اور مزارات کی تعمیر کی اور اسلام کی تبلیغ واشاعت شروع کی۔

ہندوستان میں تصوف نے ہندو روایات بالخصوص یوگ اور اشراقیت کا اثر بھی اپنے رنگ میں انگیز کیا لیکن اس کے ساتھ ہی رواداری اور اخوت انسانی کو مثالی فروغ دیا۔ صوفیائے کرام نے عشق خداوندی اور مساوات انسانی کی ایسی پر اثر تحریک چلائی کہ یہاں کے عوام کے ذہنوں میں ہلچل پیدا کر کے ہندوستان کی مذہبی اور سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اگر چہ علماء وفقہاء کا ایک طبقہ یہاں بھی عرب سماج کے قوانین ورسومات کے ذریعہ سماج اور ریاست کا کردار طے کرنا چاہتا تھا لیکن جیت صوفیائے کرام کی ہوئی جنھوں نے دستور محبت وضع کر کے رواداری اور میل ملاپ کی روایت کو تازہ کیا۔ یہ انہی کے زیر اثر تھا کہ ہندو اور مسلم تہذیبوں کے سنگم سے ہندوستان کی نئی مشترکہ تہذیب وجود میں آئی۔ ان تبدیلیوں میں جہاں کبیر، نانک، چیتنیہ، سور اور تلسی کی اصلاحی کوششوں کا دخل تھا، وہیں معین الدین چشتی، فریدالدین گنج شکر، نظام الدین اولیاء، بندہ نواز گیسو دراز اور دیگر صوفیاء کی جاں سوزیاں اور شیریں کلامیاں بھی شامل تھیں اور یہ سلسلہ راجہ رام موہن رائے اور سید احمد خاں سے لے کر رابندر ناتھ ٹیگور، موہن داس کرم چند گاندھی اور محمد اقبال تک چلتا رہا۔

ڈاکٹر تاراچند کی ایک اور معرکۃ الآراء کتاب ہے 'تاریخ تحریک آزادئ ہند' جو چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ پہلی جلد کے 8 ویں باب میں شاہ ولی اللہ کے بعد ابھرنے والی مسلم سیاسی فکر کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے تین مسلم طبقات کی نشاندہی کی ہے: (1) علماء، (2) قوم پرور سیاستداں اور (3) قوم پرست سیاستداں۔ علماء کے سامنے حالات کا مقابلہ کر کے آزادی حاصل کرنے کا راستہ ہی باقی بچا تھا لیکن انھیں جلد ہی احساس ہوا کہ انگریزی کی تعلیم حاصل کر کے مسلمان تجارت اور ملازمت میں قدم جما سکتے ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز کی حمایت کے بعد نواب عبداللطیف اور سرسید احمد خاں نے یہ کام شروع کیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے فرقہ پرور طبقہ میں علمائے دیوبند اور علامہ شبلی کے رول کا جائزہ لیا ہے۔ قوم پرور مسلمان انڈین نیشنل کانگریس کے ہمنوا تھے، مثلاً بدرالدین طیب جی، حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبیداللہ سندھی اور حبیب الرحمٰن شاہ۔ لیکن قوم پرستوں کا ایک دوسرا گروہ احیائے اسلام کی بات کرتا تھا اور مغرب سے مشرق آنے والے نیشنلزم کے سیلاب کو سائنس اور فنی مہارت کے ذریعہ روکنا چاہتا تھا تا کہ عظمت اسلامی والی عملی زندگی مستحکم ہو۔ اس گروہ میں سید جمال الدین افغانی کی رہنمائی میں علامہ اقبال اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی شامل تھے۔ جو مذہب کو سیاست سے جدا کرنے کے مخالف تھے۔ ڈاکٹر تاراچند نے اس کتاب میں ہندوستانی زندگی کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی پہلوؤں سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے جس میں ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے جزوی باتیں کہی گئی ہیں۔

معلومات کی جانچ

(1) مالک رام نے اسلام کا مطالعہ کس طرح کیا؟

(2) مالک رام کو غالبیات کا امام کیوں سمجھا جاتا ہے؟

(3) ڈاکٹر تاراچند ایک معلم سے سفارتکار کیسے بنے؟

(4) ڈاکٹر تاراچند کس فکری رجحان کے نمائندہ تھے اور کیوں؟

16.7 پنڈت سندرلال

گاندھی جی کے معتمد سندرلال قانون گو کو پنڈت جواہر لال نہرو اور تیج بہادر سپرو نے 'پنڈت' کا لقب دیا تھا۔ وہ فرقہ وارانہ خیر سگالی اور ہندو مسلم اتحاد میں غیر متزلزل یقین رکھنے والے قوم پرست تھے۔ انھوں نے ایک صحافی اور مصنف کی حیثیت سے حقائق کو جس بیبا کی کے ساتھ پیش کیا ویسی ہی ایمانداری انھوں نے اپنی تاریخ نویسی میں بھی دکھائی۔ ان کی تحریروں میں ان کے لہجے کے خلوص اور ان کے اظہار و بیان کی متانت کی داد دینی چاہیے۔ ایک محبِّ وطن کی حیثیت سے وہ سب کی بھلائی میں یقین رکھتے اور فکر و خیال کی محفلیں گرم رکھنے کی بجائے عملی اقدامات پر بھروسہ کرتے تھے۔ ستیہ گرہ اور اہنسا کا یہ بھگت بین الاقوامی سیاست کا بھی شاہد تھا۔

• حیات

پنڈت سندرلال کا سفرِ حیات 26 ستمبر 1886ء کو مظفر نگر (مغربی اتر پردیش) کے املی تلہ محلّہ میں قانون گو کائستھوں کے ایک خوشحال گھرانہ میں شروع ہوا تھا۔ ان کے دادا کشوری لال کھتولی کے اردو فارسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ درگا کے پجاری تھے پر اپنی ملنساری کے لیے مشہور تھے۔ ان کی دادی جمنا دیوی بندرابن کی تھیں۔ پنڈت سندرلال کے نانا سیوارام رادھا سوامی فرقہ کے تھے اور ان کی والدہ بھگوتی بلّیماران (دلّی) کی تھیں۔ کشوری لال نے پنڈت سندرلال کے والد طوطا رام مڈل پاس کرنے کے بعد رڑکی انجینئرنگ کالج میں داخل ہو کر 1898ء میں اوورسیر بن گئے تھے اور 1901ء میں ڈپٹی انجینئر کے عہدہ پر پہنچ گئے لیکن اپنے والد کی بیماری کی وجہ سے انھیں جلد ہی مستعفی ہونا پڑا۔ استعفیٰ کی وجہ پنڈت سندرلال بھی تھے جو قومی سیاست میں سرگرم ہو چکے تھے اور ان کے والد اس سے الگ ہونے کے لیے ان پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

پنڈت سندرلال کی ابتدائی تعلیم چونکہ گھر پر ہی ہوئی اس لیے پانچ سال کی عمر ہو جانے پر کشوری لال نے ان کی الف باء شروع کرانے کی سوچی۔ طوطا رام اپنے صاحبزادہ کی تعلیم کی شروعات آریہ سماج کے طریقہ کے مطابق 'شری گنیسایہ نمہ' سے کرانے پر مصر تھے لیکن کشوری لال اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کا پوتا بسم اللہ کی خاندانی رسوم چھوڑ کر ناگری زبان میں ا-آ لکھ کر اپنی تعلیم شروع کرے۔ کئی دنوں کی تکرار کے بعد کشوری لال بازی جیت گئے اور ایک مولوی صاحب نے ان کی بسم اللہ کرائی، بعد میں ایک پنڈت جی نے 'شری گنیشایہ نمہ' کی رسم پوری کی۔ تقریباً دو سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مولوی صاحب نے انھیں اردو پڑھائی اور پنڈت جی ہندی کی تعلیم دیتے رہے، یہاں تک کہ پنڈت سندرلال کو کریما اسی طرح حفظ ہو گئی جس طرح انھوں نے رامائن کا سندر کانڈ یاد کیا تھا۔ برسوں بعد جب پنڈت سندرلال نے اپنے بچپن کا یہ واقعہ مہاتما گاندھی جی کو سنایا تو انھوں نے برجستہ کہا کہ اب میں سمجھا کہ تم ہندو مسلم اتحاد کی حفاظت اتنی قوت سے کیوں کرتے ہو!

تقریباً دو برس میں پنڈت سندرلال نے پوری رامائن ختم کی اور 1893ء سے انگریزی پڑھنے والوں میں شامل ہوگئے۔ ابتدا میں وہ گیتا کا مطالعہ کیا کرتے تھے لیکن اخیر عمر میں کبیر بھگت بن گئے تھے اور مولانا روم کی مثنوی کے زیر اثر مذہب عشق کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ اگر ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ثقافتی ہم آہنگی کی نعمت انھیں بچپن سے ہی حاصل تھی۔ ان کے دادا درگا کی پوجا کرتے تھے تو نانا رادھا سوامی فرقہ کے تھے اور والد صاحب آریہ سماج کے ہمنوا تھے۔ چنانچہ ان کے گھر میں ہولی دیوالی کے پکوان بنتے اور رنگ کھیلا جاتا تو محرم پر تعزیہ کا طواف بھی کیا جاتا اور وہ عید الفطر و عید الاضحیٰ کے موقع پر قصبہ کے لوگوں کے ساتھ شیرینی کا لطف بھی اٹھاتے تھے۔ بڑی عمر میں اسی روایت نے انھیں ہندو مذہب اور اسلام دونوں کے گہرے مطالعہ کی راہ دکھائی۔ پنڈت سندرلال کا شمار ہندی، انگریزی، سنسکرت اور اردو کے اصحاب علم میں ہوتا تھا۔ وہ وطن پرست شاعروں کے قدرداں تھے اور علامہ اقبال، حضرت موہانی اور جوش ملیح آبادی ان کے پسندیدہ شعراء میں سے تھے۔

پنڈت سندرلال نے 1898ء میں ڈی اے وی کالج سہارنپور میں داخلہ لیا اور 1901ء میں میٹریکولیشن کیا۔ 1903ء میں انٹرمیڈیٹ، ڈی اے وی کالج میں پنڈت سندرلال کی ملاقات لالہ لاجپت رائے سے ہوئی جن کی تقریروں سے انھوں نے حصول آزادی کی مہم میں شریک ہونے کا عزم کیا۔ وہ سوامی رام تیرتھ کے پروچن بھی سنا کرتے تھے۔ لالہ راجپت رائے کی تحریک پر پنڈت سندرلال نے 1904ء میں قحط زدگان کی راحت رسانی کا کام کیا۔

18 برس کی عمر میں 1905ء کے کئی واقعات نے پنڈت سندرلال کی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے۔ ان کی سوتیلی والدہ کا انتقال ہوگیا مگر ان کی شادی 13 برس کی کوشلیہ سے ہوگئی۔ اسی سال پنڈت سندرلال نے الہ آباد یونیورسٹی سے فلاسفی میں ایم اے کیا جس کے بعد وہ ایل ایل بی کرنے کے لیے سنٹرل کالج میں داخل ہوئے۔ میک ویل ہندو بورڈنگ ہاؤس سے ان کی سیاسی زندگی کی شروعات ہوئی۔ ابتدا میں وہ کانگریس کے گرم دل میں شامل تھے۔ 16/اکتوبر 1905ء کو جب تقسیم بنگال کا اعلان ہوا تو اس کے خلاف جمنا کے بلوا گھاٹ پر اجتماعی جلسہ منعقد ہوا جس میں دیگر طلبہ کے ساتھ پنڈت سندرلال بھی شامل تھے۔ 7 جنوری 1907ء کو پنڈت مدن موہن مالویہ کی دعوت پر لالا لاجپت رائے نے الہ آباد کی پرانی کائستھ پاٹھ شالہ میں تقریر کی تو کسی نے پنڈت سندرلال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسی لڑکے نے الہ آباد میں آگ لگا رکھی ہے۔ گوکھلے نے انھیں بلا کر محبت بھرے لہجہ میں کہا کہ انھیں پنڈت سندرلال جیسے نوجوانوں کی تلاش تھی۔ لیکن پنڈت سندرلال ان کے خیالات سے متفق نہ ہو سکے۔ 1907ء میں جب پنڈت موتی لال نہرو نے میوہال میں کانفرنس کی تب بھی ایک پنڈت سندرلال تو کیا، گرم دل کے کسی بھی ممبر کو وہ راغب نہ کر سکے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے جلد ہی گرم دل کے طلبہ کو بورڈنگ ہاؤس سے بیدخل کرنے کا نوٹس جاری کر دیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے انچارج کی حیثیت سے مالویہ جی اس فیصلہ پر متردد تھے تو وائس چانسلر نے پیغام بھیجا کہ اگر پنڈت سندرلال وعدہ کریں کہ امتحان ختم ہونے تک وہ سیاست سے دور رہیں گے تو یونیورسٹی سے ان کا اخراج رد کیا جا سکتا ہے۔ اگلے دن جب وائس چانسلر نے ان سے ان کا فیصلہ پوچھا تو انھوں نے ادب سے جواب دیا کہ وہ مجبور ہیں۔ اس طرح پنڈت سندرلال کی طالب علمی کا دور ختم ہوا۔

برطانوی حکومت کے خلاف ہونے والی سازشوں کی ناکامی نے گرم دل کو کافی مایوس کر دیا تھا۔ پنڈت سندرلال کو انگلینڈ جا کر بیرسٹری کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ لیکن لالہ لاجپت رائے ملک میں رہ کر ہی آزادی کی جدوجہد کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ پنڈت سندرلال سنیاس لے کر

سوامی سومیشورا تند بن گئے۔ چونکہ لارڈ ہارڈنگ بم کیس میں لالہ ہردیال نامزد تھے، اس لیے وہ لالہ لاجپت رائے کے مشورہ سے انگلینڈ چلے گئے، لیکن پولیس پنڈت سندرلال عرف سوامی سومیشور کے پیچھے لگ گئی۔ بہرحال وہ سرکاری وکیل کے پاس اپنے کاغذات چھپا کر بچ گئے۔ ابھی وہ سولن میں ہی تھے کہ گاندھی جی کا نام ان کے کانوں میں پڑا۔ وہ ان سے ملاقات کے لیے احمد آباد جا پہنچے۔ گاندھی جی کا حلیہ دیکھ کر انھیں بڑا تعجب ہوا۔ ان کی گفتگو نے اور بھی مایوس کیا۔ وہ ہر بات میں دھرم کا نام لیتے تھے۔ پنڈت سندرلال اکتا کر واپس لوٹ آئے۔ چمپارن ستیہ گرہ نے انھیں اکسایا تو وہ گاندھی جی سے ملنے گجرات پہنچ گئے۔ پہلی ملاقات پھر مایوس کن رہی لیکن جب وہ واپس لوٹے تو گاندھی جی نے انھیں مزید گفتگو کے لیے روک لیا۔ اس ملاقات میں گاندھی جی کی فوج سے متعلق معلومات سن کر وہ حیران رہ گئے۔ ان کا دل گرم دل سیاست سے گاندھی کے عدم تشدد اور عدم تعاون کی طرف پھرنے لگا۔

ہوم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے پنڈت سندرلال الہ آباد سے 'یوا ستیہ گرہ' چلاتے تھے جس کے صدر مہاتما گاندھی جی تھے۔ 1920ء میں کانگریس نے تحریک عدم تعاون منظور کی تو پنڈت سندرلال کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جس پر گاندھی جی نے اپنے 'ینگ انڈیا' میں احتجاجی مضامین لکھے۔ جبل پور جھنڈا ستیہ گرہ کے دوران پنڈت سندلال مہا کوشل کانگریس کے لیڈر رہے۔ ان کی پہل پر گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی میں 1940ء میں ہندوستانی کلچرل سوسائٹی قائم ہوئی۔ سوسائٹی کے ترجمان کا نام رونددرناتھ ٹیگور نے 'وشو بیاپی' رکھا تھا۔ 30 جنوری 1950ء کو گولی لگنے کے بعد جن دو افراد نے گاندھی جی کو سہارا دیا تھا، پنڈت سندرلال ان میں سے ایک تھے۔

1947ء میں پنڈت سندرلال نے میوات (ہریانہ) میں فرقہ وارانہ خیرسگالی کے لیے کام کیا۔ ان کی کوششوں سے میواتی پاکستان جانے سے رکے رہے۔ 1951ء میں وہ 'ہند گڈول مشن' کے سربراہ بن کر چین گئے۔ انھوں نے سوویت یونین، ویت نام اور کیوبا کے دورے بھی کیے۔ 1972ء میں وہ مسز اندرا گاندھی کی شارٹ نوٹس پر چین جانے والے وفد میں شامل تھے۔ اندرا گاندھی نے 1976ء میں پنڈت سندرلال کو ان کے 90واں جنم دن کی مبارکباد دی تھی۔ 9 مئی 1981ء کو انھوں نے اس دنیا کو خیرباد کہا اور اپنی پیچھے اپنی خدمات کی طویل یادیں چھوڑ گئے۔

• •

خدمات

سیاسی سرگرمیوں اور سماج سیوا کے باوجود پنڈت سندرلال نے زندگی بھر تحریر و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ پنڈت سندرلال نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ستمبر 1908ء میں کیا تھا۔ وہ شروع میں اردو ہفت روزہ اخبار کے مدیر تھے۔ انھوں نے 1909ء میں 'کرم یوگی' کی ادارت کی۔ 'کرم یوگی' کو بیرسٹر مکندی لال، نظر علی سوختہ اور ڈاکٹر تاراچند جیسے مشاہیر کا تعاون حاصل تھا۔ 1968ء تا 1909ء وہ ہفت روزہ 'بھوشیہ' (الہ آباد) کے مدیر رہے۔ 1920ء میں انھوں نے پریس پنڈت موتی لال نہرو کے حوالے کیا اور گاندھی جی کی تحریک عدمِ تعاون میں لگ گئے۔ صحافیانہ مصروفیات کے دوران بھی پنڈت سندرلال کا تحریری شغل جاری رہتا تھا۔ انھوں نے 1934-1950 کے دوران مذاہب عالم سے متعلق کتابیں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جن میں حضرت محمدؐ اور اسلام، 'قرآن اور گیتا'، حضرت عیسیٰ اور عیسائیت اور 'مہاتما زرتشت اور مذہب زرتشت' کو ان کی اہم تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے۔ 'میری سیاسی زندگی کے پچاس سال اور باپو کی پرارتھنا سبھا کے پروچن، پنڈت سندرلال کی مختصر تصانیف ہیں۔ 'بھارت میں انگریزی راج، ان کی عہد ساز کتاب تھی۔ اس کا 1857ء سے متعلق مواد 'سن ستاون' کے عنوان سے اردو میں بھی

شائع ہوا ہے۔ اصل کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی جسے صوفی شاعر کبیر داس سے منسوب کیا گیا تھا۔

'سن ستاون' کے پیش لفظ میں آل احمد سرور صاحب نے بتایا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت نے برطانوی حکومت کو متزلزل کر دیا تھا۔ 18/مارچ 1926ء کو جیسے ہی اس کی دو ہزار کاپیوں کا ایڈیشن پریس سے نکلا حکومت نے کتاب پر پابندی لگا دی اور ساری کاپیاں ضبط کر لیں۔ گاندھی جی نے اسے 'دن دہاڑے' ڈاکہ قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ پابندی تو ہٹانا ہی پڑے گی اور کتاب تو چھپ کر رہے گی'۔ 15/ستمبر 1937ء کو سرکار نے پابندی اٹھالی تو کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور آناً فاناً فروخت ہو گئے۔ کتاب میں پنڈت سندر لال نے منصف مزاج انگریزوں کے بیانات کے ساتھ پہلی جنگ آزادی کا مرقع تیار کیا ہے جس میں اس جنگ کے کلیدی کرداروں کی حقیقی صورت اجاگر کی گئی ہے۔ اور ایسے تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے برطانوی حکومت کا اصل چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ کتاب کا اردو ترجمہ پنڈت سندر لال کی نگرانی میں کیا گیا تھا۔ یہ کتاب آل احمد سرور کے بقول: شہیدانِ وطن کے لیے خراج عقیدت بھی ہے۔

'سن ستاون' کی شروعات 'ڈلہوزی کی زمین کی پیاس' سے ہوتی ہے۔ ہندوستانی راجاؤں کو ختم کرنے میں ڈلہوزی کی 'ڈلہپس' کی پالیسی کا کلیدی رول تھا۔ پنڈت سندر لال نے نواب واجد علی شاہ سے متعلق انگریزوں کی غلط بیانیوں سے بھی پردا اٹھایا ہے۔ وہ واجد علی شاہ سے منسوب داستانوں کو ان کی کردار کشی کی انگریزوں کی مہم بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ اودھ کا پہلا نواب تھا جس نے انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنی فوجوں کی تنظیم نو شروع کی تھی جس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے اسے دھوکے دے کر اس کی معزولی کے خط پر دستخط کرا لیے۔ انگریزوں نے ہندوستانی طب کو بھی تباہ کیا تھا اور سہارنپور میں یہ اعلان کرایا تھا کہ کوئی ہندوستانی وید یا حکیم نہ کسی مریض کا علاج کرے اور نہ ہی اسے کوئی دوا دے۔

پنڈت سندر لال نے پہلی جنگ آزادی کے دو کلیدی ہیروز عظیم اللہ خاں اور رنگو بابو جی کے رول پر بھی روشنی ڈالی ہے جو پس منظر میں رہ کر جنگ آزادی کے نقشے مرتب کر رہے تھے۔ کتاب میں بیگم حضرت محل اور مولوی احمد شاہ کے انقلابی رول بھی اجاگر کیے گئے ہیں۔ پنڈت سندر لال نے مستقبل میں ہندوستانی باشندوں کے لیے لائحہ عمل تیار کیا ہے یعنی مذہبی، سماجی اور اخلاقی معیارات قائم رکھنا اور انتہائی طاقت سے عمل میں لینا۔

پنڈت سندر لال کی ایک اور قابل ذکر کتاب ہے 'حضرت محمد اور اسلام'۔ اگر چہ اس مختصر سی کتاب کے بعض مشمولات مسلم نکتۂ نظر سے مختلف ہیں لیکن کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ قرآنی حوالوں سے بھر پور ہے، جن کا ترجمہ آسان فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ 234 صفحات کی اس کتاب میں سیرت نبوی کا احاطہ بیس عنوانات کے تحت کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ملک عرب کا تعارف کرایا گیا ہے اور عربوں کے رہن سہن اور عرب کے قدیمی مذاہب میں عرب دھرم، یہودی دھرم اور عیسائی دھرم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں 'پیغمبر کا رہن سہن اور' اسلام دھرم کا نچوڑ' درج کیا گیا ہے اور حضرت محمدؐ کے اپدیش اور پرارتھنائیں بھی دی گئی ہیں۔

پنڈت سندر لال کی تیسری قابل ذکر کتاب ہے 'گیتا اور قرآن' جس میں انھوں نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ گیتا کی تعلیمات قرآن کی تعلیمات سے مختلف نہیں ہیں اور یہ کہ عالم انسانیت کے بنیادی اصول سبھی مذاہب میں ایک جیسے ہیں۔ دراصل یہی ان کی مرکزی تھیسس ہے، جو

ہندو-مسلم اتحاد کے لیے ان کی کوششوں کی اساس ہے اور مہاتما گاندھی کی فلاسفی کی مطابقت میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو راستہ سب کی بھلائی کا ہو وہی اصلی مذہب ہے۔ اس مذہب کے اصول انھوں نے بیان کیے ہیں: (1) خدائے واحد میں یقین (2) اس کے بندوں کی حیثیت سے سب انسانوں کے ساتھ میل جول رکھنا اور نیک برتاؤ کرنا۔

کتاب کے اگلے دو ابواب ہیں: 'گیتا دھرم اور گیتا سار' پنڈت سندر لال گیتا میں بیان شدہ جنگ کو محض آدمی کے اندر ہونے والی نیکی و بدی کی جنگ کی تشبیہ مانتے ہیں۔ 'گیتا دھرم' کی مرکزی تعلیم یہ ہے کہ شہوات پر قابو رکھنا اور اخلاق حسنہ قائم رہنا سچے گیان کا ذریعہ ہے اور اس کے خلاف کرنا جہالت ہے۔

'گیتا سار' دراصل پوری گیتا کا نچوڑ ہے۔ گیتا سار سے معلوم ہوتا ہے کہ گیتا کا رجحان وحدت الوجود کی جانب مائل ہے: 'دیوتاؤں کے اُپاسک دیوتاؤں کو پہنچتے ہیں اور ایشور کے اُپاسک ایشور کو۔ اس لیے صرف ایک ایشور کا سہارا لینا چاہیے' پنڈت سندر لال نے خوب اللہ شاہ کا یہ قول نقل کیا ہے: 'گیتا ہندوستان کا قرآن ہے اور قرآن عرب کی گیتا'۔ کتاب کا آخری باب ہے 'قرآن' جس میں قرآن کی بنیادی تعلیمات درج کی گئی ہیں۔

16.8 ڈاکٹر بی۔ این۔ پانڈے

گاندھی جی کے جن متبعین نے اندرون ملک فرقہ وارانہ خیر سگالی کے پیغام کو عام کرنے میں زندگی گزاری ہے، ان میں ایک اہم شخصیت پدم شری ڈاکٹر بی۔ این۔ پانڈے کی تھی جنھوں نے اپنی تقریری و تحریری صلاحیتیں ملک کے مذہبی فرقوں، بالخصوص اسلام کے خلاف بدگمانیوں اور انگریزوں کے ذریعہ پھیلائے گئے بے بنیاد پروپیگنڈہ کا پردہ فاش کرنے کے لیے وقف کردی تھیں۔ ایک سیاست دان اور ایک دانشور کی حیثیت سے انھوں نے بڑی سرگرم زندگی گزاری اور ملک و قوم کی بڑی خدمات انجام دیں۔ ہندوستان میں اسلام اور مسلم بادشاہوں کی تاریخ کے خلاف لگائے گئے بہت سے الزامات کی اصل حقیقت واضح کر کے انھوں نے ایسا بیش قیمت لٹریچر فراہم کیا ہے جو ہمارے لیے چشم کشا ہے اور گہری تاریکیوں میں ایک روشن چراغ کے کام آتا ہے۔ فرقہ وارانہ بدگمانیوں کے ماحول میں ڈاکٹر پانڈے کی حیات اور خدمات کا مطالعہ اسلامیات کے طلبہ کے لیے اشد ضروری ہے۔

حیات

پدم شری ڈاکٹر بی۔ این۔ پانڈے کا جنم مرحوم شری رام آدھار پانڈے کے گھر میں مدھیہ پردیش کے ضلع چھندواڑہ میں 26 / دسمبر 1906ء کو ہوا تھا۔ چھندواڑہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے تعلیم مکمل کر کے انھوں نے اڈیار (مدراس) کے تھیوسوفیکل انسٹی ٹیوٹ اور پھر شانتی نکیتن (مغربی بنگال) میں واقع وشو بھارتی سے تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر پانڈے زندگی بھر نہرو خاندان کے قریبی معتمد رہے۔ ملک کے تین وزرائے اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، مسز اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا تعاون انھیں حاصل تھا۔ وہ 1972ء تا 1980 اندرا گاندھی ابھینندن سمیتی کے جنرل سکریٹری تھے۔ 1998ء میں اپنی موت کے وقت تک وہ شریمتی سونیا گاندھی کے قریبی شناسا میں تھے۔ ڈاکٹر پانڈے نے گاندھی جی کے فلسفۂ حیات اور ان کے اصولوں کی تبلیغ کو عملی زندگی کا مشن بنایا تھا۔ وہ 18 برسوں تک گاندھی درشن سمرتی کے چیئر پرسن تھے۔ انھوں نے 21/

دسمبر 1947ء کو سابق مجاہد آزادی شانتا پانڈے سے شادی کی جن کے بطن سے ان کی واحد اولاد نندتا پانڈے کا جنم ہوا۔ یکم جون 1998 کو ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

ڈاکٹر پانڈے 1920ء سے تاحیات انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہے۔ وہ 1924ء میں اتر پردیش کانگریس کمیٹی کے لیے منتخب ہوئے اور 1927ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لیے۔ وہ 53-1952ء کے دوران یوپی ودھان سبھا کے ممبر تھے اور 74-1972ء کے دوران ودھان پریشد (یوپی) کے، 83-1980ء میں وہ یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔ ڈاکٹر پانڈے نے ایک کامیاب پارلیمانی زندگی گزاری۔ 1978 میں وہ وشو بھارتی ترمیمی بل کی جوائنٹ کمیٹی کے ممبر تھے۔ حکومت ہند کی ہاؤسنگ و ہیلتھ وزارت نے انھیں سول ڈیفنس تنظیم نو کمیٹی اور میونسپل بجٹ ریفارم کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا۔ ڈاکٹر پانڈے کو 1976 میں راجیہ سبھا کے لیے نامزد کیا گیا تھا اور وہ 1982ء میں اس کے لیے یوپی سے منتخب ہوئے۔ 98-1989ء کے دوران وہ یونسکو سے تعاون کے لیے انڈین نیشنل کمیشن میں بھی شامل تھے اور انڈین کونسل برائے عالمی امور میں بھی۔ ڈاکٹر پانڈے 1950ء تا 1980ء الہ آباد کے مہتا آئی ہاسپٹل کی مشاورت کمیٹی میں رہے۔ 61-1960ء میں وہ الہ آباد صوبائی کارپوریشن کے میئر تھے 1977ء میں انھیں میوزیمس کے مرکزی مشاورتی بورڈ میں رکھا گیا تھا بعد میں انھیں آثار قدیمہ کے مشاورتی بورڈ میں شامل کیا گیا۔ 1981ء میں ڈاکٹر پانڈے جواہر لال نہرو میموریل فیلوز کی سلیکشن کمیٹی کے رکن تھے۔ سیاسی مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر پانڈے 1946ء تا 1950ء ملک کی مزدور تنظیوں کی فلاح میں بھی سرگرم رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے متعدد مزدور تنظیموں کی صدارت کی جن میں ریلوے مین، یوپی؛ چھیوکی آرڈیننس ڈپیل ڈپارٹ ورکرس یونین اور الہ آباد فورٹ آرڈیننس ورکرس یونین شامل ہیں۔

ڈاکٹر بی این پانڈے نے تعلیم انتظامیہ اور صحافت کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ 1935ء تا 1956ء یوپی کے ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ بورڈ کے رکن رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ملک کی کئی مشہور یونیورسٹیوں کی کورٹ کے ممبر بھی رہے۔ وہ 61-1960ء میں الہ آباد یونیورسٹی کی کورٹ میں شامل کیے گئے تھے۔ 1979 میں وہ دہلی یونیورسٹی کی کورٹ کے رکن تھے اور 1982ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی کورٹ کے۔ ڈاکٹر پانڈے کو 1982ء میں مرکزی ہندی پریشد میں رکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر پانڈے 50-1949ء کے دوران آل انڈیا نیوز پیپر کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ وہ 1948ء تا 1952ء الہ آباد جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ وہ یوپی ورکنگ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے بانی صدر تھے۔ انھوں نے کئی جرائد کی ادارت بھی سنبھالی، جن میں وشو وانی اور نیا ہند (ہندی و اردو) جیسے ماہنامے بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر پانڈے انڈین رائٹرس ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر پانڈے کو مختلف ایوارڈز سے نوازا گیا۔ انھیں صدر جمہوریہ ہند نے 1976ء میں پدم شری سے نوازا تھا۔ 1996ء میں انھیں اندرا گاندھی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ انھوں نے تاریخ اور آثار قدیمہ پر تحقیق و تصنیف کی غرض سے برما، سری لنکا، افغانستان، نیپال، تبت، سویڈن، چین، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، شام، مصر، انگلینڈ اور فرانس کے دورے بھی کیے۔ باغبانی اور مطالعہ ان کے محبوب مشاغل میں شامل ہیں۔

خدمات

ڈاکٹر پانڈے کی سماجی اور سیاسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیفی سرگرمیوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔یہاں پر ان ہندی اور انگریزی تصنیفات کا خصوصی ذکر کیا جائے گا اور اس میدان میں ان کی خدمات سے متعارف کرایا جائے گا۔ڈاکٹر پانڈے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حب وطن اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کے بے لاگ مبلغ ہیں۔انھوں نے قومی یکجہتی اور مذہب انسانیت کا پیغام عام کیا ہے۔اس تعلق سے انھوں نے ملک کی مسلم اقلیت اور ان کے مذہب وثقافت کے تحفظ کے لیے مثالی خدمات انجام دی ہیں۔ڈاکٹر پانڈے کی ہندی زبان میں ایک درجن سے زائد مشہور تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ڈاکٹر پانڈے نے انگریزی زبان میں بھی قابل قدر کتابیں تصنیف کی ہیں۔

ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ڈاکٹر پانڈے کا بنیادی اور مرکزی تھیسس یہ رہا ہے کہ برطانوی استعمار کے دور میں برطانوی انتظامیہ اور دانشوروں نے برطانوی تاریخ نویسوں اور ماہرین آثار قدیمہ کے ساتھ ہم زبان ہو کر مذہبی عقائد اور ان پر عمل درآمد کی ایسی فرضی کہانیاں گڑھی ہیں جن سے ان کی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کو تقویت ملی اور ہندوستانی باشندوں کے درمیان فرقہ وارانہ عناد نے جڑ پکڑ لی۔ڈاکٹر پانڈے نے اپنی تھیسس کے ثبوت میں برطانوی دستاویزات کی بعض عبارتوں کو پیش کیا ہے۔19 جولائی 1977ء کو ہندوستانی راجیہ سبھا میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا تھا کہ کناڈا (54-1847ء) اور ہندوستان (63-1862) کے گورنر جنرل نے سکریٹری آف اسٹیٹ وڈ نے صاف صاف لکھا تھا کہ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ لڑا کر اپنا اقتدار برقرار رکھا ہے اور ایسا ہی کرتے رہنا چاہیے۔اسی طرح ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانسس ہملٹن نے لارڈ کرزن کو مشورہ دیا تھا کہ ہمیں تعلیمی نصاب کی ایسی منصوبہ بندی کرنی چاہیے کہ مختلف فرقوں کے اختلافات کو مزید تقویت ملے۔

برطانوی پروپیگنڈہ مسلمانوں اور مسلم حکمرانوں کے خلاف بہت ہی شدید رہا ہے۔اگرچہ کے این پانیکر اور دومیلا تھاپر جیسے دانشوروں نے بار بار وضاحت کی ہے کہ ہندو مندروں کی مسماری اور ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان بنانے کے واقعات مذہبی جنون کی وجہ سے نہیں پیش آئے بلکہ ان کی معاشی اور سیاسی وجوہات تھیں، تاہم کچھ فرقہ پرست حلقے مسلم حکمرانوں کے جبر کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔بعض ہندوستانی دانشوروں مثلاً تارا چند مکھرجی، عرفان حبیب اور ڈاکٹر بی این پانڈے نے اس پروپیگنڈہ کی تردید کرتے ہوئے مغل بادشاہوں کے فرامین کی روشنی میں اصل واقعات کا بخیہ ادھیڑا ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر پانڈے نے اورنگ زیب اور دیگر مغل بادشاہوں کے فرامین کے عنوان سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک تاریخی خطبہ دیا تھا جس میں اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے فرامین کے حوالہ سے بتایا گیا کہ ان بادشاہوں نے تو بندرابن اور متھرا وغیرہ کے مندروں کو زمینوں کا عطیہ دیا تھا۔ٹیپو سلطان اور اس کی مذہبی پالیسی کے عنوان سے ڈاکٹر پانڈے نے ایک دوسرا خطبہ 1993ء میں دیا تھا کہ ٹیپو سلطان کی سلطنت میں ہندوؤں کی بڑے پیمانہ پر تبدیلی مذہب کا کوئی واقعہ پیش نہیں ہی آیا تھا بلکہ وہ ہندو مندروں کو بیش قیمت تحفے بھیجتا رہتا تھا اور خود سیکولر نظریہ کا حامل تھا۔البتہ اس نے کالی مندر پر انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھانے، قحبہ گری اور شراب اور بھانگ کی کاشت پر امتناع نافذ کیا تھا، گو کہ وہ پکا مسلمان تھا اور ہندوؤں کا مخالف نہیں تھا۔ڈاکٹر پانڈے نے حیرت کے ساتھ لکھا کہ اس سب کے باوجود انھوں نے 1972ء میں یوپی میں ہائی اسکول کے نصاب میں ٹیپو سلطان کے ہاتھوں تین ہزار برہمنوں کے قتل کا فرضی قصہ پڑھا، حالانکہ اس کو نصاب سے بہت پہلے خارج کیا جا چکا تھا۔

معلومات کی جانچ

(1) پنڈت سندر لال کی تعلیم کا سلسلہ کس طرح ختم ہوا؟

(2) پنڈت سندر لال نے جنگِ آزادی میں کیا رول ادا کیا؟

(3) ڈاکٹر بی این پانڈے مہاتما گاندھی کا اتباع کیوں کرتے تھے؟

(4) ڈاکٹر پانڈے کی بنیادی فکر کیا تھی؟

16.9 خلاصہ

ہندوستان کے غیر مسلم دانشوران بالعموم اسلام اور مسلمان کو ہندوستانی زندگی کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں کچھ تو اس بناء پر کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے قریب ہے اور کچھ اس لیے کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کا قریبی مطالعہ کرکے انھیں قابل قبول پایا ہے۔ گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو مذہبی شدت پسندی سے آزاد ماحول میں پلے بڑھے اور انھیں تحریک آزادی کے دوران ان کا قریبی مطالعہ کرکے مشترک ہندوستانی تہذیب سے ہم آہنگ پایا۔ مالک رام اور پنڈت سندر لال نے اسلام اور مسلمانوں کا مطالعہ ایک جویائے حق و دیانت کی طرح کیا اور انھیں ہندوستانی مزاج کے موافق پایا۔ جہاں مالک رام نے اسلامیات کو بار آور بنایا، وہیں پنڈت سندر لال نے ہندوستانی کے مشترک کلچر کی تاریخ کو مزید تقویت بہم پہنچائی۔ ڈاکٹر تارا چند اور ڈاکٹر بی این پانڈے نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے خلاف لگائے گئے بے جا پروپیگنڈہ کا مدلل اور مثبت جواب دیا ہے۔ اسلامیات کے طلبہ کے لیے ان سب کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔

16.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے:

(1) گاندھی کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے اہل خانہ کا کیا رول تھا؟

(2) نہرو جی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کس طرح سے سوچتے تھے؟

(3) مالک رام کی تذکرہ نگاری پر روشنی ڈالیے؟

(4) ہند-اسلامی کلچر کی بنیاد کس طرح پڑی؟

(5) ڈاکٹر پانڈے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے:

(1) گاندھی جی کی اسلامی بصیرت پر روشنی ڈالو۔

(2) پنڈت جواہر لال نہرو کا نظریہ قومیت کیا تھا؟

(3) مالک رام نے اسلامیات کے میدان میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے؟

(4) پنڈت سندر لال کی صحافیانہ خدمات پر روشنی ڈالیے۔

(5) ڈاکٹر پانڈے کی فکر ہندوستانیوں کو کیا پیغام دیتی ہے؟

16.11 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

(1) (مترجم) ڈاکٹر سید عابد حسین؛ تلاش حق (مہاتما گاندھی کی آپ بیتی)؛ 1995ء، نوجیون پرکاشن، احمد آباد

(2) ڈاکٹر مجیب اشرف؛ جدید ہند کے سیکولر معمار؛ 1989ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

(3) Sheila McDonough Gandhi's Response to Islam; D.K. Print World (p) Ltd., New Delhi

(4) جواہر لال نہرو؛ تلاش ہند، 1946ء، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

(5) (مترجم) آنند نرائن ملا؛ مضامین نہرو؛ 1992ء، اردو اکادمی، دہلی

(6) عبداللطیف اعظمی و کشمیری لال ذاکر؛ جواہر لال نہرو اپنی تحریروں کی روشنی میں، 1985ء، ہریانہ اردو اکامی

(7) علی جواد زیدی؛ مالک رام ایک مطالعہ، 1986، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

(8) کرنل بشیر حسین زیدی، مالک نامہ، 1987، جشن مالک رام کمیٹی

(9) مالک رام؛ عورت اور اسلامی تعلیم، 2012، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

(10) ڈاکٹر تاراچند، (مترجم) قاضی محمد عدیل عباسی؛ تاریخ تحریکِ آزادی ہند، 1980؛ قومی کونسل برائے اردو زبان، نئی دہلی

(11) ڈاکٹر تاراچند (مترجم) شیم حنفی؛ قومی یکجہتی اور سیکولرزم؛ 1975ء، انجمن اردو (ہند) دہلی

(12) شیوکمار مشرا ہلنکا م یوگی پنڈت سندر لال (ہندی)؛ 2012ء؛ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی

(13) پنڈت سندر لال؛ گیتا اور قرآن؛ 2010ء خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

(15) Dr. B.N. Panday, Aurangzeb and Tipu Sultan Institute of Objective Studies, New Delhi

اکائی 17 : اسلامی کتابوں کے غیر مسلم ناشرین

اکائی کے اجزاء

17.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد اس حقیقت پر روشنی ڈالنا ہے کہ اسلامی علوم وفنون کی اشاعت وترویج میں صرف مسلمانوں نے ہی نہیں غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا ہے۔ ابتدائے اسلام میں ہی اشاعت علم کے سلسلے میں غیر مسلم حضرات کا تعاون بھی لیا جاتا تھا، حتیٰ کہ قرآن کی کتابت میں یہود سے کام لیے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اس نئی ضرورت کے پیش نظر مسلمانوں نے بھی کتابت وخطاطی پر توجہ کی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کا دور آتے آتے مسلمان کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مہیا ہوگئی کہ خلافت عثمان کی جانب سے تقسیم کیے جانے والے صحائف کی تیاری کے لیے کافی تھی۔ کاغذ کی صنعت نے جس طرح کھجور کے پتوں، درخت کی چھالوں اور ہرن کی جھلیوں پر دستاویزات وکتب سازی کے دروازے بند کر دیے۔ اس طرح مشین کی چھپائی نے بھی انسانی سرگرمی کا ایک نیا دور شروع کیا۔ مصنفین اور قارئین کے درمیان ناشرین کا نیا طبقہ وجود میں آ گیا۔ اب لیتھو طباعت فوٹو اسٹیٹ سے گزر کر کمپیوٹر کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ سارے ناشرین صرف مسلم نہیں ہوتے اور نہ ہی صرف مسلم ناشرین اسلامیات کی اشاعت کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ زمانہ دراز سے اسلامی کتابوں کی اشاعت کے لیے غیر مسلم ناشرین کا تعاون حاصل کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور عیسائی، یہودی اور ہندو ناشرین اس سلسلے میں مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرتے رہے ہیں۔

17.2 تمہید

ہندو دانشوروں کا ذکر کرتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ان علمی حلیفوں یعنی غیر مسلم مالکان مطبع اور غیر مسلم ناشرین کا تعارف بھی کرایا جائے جن میں سے اکثر لوگ اپنے فنون میں مجتہدین کا درجہ رکھتے تھے لیکن اس طویل فہرست میں سے ہر ایک کا تعارف اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں۔ لہٰذا اس زمرہ سے صرف ایک شخصیت یعنی منشی نول کشور کا ذکر یہاں شامل کیا گیا ہے جو ہر اعتبار سے ایک جامع شخصیت تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھیں 1857ء کے بعد کے حالات میں ہندوستان میں دراسات اسلامی کا نجات دہندہ اور محافظ کہا جا سکتا ہے۔

17.3 منشی نول کشور

1857ء کے غدر کی تباہی کے بعد جن باشعور شخصیات نے ہندوستان کے تباہ وبرباد لوگوں کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایات کو نئی زندگی بخشی ان میں منشی نول کشور کا نام ہر ممکن فہرست میں نمایاں مقام پر رکھا جائے گا۔ ویسے تو منشی نول کشور محض ایک کامیاب تاجر تھے لیکن انھوں نے اپنی تجارت کے ذریعہ کلاسیکی علوم وفنون اور مشرقی اقدار اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی گرانقدر ثقافت کو زندہ رکھنے میں مغرب کی تہذیبی جارحیت اور استعماری چیرہ دستیوں سے پنجہ آزمائی کا جو تاریخی کارنامہ انجام دیا، وہ غیر معمولی تھا۔ منشی نول کشور کی حیات وخدمات کا مطالعہ اسلامیات کے طلبہ کے لیے کسی بیش قیمت ورثہ کے مطالعہ سے کم نہیں ہے۔

حیات

منشی نول کشور ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ کائستھ گھرانے کے فرد سمجھے جاتے ہیں ان کے خاندان کو مغلیہ دور سے

ان کی فرض شناسی اور علم دوستی کے باعث معزز سمجھا جاتا تھا۔ ان کا آبائی وطن ضلع متھرا تھا لیکن خشک سالی کے بعد وہ لوگ بستوئی (علی گڑھ) میں آباد ہو گئے تھے۔ منشی نول کشور کی پہلی شادی قصبہ ریڑھا کے زمیندار کی صاحبزادی سرسوتی کور سے ہوئی تھی جن کے بطن سے منشی جی کی تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ سرسوتی کور کی وفات منشی جی کے انتقال کے 4 برس بعد 1901ء میں ہوئی۔ ریڑھا میں ہی منشی جی کی والدہ کا وطن تھا۔ منشی جی کی ابتدائی تعلیم ساسنی (علی گڑھ) میں ہوئی۔ فارسی عربی اور دینیات کی تعلیم کے بعد ان کے والد نے ثانوی تعلیم کے لیے انھیں آگرہ بھیجا جہاں وہ 1845 سے 1850 تک آگرہ کالج میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ تعلیم کے دوران اخباری مراسلات اور مضمون نگاری کی مشق کیا کرتے تھے۔ حکومت نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور وظیفہ مقرر کر دیا۔

سرکاری وظیفہ سے حوصلہ پا کر منشی نول کشور صحافت کے میدان میں داخل ہوئے۔ اردو ان کی خانگی زبان تھی اور وہ سنسکرت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی زبان انھوں نے درمیان میں سیکھ لی۔ منشی جی نے اپنے صحافیانہ کیریئر کی ابتدا میں 'سفیر آگرہ' (آگرہ) میں مضمون نگاری کی۔ 1851ء میں منشی نول کشور لاہور گئے اور اخبار 'کوہِ نور' کا پریس 4 برسوں تک سنبھالے رہے۔ لیکن 1856ء میں اخبار کے خلاف مقدمہ چلا اور اگلے سال اس کے مالک سے ان کی ناچاقی ہو گئی جس پر انھوں نے آگرہ واپس آنے کی ٹھان لی۔ دراصل وہ آزادرہ کر ملک وقوم کی خدمت کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس خیال سے انھوں نے سیاست، سماج اور معیشت کے بارے میں گہری معلومات حاصل کی تھیں اور اپنے مشن کے لیے ایک مطبع قائم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اسی دوران ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی برپا ہو گئی۔

1857ء کے ہنگامہ کے بعد منشی نول کشور نے آگرہ سے لکھنؤ کا رخ کیا جہاں انھوں نے آغا میر کی ڈیوڑھی کے ایک معمولی مکان میں ہینڈ پریس اور چھپائی کے پتھروں کا انتظام کر کے 1858ء میں مطبع نول کشور قائم کیا جس نے تہذیبی وثقافتی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اگر چہ اس وقت مغربی تہذیبی جارحیت کے مقابل مشرقی علوم کے ماہرین بے وقار اور بے سہارا ہو چکے تھے لیکن منشی نول کشور نے مشرقی تہذیب اور علوم وفنون کی بازیابی کی مہم میں کوئی خلل نہیں پڑنے دیا۔ انھوں نے عالموں اور دانشوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی ٹیم میں شامل کیا اور ان کی ہر طرح سے مدد کی۔ انھوں نے نادرونایاب مذہبی صحائف اور مشرقی علوم وفنون کی عسیر الحصول کتابیں مختلف نجی کتب خانوں سے حاصل کیں اور تصحیح وحواشی کے ساتھ انھیں شائع کر کے مشرقی علوم کے احیاء کا فریضہ انجام دیا جس سے اہل ملک بالخصوص مسلمانوں کے خلاف علمی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشرتی ومعاشرتی خطرات کا ازالہ ممکن ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ مطبع نول کشور کا پیدا کردہ انقلاب 1857ء کے سیاسی انقلاب سے بہت طاقتور ثابت ہوا۔

منشی نول کشور نے دینی کتابوں کی طباعت شروع کر کے اپنے مطبع کو مضبوط کاروباری بنیادوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ لیکن منشی نول کشور محض ایک کامیاب کاروباری ہی نہیں تھے وہ ایک معیاری مصنف، اردو، ہندی اور فارسی کے نقاد اور ایک منجھے ہوئے صحافی بھی تھے۔ انھوں نے کتابوں کی اشاعت کے پہلو بہ پہلو علم وہنر اور فکروفن کی آبیاری بھی کی۔ انھوں نے مطبع نول کشور کو مختلف صلاحیتوں کی افزائش کا مرکز بنایا اور اس سے ایک باوقار اکیڈمی کا کام لے کر ہند اسلامی ثقافت کو نئی زندگی بخشنے کے ساتھ ساتھ اردو، عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت زبانوں پر بھی بڑا احسان کیا۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ منشی نول کشور ایک بلند پایہ انسان بھی تھے۔ وہ ہر انسان کی بلا لحاظ ملت خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور ہنگامی حالات میں کچھ زیادہ ہی فیاض ہو جاتے تھے۔ 1877ء کی قحط سالی اور گومتی میں سیلاب کے وقت وہ خود ہی مالی تعاون نہیں کرتے

بلکہ دوسروں کو بھی مصیبت زدگان کی امداد کے لیے ترغیب دلاتے تھے۔ انھوں نے لیڈی ڈفرن فنڈ اور حلیمی ہائی اسکول کو مدد دینے کے علاوہ ہفنلے بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر میں بھی دلچسپی لی تھی اور جلسۂ تہذیب (لکھنؤ) میں معیاری مشاعرے منعقد کرائے تھے۔ منشی نول کشور اپنے مطبع کی مطبوعات کتب خانوں اور تعلیمی اداروں کو بنا کسی قیمت کے فراہم کرتے تھے۔ ان تمام خدمات میں قائدانہ رول ادا کرنے کے باوجود منشی نول کشور کی شخصیت غرور و تکبر کے شائبہ سے بھی پاک تھی۔

منشی نول کشور کو حکومت ہند کی سفارش پر 1888ء میں سی آئی ای کا خطاب اور قیصر ہند کا تمغہ دیا گیا تھا۔ وہ لکھنؤ میونسپل بورڈ کے پہلے ہندوستانی ممبر تھے۔ وہ لکھنؤ کے اعزازی مجسٹریٹ اور اودھ کے جیل خانوں کے اعزازی انسپکٹر بھی تھے۔ منشی نول کشور کو گورنمنٹ پریس (الہ آباد) کا نگراں اور روہیل کھنڈ بورڈ کا ممبر بھی نامزد کیا گیا تھا۔ لدھیانہ میں منعقد گورنر جنرل کے دربار میں منشی نول کشور کو والیانِ ریاست کی صف میں نشست دی گئی تھی۔ منشی نول کشور کی شائع کردہ مذہبی اور علمی کتابیں دیکھ کر افغانستان کے امیر عبیدالرحمٰن نے کہا تھا کہ آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ 1888ء میں شاہ ایران نے ہندوستان آنے کے دو مقاصد بتائے تھے: پہلا وائس رائے سے ملنا اور دوسرا، منشی نول کشور سے ملنا۔ منشی نول کشور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے آنجہانی وزیراعظم ہند اندرا گاندھی نے انھیں 19ویں صدی کا 'ہمارا دانشورانہ قائد' قرار دیا تھا۔

خدمات

اس میں شک نہیں کہ منشی نول کشور نے سب سے بڑی خدمت مطبع نول کشور کے ذریعہ کتابوں کی اشاعت کر کے انجام دی۔ ایسا نہیں ہے کہ مطبع نول کشور سے پہلے ملک میں کوئی اور مطبع تھا ہی نہیں لیکن منشی نول کشور نے اپنے مطبع کی شائع کردہ کتب میں تنوع، صحت، دیدہ زیبی اور کفایت کا جو معیار قائم کیا وہ ایسا عہد ساز اور مثالی تھا کہ اس کی ستائش نہ صرف اندرونِ ہند بلکہ ملک کے باہر بھی کی گئی۔ منشی نول کشور نے ایک مختصر سی مدت میں قرآن مجید، تفاسیر، احادیث، تاریخ و سیر، اسلامی لٹریچر، تصوف و اخلاق اور ان کے علاوہ دیگر مذاہب کے مذہبی صحف، علوم وفنون اور تمدنی یادگاروں کا اتنا بڑا خزینہ تیار کر دیا جس سے ثقافت کا استحکام یقینی ہو گیا۔ منشی نول کشور نے اس کام کے لیے ملک بھر سے ضروری کتابیں تلاش کر کے جمع کیں اور پھر اپنے وقت کے مقتدر علماء سے ان کی تصحیح کرائی۔ علماء کی اس ٹیم میں ایسے حضرات بھی موجود تھے جو تراجم، حواشی اور شرح نویسی کا کام بھی کرتے تھے۔ ایک دوسری ٹیم خوش نویسوں اور مصلحین سنگ کی تھی۔ ان کے علاوہ بہت سے دیگر رفقائے کار بھی منشی جی کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ اس طرح لکھنؤ میں حفاظ، علماء، مؤرخین اور شعراء اس کثرت سے جمع ہو گئے کہ ان کی تعداد تمام مطابع کے لیے آج تک ایک ریکارڈ ہے۔

منشی نول کشور اشاعت کتب میں تصحیح اور درستگی پر سب سے زیادہ دھیان دیتے تھے۔ اسلامی کتب اور بالخصوص قرآن مجید کی طباعت کے لیے انھوں نے مصحح پریس مین، مشین مین اور کاغذ لگانے والوں کو تاکید کی تھی کہ وہ صاف اور باوضو ہو کر طباعت کریں۔ خود منشی نول کشور نہا دھو کر ایک پاک و صاف مسند پر بیٹھ کر دھلی ہوئی سفید چادر اپنے زانو پر ڈال لیتے اور تب کتابت قرآن کی کاپیوں اور پروفس کو دیکھتے۔ ان اہتمامات کی وجہ سے مطبع نول کشور سے شائع شدہ قرآن مجید، حمائل اور دیگر اسلامی کتب کی مانگ اندرون ملک بہت بڑھ گئی تھی بلکہ اس کی عربی اور فارسی میں شائع شدہ کتابیں چین، ترکستان، افغانستان، ایران، عراق، حجاز، مصر اور شام تک سے بڑی تعداد میں طلب کی جاتی تھیں۔ دیوبند

کی مجلس شوریٰ نے عربی کتب کی اشاعت کے لیے منشی نول کشور کا شکریہ ادا کیا تھا۔ ایک شائع شدہ فہرست کے مطابق منشی نول کشور نے چار ہزار کتابیں شائع کی تھیں جو تفاسیر، احادیث، فقہ، معانی ولغات، اخلاق وتصوف انشاء وقواعد، کلیات ودواوین، تاریخ وتذکرہ، اسلامیات، سفرناموں، داستانوں، افسانوں، علم طب، جغرافیہ اور دیگر علوم وفنون پر مشتمل تھیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منشی نول کشور نے صرف اسلامی علوم تک اپنا اشاعتی پروگرام محدود رکھا۔ وہ اسلامی اور غیر اسلامی صحیفوں میں بھید بھاؤ نہیں کرتے تھے۔ وہ مشرقی تہذیب وعلوم کے گرویدہ تھے اور دنیا بھر سے ہندوستان کی تہذیبی ثروت کا اعتراف کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ عربی اور فارسی کتب پر تکیہ نہیں کیے رہے بلکہ انھوں نے ہندی، انگریزی، گرومکھی، مرہٹی، بنگالی اور پشتو زبانوں میں بھی معیاری کتابیں شائع کیں۔ مطبع نور کشور نے اپنے ابتدائی ایام میں جو کتابیں شائع کی تھیں، ان میں صرف 15 فیصد کتابیں اردو، فارسی اور مذہبی تھیں جبکہ باقی کتابیں دوسری زبانوں کی تھیں۔ انھوں نے منوسمرتی، گیتا، مہابھارت، رامائن، سورساگر، اُپنشد اور ویدوں کے ساتھ ساتھ گروگرنتھ، توریت، عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید بھی شائع کیے۔ وہ جس طرح عربی، فارسی اور اردو ادبیات کو اہم سمجھتے تھے، اسی طرح سور، تلسی، میرا، کیشو داس وغیرہ کی تصانیف کو بھی اہمیت دیتے تھے۔

منشی نول کشور نے اپنے مطبع کو مرکز بنا کر اس کے گرد دیگر ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی شروع کی تھیں، مثلاً انھوں نے وہاں بیٹھ کر داستان نگاری اور قصہ گوئی کا ایسا دو آتشہ بنایا تھا جس نے اس عہد کی تخلیقی صلاحیتوں کو ان کے مطبع میں جمع کر دیا تھا۔ مطبع کی داستانوں نے شمالی ہند کے عام لوگوں سے لے کر مرزا غالب تک پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ داستان نگاری میں فن قصہ گوئی کے التزامات پورے کیے جاتے تھے۔ مطبع نول کشور کے داستان گویوں کے ساتھ زود نویس کاتب بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مطبع نول کشور کی داستانیں ہم عصر معاشرت کی بے لاگ ترجمانی کرتی تھیں۔ داستان امیر حمزہ بڑی حد تک ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی عکاس ہے اور طلسم ہوش رُبا معرکۂ خیر وشر کا دلچسپ بیانیہ ہے۔ ان طویل داستانوں کے علاوہ منشی نول کشور نے کئی فارسی داستانوں کو ہندوستانی ماحول میں ڈھالا تھا۔

مطبع نول کشور قائم کرتے وقت منشی نول کشور کا اصل مقصد اردو صحافت کی دنیا میں مقام بنانا تھا۔ چنانچہ مطبع کے قیام کے تین دن گزرتے ہی انھوں نے 'اودھ اخبار' نامی ہفت روزہ کی اشاعت شروع کر دی جو 1877ء سے روزانہ شائع ہوا۔ اودھ اخبار کی پہلی خوبی یہ تھی کہ یہ پابندیٔ وقت کے ساتھ نکلتا تھا۔ دوسری اخباری خوبی تھا اس کا مواد ایک متعین معمول کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا۔ اودھ اخبار انگریز کا حمایتی ضرور تھا لیکن اس کے اغراض و مقاصد تھے: قومی یکجہتی اور اتحاد واتفاق کے لیے قائدانہ رول ادا کرتے ہوئے عوامی رابطہ کے ذریعہ اخلاقی، معاشرتی اور تعلیمی بیداری پیدا کرنا۔ منشی نول کشور برطانوی حکومت کے سامنے خود سپردگی کی بجائے ہندوستانیوں اور ہندوستانی تہذیب کے وقار وعزت کو برقرار رکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اودھ اخبار میں مضامین اور مراسلات کے ساتھ ساتھ مشاہیر ادب مثلاً مرزا غالب اور سرسید، میر انیس اور مرزا دبیر کی تخلیقات شائع کی جاتی تھیں۔ اخبار کے مستقل کالموں میں مراسلات، اعلانات، اشتہارات، تہذیبی اجتماعات اور ادبی محفلوں روئداد اور خبروں کے ساتھ بازار بھاؤ، شرح مبادلہ اور ملکی وغیر ملکی خبریں اور تراجم پابندی سے شائع کئے جاتے تھے۔ ان مقاصد کی تحصیل کے لیے مضمون نگاروں، مترجمین، مراسلہ نگاروں، نمائندوں، نامہ نگاروں اور ایڈیٹروں کی ایک باصلاحیت ٹیم کا تعاون منشی نول کشور کو حاصل تھا۔ خود منشی نول کشور عام ملکی حالات اور سیاسی پیش قدمیوں سے متعلق تجزیاتی اور جائزہ مضامین کے ذریعہ اردو صحافت کو دوسری زبان کے ہم پلہ بنانے میں لگے

رہتے تھے۔اودھ اخبار کے مراسلات اکثر و بیشتر قومی بحث کا رخ اختیار کر لیتے تھے۔اس طرح اودھ اخبار اپنے وقت میں ایک نئے سیاسی، ثقافتی اور علمی انقلاب کا ہرکارہ بن گیا تھا۔اودھ اخبار کو استقرار حاصل ہونے کے بعد منشی نول کشور نے 'اودھ ٹائمز' کے نام سے ایک انگریزی اخبار شروع کرنے کی ٹھانی لیکن اسے اودھ اخبار جیسا مقبول اور معیاری بنانے کا وقت زندگی نے انھیں نہیں دیا۔

جنوری 1895ء سے منشی نول کشور نے 'اودھ ریویو' نامی اردو ماہنامہ شروع کیا۔جس میں ناول، ڈرامے، قصے، لطائف، شعر وسخن، سوانح عمریاں، بلند پایہ مضامین اور تفریحی معلومات شائع کی جاتی تھیں جن کے ذریعہ وہ اودھ اخبار کے ادبی و علمی حلقوں بالخصوص اردو دانشوروں اور مفکروں کو عالمی معیار کی سطح تک لے جانا چاہتے تھے۔جنوری 1895ء سے یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا تھا لیکن اگلے ہی مہینہ 19 فروری 1895ء کو داعیٔ اجل نے ان کے عرصۂ حیات کے اختتام کا اعلان کر دیا۔منشی نول کشور کی وفات کے بعد اودھ ریویو اگلے 9 ماہ سے زیادہ نہ چل سکا۔اودھ ریویو کے ذریعہ منشی نول کشور نے اردو دنیا کو ٹائپ سے متعارف کرایا تھا۔

یہ تھا خالص علمی، لسانی، صنعتی، ثقافتی اور تہذیبی انقلاب کا ایک مختصر سا سفرنامہ۔منشی نول کشور نے مطبع نولکشور قائم کر کے مسلم دنیا کو جدید اشاعتی طریقوں سے روشناس کرایا۔اپنے گوں ناگوں امتیازات کی بناء پر مطبع نول کشور اپنے وقت میں پیرس کے آپس پریس کے بعد دنیا کا سب سے بڑا پریس بن گیا تھا۔

معلومات کی جانچ

(1) منشی نول کشور کی سوانح پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شخصیت کے امتیازی پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔

(2) منشی نول کشور کی صحافتی خدمات پر تبصرہ کیجیے۔

(3) نول کشور پریس پر ایک نوٹ لکھیے۔

17.4 اخبارات اور مطابع کے ہندو مالکان

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے ساتھ ہی اسلامی کتب کے شائع کرنے والوں کا ایک حلقہ وجود میں آ گیا تھا۔ابتدا میں راجہ و مہاراجہ ہی اسلامی کتب، بالخصوص قرآن اور تراجم قرآن کا تقاضہ کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ طلب بڑھتی گئی جو نقل نویسی کے ذریعہ پوری کی جاتی رہی۔ 19ویں صدی کی تبدیلیوں میں ایک اہم واقعہ پریس کی چھپائی کا تھا جس نے اشاعت علم کی میدان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔یہ انقلاب اسلامی کتب کی اشاعت کے میدان میں بھی آیا۔چنانچہ اس میدان میں بھی متعدد غیر مسلم ناشرین نے قابل ذکر کارنامے انجام دیے۔ایسے غیر مسلم ناشرین اور مالکان مطبع کی ایک جزوی فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے جس سے اسلامی کتب کی اشاعت میں ان کے تعاون کی وسعت کا اندازہ ہوگا:

نمبر	اخبار اور مطبع	نام مالک وایڈیٹر	سن	مقام

1	اخباروں کا قبلہ گاہ	مہتمم بھگوان داس	1878	لاہور، ہفتہ وار
2	اخبار عام	مالک پنڈت رام، اڈیٹر گول ناتھ	1871	لاہور، ہفتہ میں 3 بار
3	اخبار ہند	مانگ گوری شنکر، مہتمم منشی اودھ بہاری لال، اڈیٹر مرزا رفیع الدین	1880	لکھنؤ ہفتہ وار
4	اخبار چنار	مالک: بابو ہنومان پرشاد، اڈیٹر مصنف کتاب مولود شریف سعدی	3 ستمبر 1884	چنار، مرزاپور ہفتہ وار
5	اتالیق پنجاب	مہتمم بابو پیارے لال	1870	لاہور
6	اتالیق زمینداران	مالک: لالہ نرائن داس	1877	ہوشیارپور
7	ایجوکیشنل پریس	مہتمم کنہیالال اکرامیز	1866	لاہور
8	احسن المطابع	مالک منشی لیشن سروپ	یکم فروری 1885	یحییٰ گنج لکھنؤ
9	اردو رپورٹ	مالک: منشی لیشن سروپ	1870	مرادآباد، ماہنامہ
10	اردو گورنمنٹ گزٹ پنجاب	مہتمم پیارے لال	1872	لاہور، ماہانہ
11	اردو انسٹرکٹر (اردو انگریزی مشترک)	مطبع گرنتھ پرکاش	1882	بمبئی
12	آصف الاخبار	مالک: نارائن سوامی مدا بھار کپنی	یکم فروری 1871	حیدرآباد
13	اصغری	کاتب: پیارے لال	یکم اگست 1871	
14	آفتاب ہند، کاشی پریس	باہتمام بابو گوبند چندر	1854	بنارس، پندرہ روزہ
15	آفتاب عالمتاب	مالک لالہ دیبی پرشاد مہتمم لالہ شمبھوناتھ	1870	لکھنؤ
16	آفتاب عالمتاب	مالک ایوان اسپاسنگھ، اڈیٹر منشی رام سنگھ	1885	لاہور

17	آفتاب پنجاب	ایوان بوٹا سنگھ	1873	لاہور، ہفتہ وار
18	آفتاب محشر، مطبع چنی لال پریس	مالک: لالہ کندن لال شرر مہتمم سکھن لال	ستمبر 1887	علی گڑھ پندرہ روزہ
19	افسوس، مطبع چنی لال پریس	باہتمام جگدمبا پرشاد	یکم مئی 1885	فتح گڑھ
20	امر سنگھ پریس	مالک راو سنگھ باہتمام رام پرشاد	جنوری 1876	بڑھانہ، مظفر نگر
21	انجمن رفاہ	باہتمام منشی گلاب رائے		گونڈہ
22	انجمن زراعت	پنڈت سری لال	1884	بجنور
23	انجمن فیضان عام، مطبع گیان پریس	مہتمم منشی دیوان چند	1866	گوجرانوالہ، ماہانہ
24	انجم افروز	مہتمم لالہ بھگوان داس	1859	کشمیری گیٹ، دہلی
25	انوار احمدی، مطبع منشی ہزاری لال		1867	ہردوئی
26	اودھ پرکاش	مالک برج موہن لال، باہتمام منشی چنڈی لال	جنوری 1887	فیض آباد
27	اودھ پریس	مالک لالہ چندن لال، مہتمم پیارے لال	1874	یحیٰ گنج لکھنؤ
28	آئینہ آئین ہند، گیان پریس	مہتمم منشی برج لال	1879	
29	آئینہ ریاضی	مالک لالہ بختاور سنگھ	یکم جنوری 1879	شاہجہاں پور
30	آئینہ تہذیب	مالک بابو شبو پرساد	ستمبر 1882	غازی پور، سید پور
31	آئینہ ہند، آریہ پریس	مالک لالہ رنگی رام مختار، مہتمم لالہ سالک رام	یکم جنوری 1883	
32	آئینہ روزگار	مالک پانڈے رام سرن لال کائستھ	1888	غازی پور
33	آئین پریس	مالک منشی امر سنگھ	1883	نظام الدین
34	آئین ہند	مہتمم امر سنگھ	1883	دہلی

35	انبالہ گزٹ، مطبع ہری پرکاش	مالک لالہ ہربنس رائے	یکم اگست 1885	انبالہ
36	باوا آدم	پنچ بجکم لالہ پرتاپ صاحب مالک بابو سندر داس	اکتوبر 1881	بنارس
37	بحر حکمت	مالک رائے ہرسکھ رائے باہتمام منشی منور رام	1862	لاہور پندرہ روزہ
38	بحر النبوض	مالک لالہ بیجا ناتھ	1861	فتح پور، ہسوہ
39	برق، مطبع دت پرشاد پریس	مالک نواب علی حسرت لکھنوی	1885	بمبئی، ماہانہ
40	برہم پریس	مہتمم بھگوان داس حسب فرمائش شیخ غلام حسین تاجر کتب	1879	دہلی
41	برہم پریس	مالک نتھو رام نند	یکم جون 1883	لاہور
42	برنج آفتاب پنجاب	مالک دیوان ابا سنگھ	6 مارچ 1885	لاہور
43	بلدیو پرکاش	مالک بلدیو پرشاد	یکم جولائی 1880	آگرہ
44	بنارس گزٹ	مالک گوبندر گھوناتھ	1854	بنارس
45	بنارس گزٹ	مہتمم بابو اچھا پرشاد، مالک بابو سدہ گوپال، اڈیٹر لال اشرفی	1883	بنارس
46	بنارس لاٹ پریس	مالک گوپی ناتھ	1870	بنارس
47	ہند پریس	مالک منشی ہنومان پرشاد شاہجہاں پوری	یکم مارچ 1856	مرزاپور
48	بوستان العاشقین	مالک بابو مول راج، مہتمم بابو چھوٹے، اڈیٹر لالہ ماھو برشا	1877	لکھنؤ ہفتہ وار
49	بہار جنت	مالک سردار بوٹا سنگھ	1887	کپورتھلہ
50	بہارستان شوقی	مالک بابو گنگا سہائے	1885	بلند شہر، ماہانہ

51	بےنظیر	مالک جی. پی. دتاتری اڈیٹر پنڈت شیوناتھ سنگھ	5 جنوری 1884	لکھنؤ
52	براب پنچ	منشی کرشن لال	1886	کھولہاپور، امراوتی
53	پرنٹنگ پریس	مالک بابو کشوری موہن چٹرجی	1886	گورکھپور
54	تاج الاخبار، مطبع کایستھ	باہتمام لالہ گوکل پرشاد	1874	مشک گنج لکھنؤ
55	تاج الاخبار	مالک بابو نرائن داس، اڈیٹر منشی رام سہائے شفیق	یکم نومبر 1884	راول پنڈی ہفتہ واری
56	تحفۂ پنجاب	ٹھاکر بیرم بلرام سنگھ مہتمم دیوان بھگواس داس	1875	امرت سر
57	تحفۂ پنجاب	مالک اتم چند	1883	لاہور
58	تحفۂ کشمیر	مہتمم منشی جمنا پرشاد مالک لالہ رائے ہر سکھ رائے	1876	سری نگر
59	تہذیب سخن	مالک منشی کرشن لال جوش	1886	کولہاپور، امراوتی
60	تعویذ	مالک لالہ بانکے لال زارید بدایونی	جولائی 1885	متھرا
61	ثمر ہند	مالک منشی پیارے لال ڈپٹی منیجر ہر سبرن داس	1869	مسن پوری
62	جام جہاں نما	مالک رائے سری کرشن چندر قیصر از قیصر المطابع	1883	گھسیاری منڈی لکھنؤ
63	جامع الاحکام	مہتمم منشی چندن لال پرنٹر پیارے لال	1872	یحییٰ گنج لکھنؤ
64	جامع مسائل علم الطب	مالک سردار بوٹا سنگھ سوداگر	1883	کپورتھلہ
65	جامع العلوم	مالک منشی نرائن درس مہتمم منشی پرنٹری داس	جنوری 1884	مرادآباد

66	جلوہ طور	مالک رائے گنیش لال مہتمم بابو بلبھ رائے، پرنٹر شمبھوناتھ	1861	میرٹھ
67	چشمۂ فیض	مالک دیوان چند	جولائی 1853	سیالکوٹ

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، ہندوستانی پریس 1556 تا 1900، مرتبہ نادر علی خاں، اترپردیش اکادمی، 1990ء۔

نوٹ: 'اخبارات اور مطابع کے ہندو مالکان' کی یہ فہرست پروفیسر شیث محمد اسمٰعیل اعظمی کی کتاب ''دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات'' سے ماخوذ ہے۔

معلومات کی جانچ

(1) ہندو مطابع کے مالکان کے نام لکھیے اور یہ بتائیے کہ یہ مطابع کہاں قائم تھے؟

(2) ہندو ناشرین کی طرف سے شائع کیے جانے والے اردو اخبارات ومجلّات کے نام اور جائے اشاعت اور سن اشاعت پر روشنی ڈالیں۔

17.5 خلاصہ

ابتداء سے اشاعت علم میں ناشرین کا بڑا مرکزی رول رہا ہے۔ اس کام کے انجام دہی میں دوسروں کا تعاون حاصل کرنا ناگزیر ہے بلکہ انسانی تمدنی کی ترقی کے پیش نظر ایسا کرنا مستحسن ہے۔ ہندوستان میں بھی اسلامی کتب کی اشاعت کے سلسلے میں غیر مسلم طابع اور ناشرین کا تعاون بڑے پیمانہ پر حاصل کیا گیا۔ ایسے تمام غیر مسلم طابع اور ناشرین کے انفرادی کارناموں سے ہی ہند-اسلامی تہذیب کی پرورش ہوئی ہے۔ ان قد آور دانشوروں میں منشی نول کشور جیسے حضرات بھی شامل ہیں جن کی مشترکہ کوششوں سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب نے برطانوی استعمار کی زد میں آئے ہوئے مشرقی علوم وفنون کو نئی زندگی بخشی اور ہندوستانی تہذیب کو ادب وشرافت اور ترسیل وابلاغ کے نئے معیارات قائم کرنے کی راہ پر ڈالا۔

منشی نول کشور نے تقریباً چار ہزار کتابیں اپنے مطبع سے شائع کیں۔ وہ اسلامی کتب کی اشاعت میں اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ اسلامی کتب ورسائل کی بے حرمتی نہ ہو۔ وہ کئی مشرقی زبانوں کے ساتھ سنسکرت سے واقف تھے۔ ان کے مطبع کا اس وقت دنیا کے چند بڑے مطابع میں شمار ہوتا تھا۔ اس ضمن میں دیگر ہندو ناشرین کی خدمات بھی لازوال ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دیگر غیر مسلم ناشرین اور مطابع کے مالکان میں: پنڈت رام، بابو ہنومان پرشاد، لالہ کندن لال شرر، راؤ سنگھ، رائے شری کرشن چندر قیصر، بھگوان داس اور منشی لیشن سروپ شامل ہیں۔

17.6 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے:

(1) اردو طباعت کن مرحلوں سے گزر کر کمپیوٹر کے دور تک پہنچی؟

(2) منشی نول کشور صحافت میں کس طرح داخل ہوئے؟

(3) منشی نول کشور کے اشاعتی مشن پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے:

(4) منشی نول کشور کی صحافیانہ خدمات پر روشنی ڈالیے۔

(5) منشی نول کشور کی اقدار و روایات پر روشنی ڈالیے۔

(6) منشی نول کشور کی حیات پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

17.7 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

(1) سید امیر حسن نورانی؛ سوانح منشی نولکشور؛ 1995؛ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

(2) قاضی عبیدالرحمٰن، وہاج الدین علوی، (مترتبین)؛ نولکشور اور ان کا عہد، 2004

(3) خالد محمود، شہپر رسول؛ خطبات؛ 2012ء؛ جامعہ ملیہ اسلامیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

(4) پروفیسر شیث محمد اسماعیل اعظمی؛ دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات؛ 2003ء کتابی دنیا، دہلی